
محور کی تلاش
سبوحہ خان
urdukutabkhanapk.blogspot
urdukutabkhanapk.blogspot.com
اُردو کُتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot

عالمی تہذیب کی تاریخ انفرادی اور اجتماعی ہجرتوں کے احوال سے پُر ہے۔ تاہم آج کل نام نہاد ورلڈ ٹورز کے احوال اور سفرنامے خوب لکھے جارہے ہیں جن میں ڈھلی ڈھلائی مصنوعی فضا بندی، مبالغہ آرائی اور خود سرائی کے عناصر غالب دکھائی دیتے ہیں۔ سبوحہ خان کی زیرِنظر کتاب ''محور کی تلاش'' اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں انھوں نے طویل جہاں نوردی کے دوران ملکوں ملکوں پھیلی دربدری اور ہجرت نصیبی سے وابستہ بعض نہایت اہم اور پیچیدہ سوالوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور یہ جاننا چاہا ہے کہ دور دراز خطوں سے ترکِ سکونت کر کے نئی اجنبی فضاؤں میں بسنے والے کس جذباتی، معاشی اور سماجی آشوب سے گزرتے ہیں۔

کتاب کے موضوع میں فلسفیانہ موشگافیوں کی بھی بہت گنجائش تھی لیکن سبوحہ خان نے اس پوری صورتِ حال کو انسانی وجود، احساس اور واقعات کی سطح پر سمجھا ہے کہ ہر فرد اپنی جدا سرگزشت اور الگ کہانی رکھتا ہے۔ چنانچہ ''محور کی تلاش'' ایک اعتبار سے سچی کہانیوں کی دل چسپ پُستک بھی بن گئی ہے۔ طرزِ نگارش کی جاذبیت اور قصہ گوئی کی دل چسپی اور اندازِ بیاں کی ندرت نے کتاب کی دلکشی میں جو غیر معمولی اضافہ کیا ہے وہ بجائے خود داد طلب ہے۔

سیّد مظہر جمیل

محور کی تلاش

سبوحہ خان

اکادمی بازیافت

محور کی تلاش

سبوحہ خان

اکادمی بازیافت

دوسری اشاعت : جون ۲۰۱۷ء
کمپوزنگ : لیزر پلس، فون: 32751324
قیمت : ۳۰۰؍روپے

Mehvar Ki Talash
(Travelogue)
By: Sabooha Khan

ACADEMY BAZYAFT
Kitab Market, Office# 17, St.# 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 32751428
e-mail: a.bazyaft@gmail.com

عامر اور ناصر

کے نام

I wanted you to be good human beings

"ہاں تم بالکل ویسے ہو جیسا میں نے سوچا تھا!"

فہرست

آؤ حساب دو	۰۹
محور کی تلاش	۱۱
بوسٹن	۵۶
دوہا	۱۳۶
فرانس یا سوئٹزر لینڈ	۱۴۱
Chillon	۱۵۹
جدائی	۱۶۹
پھر کینیڈا	۱۷۴
کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں	۱۹۶
الحمرا کی ایک صبح	۲۱۵

آؤ حساب دو

اس زمین کا جو میری بھی ہے اور تمھاری بھی
وہ زمین جس پر آج آگ لگی ہے
وہ زمین جہاں جانیں بہت سستی ہیں
وہ زمین جہاں بندوق کی گولی مفت بٹتی ہے
وہ زمین جہاں کے امرا کٹھور ہیں
آؤ ماتم کریں اس غریب کا
جو بھوک کے ہاتھوں مجبور ہے

وہ زمین جو بھلائے نہیں بھولتی، وہ زمین جس میں ان جاں نثاروں کا خون ہے جو شہید کہلائے جاتے ہیں، شاہد میں بھی ہوں اور شاہد تم بھی، کہ ہم نے اس زمین کا قرض نہیں چکایا۔ آؤ کیوں نہ ایک بار پھر تم اور ہم متحد ہو جائیں اور اس زمین کو بچالیں، مغرب سے اور مشرق سے، شمال سے اور جنوب سے، حکومت کے اس کارندے سے جو بھیک کے نام پر رشوت مانگتا ہے، اس وڈیرے سے جو ہاری کو پیروں تلے روندتا ہے، اور اس دیمک سے جو اسے اندر سے کم زور کرتی ہے۔

فارسی کی ایک کہاوت ہے کہ تم کہیں بھی چلے جاؤ آسمان کا رنگ تو ایک ہی جیسا

ہوگا، مگر پناہ آسمان نہیں زمین دیتی ہے، یہ زمین کا رنگ ہے جو ایک علاقے سے دوسرے کو جدا کرتا ہے— میں اگر غور سے دیکھوں تو آسمان کا رنگ بھی کہاں ایک ہے؟ کراچی کا آسمان میرے لیے سب سے جدا ہے! بات اچھا یا برا ہونے کی نہیں، بات صرف یہ ہے کہ وہ میرا اپنا ہے۔

ایک بادشاہ نے اپنے درباری سے کہا، ''جاؤ شہر کا سب سے خوب صورت بچہ لے کر آؤ۔'' دو دن بعد وہ واپس دربار میں آیا تو اس کے ساتھ ایک بے حد بدصورت بچہ تھا۔ ''بادشاہ نے کہا یہ کیا؟'' اس نے کہا، ''بادشاہ سلامت میں نے بہت ڈھونڈا، بہت ڈھونڈا— کہ کوئی اور بچہ اس سے خوب صورت ہو مگر مجھے اپنے بیٹے سے زیادہ خوب صورت کوئی بچہ نہیں ملا۔''

آج صبح جب میں سکوشیا بینک پہنچی تو کاؤنٹر پر کھڑی ہر لڑکی خوب صورت تھی، ہر لڑکی مسکراتی تھی۔ میں بھی قطار میں کھڑی ہوکر اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ جب میری باری آئی تو جو لڑکی میرے لیے کام کررہی تھی وہ بڑی نازک اور خوب صورت تھی، اسی لمحے ایک اور بینک میں کام کرنے والی لڑکی میرے سامنے سے گزری، وہ بے حد سانولی انڈین لڑکی تھی۔ اس نے اور میں نے جس مسکراہٹ کا تبادلہ کیا اس میں جو اپنائیت تھی، جو حقیقت تھی اس کے سامنے بقیہ تمام مسکراہٹیں پلاسٹک زدہ تھیں۔ میں نے سوچا اس کا نام کلچر ہے۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی، اگرچہ وہ میرے ملک کی بھی نہیں تھی مگر اس اجنبی ماحول اور اجنبیت میں بھی وہ اور میں ایک دوسرے سے شناسائی سے بھرپور ہیلو کرتے تھے۔ شاید اسی کا نام یکتائی ہے، ایک تہذیب ہے، اس کے ماتھے کی بندیا مجھے اس سے جدا کرتی تھی مگر— میری نظر میں اس وقت وہ اس بینک کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی کہ اس کی اور میری زمین کا رنگ ایک تھا۔

محور کی تلاش

سفر کرتے کرتے پندرہ گھنٹے گزر چکے ہیں مگر منزل ہے کہ آتی ہی نہیں۔ ایک عہد سے دوسرے عہد کا سفر ہے۔ عہد اس لیے کہ یہ ایک نئی دنیا ہے۔ سفر کیا تھا ایک بے خودی تھی جو ذہن اور جسم پر چھائی تھی۔ کبھی سونا کبھی جاگنا، ایئر ہوسٹس کی سرگوشی کرتی آواز، ایک سحر تھا کہ طاری تھا۔ کبھی کبھی جی چاہتا تھا کہ یہ سحر جاری رہے اور میں دنیا کی تمام پریشانیوں سے دور اسی عالم بے خودی میں گزار دوں۔ مگر اس عمر میں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جسم کا ہر حصہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں یہاں ہوں، مجھے آرام کی ضرورت ہے، کیا تم اس سفر کو ختم نہیں کرسکتے۔ ہر مرتبہ اس سفر کے بعد ہم (میں اور شعیب) عہد کرتے ہیں کہ ہم اگلی مرتبہ نہیں آئیں گے کہ یہ سفر بہت لمبا ہے مگر بچوں کی محبت اور کشش ہے کہ ہر چند مہینوں بعد سر اٹھاتی ہے اور دل— بلکہ تصوّر ہے کہ پھر اسی بزم میں جانے کا نام لیتا ہے— اور ہم ایک مرتبہ پھر امریکا اور کینیڈا کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں— گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ اگر ہم یہ الزام بچوں کو دیں کہ وہ خود امریکا چلے گئے تو یہ سراسر غلط ہوگا۔ یہ ہماری خواہش تھی کہ وہ بہتر پڑھائی کریں اور بہترین کمائیں، غم دوراں کا کوئی غم انھیں نہ رہے، ہماری یہی خواہشیں تھیں جن کی وجہ سے ہماری عمر کے خوش حال لوگ بلکہ کہنا چاہیے کہ مڈل کلاس کے تمام لوگ دو حصوں میں بٹ چکے

ہیں۔ ہم پاکستان میں ہیں اور ہمارا دل اور جگر غیروں کا اسیر ہے۔ شاید تمام غریب قوموں کی یہی کہانی ہے۔ یہ کہانی آج کی نہیں ہمیشہ کی ہے۔ مجھے اس بات پر جانے کیوں صفیہ جاں نثار اختر کی کتاب ''زیرِ لب'' یاد آجاتی ہے۔ جاں نثار اختر اور صفیہ کی محبت کو دیکھا جائے تو شاید وہ مثالی محبت تھی۔ مگر غمِ دوراں نے انھیں الگ کردیا۔ دونوں نے اپنی زندگی فرقت میں گزاری یہاں تک کہ صفیہ کو موت نے آلیا مگر جاں نثار آخری وقت میں بھی ان تک نہ پہنچ پائے۔ روٹی بہرحال زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اور پھر مغرب میں روٹی کے ساتھ ساتھ بہترین مکھن کا بھی انتظام ہے۔

جہاز کی galley سے پلیٹوں کی آواز بتا رہی ہے کہ جہاز کا عملہ اپنی دکان بڑھا رہا ہے۔ ہم اپنے ہیڈفون اتار چکے ہیں۔ سامنے لگی ٹی وی کی روشن اسکرین پر اندھیرا چھا چکا ہے۔ پی آئی اے کے جہاز میں اناؤنسمنٹ کی آواز کسی اور دنیا کی آواز لگتی ہے۔ یہ ہدایات اس فارم کے بارے میں ہیں جو ابھی ہمیں دیا گیا ہے۔ ہدایات کچھ اس طرح سے ہیں کہ ''فارم پر کوئی غلط معلومات نہ دیں، کہیں پر اوور رائٹنگ نہ کریں کہ آفیسرز کے لیے ایسا فارم قطعاً قابلِ قبول نہیں ہوگا— اگر مدد چاہیے تو جہاز کا عملہ آپ کی مدد کے لیے موجود ہے...وغیرہ وغیرہ۔''

لگتا ہے کہ اس اناؤنسمنٹ کو لکھنے والا ہماری نفسیات سے بخوبی واقف ہے۔ اسے معلوم ہے کہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہے کہ ''اجی ہوش میں آئیے، اب آپ وہاں نہیں ہیں جہاں ہر لاپروائی اور ہر غلطی جائز تھی بلکہ معاف تھی۔ اب غلطی کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اب آپ اپنے بادشاہ خود نہیں، خوابِ غفلت سے جاگیے، اب آپ ایسی جگہ ہیں جہاں آپ سے ہر چیز کا جواب مانگا جائے گا۔ کوئی سفارش نہیں چلے گی چاہے آپ کسی منسٹر کے بیٹے ہوں یا جرنیل کے۔ اگر گاڑی پر کالے شیشے لگانے کی اجازت نہیں ہے تو نہیں ہے، آپ کو اس پر عمل کرنا پڑے گا، یہ نہیں ہوگا کہ چالان کرنے والے پولیس والے کو آپ نوکری سے نکلوادیں اور کہیں کہ how dare you۔ یہاں محمود و ایاز سب ایک ہی صف میں

کھڑے ہیں— یہاں یہ نہیں ہوگا کہ آپ صرف اس لیے قطار میں سب سے آگے کھڑے ہوسکیں کہ آپ اس غریب شلوار قمیص پہنے ہوئے بابے سے زیادہ معزز دکھائی دیتے ہیں جو کندھے پر تولیہ ڈالے کھڑا ہے، یہاں کوئی نظر اٹھا کر یہ نہیں دیکھتا کہ آپ کون ہیں، بلکہ میں کہوں گی کہ ''عشق کے میکدے سے اٹھ عقل کے مدرسے میں آ'' یہ جہاز کوئی دبئی جانے والا جہاز نہیں جہاں سفر کرنے والوں کی اکثریت محنت کشوں کی ہوتی ہے، اس جہاز میں وہ لوگ سوار ہیں جو لاکھوں کے ٹکٹ خرید سکتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو پاکستان میں کسی حیثیت کے مالک ہیں۔ یہ لوگ اپنے ملک پاکستان میں آزاد ہیں جو چاہے کریں۔ پاکستان تو غریبوں کی جیل ہے، ان کا وہاں سے نکلنا مشکل ہے۔ ہم جیسے ملک سے محبت کے دعوے کرنے والے تو اس سلسلے میں بالکل آزاد ہیں۔ اپنے غریب ملک کی دولت سے اپنی زندگی سنوار لی اور ملک کی بہترین دولت کو غیروں کے حوالے کردیا اور اب اپنی بقیہ عمر اپنے بنے سجے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ملک پر تنقید کرکے گزارتے ہیں۔

جہاز سے اتر کر کسٹمز کے نشان کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے تقریباً ہمیں دس منٹ تک چلنا پڑا۔ جہاز سے نکلنے والے مسافر ہر طرح کے لباس میں تھے خاص طور پر خواتین— کوئی جینز پہنے تھیں، کوئی شلوار قمیص، کچھ نے چادریں لپیٹی تھیں تو کچھ اسکارف اور برقعے میں تھیں۔ اس وقت میں اس قوم پر یقیناً فخر کرسکتی تھی کہ سب نے بڑے سلیقے سے قطار بنائی، کسی نے اس سرخ لائن سے آگے قدم نہیں رکھا جس سے آگے قدم بڑھانے کی ممانعت تھی، کسی پاکستانی کے چہرے پر درشتگی یا غصّے کے تأثرات نہیں تھے۔ یقیناً یہ وہ قوم نہیں تھی جسے میں ہر روز کراچی کی سڑکوں پر دیکھتی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی مخلوق تھی۔ یہ تو دوسروں کے حقوق سے واقف تھے، یہ تو وہ لوگ نہیں تھے جو ہر لمحہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے رہتے تھے۔

اگرچہ میں اس سے پہلے بھی بہت مرتبہ اس ایئرپورٹ پر اتر چکی ہوں مگر ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی فضا سے ٹورونٹو کو دیکھ کر میرا پہلا جملہ یہی تھا کہ کیا دھلا دھلایا صاف ستھرا شہر ہے مگر شاید میں یہ بھول چکی تھی کہ میں جس شہر کو دیکھ رہی ہوں یہ دنیا کے بہترین

شہروں میں نویں نمبر پر ہے— اور— میں جس شہر یا ملک سے آ رہی ہوں وہ شاید نیچے سے نویں نمبر پر آتا ہے۔ بہرحال ہر طرف سبزہ تھا، اونچے درخت تھے، کاروں کی پُرسکون قطاریں تھیں۔ اس لحاظ سے کراچی ایک گنجان شہر ہے، آبادی کے لحاظ سے بھی اور عمارتوں کے لحاظ سے بھی جب کہ ٹورونٹو بے حد وسیع ہے— آبادی کم اور زمین بے حساب، مگر ان دوشہروں کا کیا مقابلہ، امیر اور غریب کا کیا مقابلہ، مشرق اور مغرب کا کیا مقابلہ، غلام اور آقا کا کیا مقابلہ، تعلیم یافتہ اور جاہل کا کیا مقابلہ، تہذیب یافتہ اور غیر مہذب کا کیا مقابلہ؟ میں یقیناً ان کا اور اپنا مقابلہ نہیں کر رہی اور کر بھی نہیں سکتی مگر شاید یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ میں ان کے ملک میں ضرور ہوں مگر میری تخلیق اس مٹی سے نہیں ہوئی۔ بیلٹ چلنی شروع ہوگئی، سامان آنا شروع ہوگیا، نہ جانے وہ کون لوگ ہوتے ہیں کہ جب بیلٹ چلنی شروع ہوتی ہے تو ان کا سامان سب سے پہلے آجاتا ہے۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں کہ جس قطار میں کھڑی ہوں وہ سب سے آہستہ چلتی ہے، جس چیز کی تلاش ہو وہ الماری میں سب سے نیچے رکھی ہوتی ہے اور سامان کی گھومتی بیلٹ پر آنے والا سب سے آخری سوٹ کیس میرا ہوتا ہے۔ ہم حسرت سے ہر سوٹ کیس کو غور سے دیکھتے ہیں کہ شاید یہ ہمارا ہو مگر وائے قسمت! مگر آج مجھے اپنا سوٹ کیس نسبتاً جلدی آتا نظر آیا مگر جب اُسے اٹھانے کی کوشش کی تو ناکام رہی کہ وہ چند سوٹ کیسوں کے نیچے دبا تھا، چار مرتبہ وہ سامنے سے گزرا، مگر وہ تو میرے لیے اس جام کی مانند ہوگیا کہ بار بار گزرتا تھا مگر مجھ تک نہ پہنچتا تھا۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

تو ساقی نے یہ کیا تھا کہ اس کے اوپر اتنا سامان رکھ دیا کہ ہم ہر چکر میں اس کو نکالنے کی کوشش کرتے رہے مگر قسمت سے بھی کوئی لڑ سکتا ہے؟ اس سوٹ کیس کو کوئی جوان ہاتھ ہی نکال سکتے تھے اور میرے بیٹے ناصر کے وہ جوان ہاتھ Baggage Hall میں نہیں آسکتے تھے۔

Arrival Lounge میں پہنچے تو مجھے اپنے چند پیارے چہروں میں سے وہ

چہرہ نظر آیا جس کی محبت مجھے کھینچ کر یہاں لائی تھی۔

تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوادی ہم نے
(فیض)

ہنستا مسکراتا، بڑی بڑی آنکھوں والا اور سامنے کے دو ٹوٹے ہوئے دانتوں سے بے خبر مسکراتا چہرہ، سر پر گھونگھریالے بال تاج کی طرح سجے ہیں۔ ایک لمحہ قرار نہیں، اگر کچھ کرنے کو نہ ہو تو اپنی جگہ پر اُچھلتے رہتے ہیں، بے حد حاضر جواب ہیں، کبھی کوشش کرتے ہیں تو اردو بھی بول لیتے ہیں۔ ابھی اس دنیا میں نیا نیا قدم رکھا ہے اس لیے سمجھتے ہیں کہ ہر شخص انھیں پیار کرتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ لائنوں والی ٹی شرٹ اور لمبی سی نیکر پہنے مجھ سے لپٹ جاتے ہیں، منتظر ہیں کہ جلد گھر پہنچیں تاکہ ہمارے سوٹ کیس سے نکلنے والا ship ہم اپنی محبت کے ثبوت کے طور پر پیش کرسکیں۔ مگر بہرحال اس کی خوشی اس کے چہرے اور جسم کے ہر حصّے سے ظاہر تھی۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہم سب بچے ہوتے اور اپنی محبتوں کو تہذیب کے دائرے میں رکھنے کے لیے ان محبتوں کو لبادے نہ پہنانے پڑتے۔

سفر کی تمام تکان اور کلفتیں دور ہوگئیں۔ اپنوں سے دور رہنا بھی تو ایک تکان کا باعث ہوتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے مولانا رومی یاد آگئے۔ صوفیانہ مزاج کے مطابق ان کا کہنا ہے کہ ''جب میں مرجاؤں تو میرے لیے افسوس نہ کرنا بلکہ خوشیاں منانا کہ وہ 'وقت' وہ لمحہ ہوگا جب میں اپنے کُل سے مل جاؤں گا۔ میں دنیا کہ ذروں میں سے ایک وہ ذرہ تھا جو برسوں اپنے آپ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ یہ دنیا تو ایک سفر تھا، ایک امتحان تھا، میں محض ایک ذرّہ تھا اور اپنے محدود دائرے میں گھومتا تھا، اس انتظار میں تھا کہ میری تلاش کب مکمل ہو اور میں اپنے کُل سے مل جاؤں جو میری منزل ہے وہی میری خوشی اور اطمینان کی انتہا ہوگی۔ اگر وہ کل اس وقت مجھے اپنے میں سمولے گا تو مجھے وہ آسودگی ملے گی جو میرے ہونے کی انتہا ہوگی۔'' بس کچھ ایسی ہی خوشی مجھے علی سے مل کر ہوئی کہ ایک ذرّہ جو محور کی تلاش میں تھا کم از کم اپنے ساتھی سے تو ملا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

زارا بی بی گاڑی میں کچھ اس طرح سوتی تھیں کہ میں ان کے چہرے پر پھیلے ہوئے صرف بال دیکھ سکتی تھی۔ نہ وہ اپنی خوشی کا اظہار کرسکی اور نہ میں فوری طور پر اسے گلے لگاسکی۔ ویسے بھی وہ میری طرح اپنے جذبات کے اظہار کے سلسلے میں کچھ تکلف برتتی ہے یا کہنا چاہیے کہ کچھ شرماتی ہے۔ ایئرپورٹ سے گھر تک کا راستہ بہت پُرسکون تھا اگرچہ سڑک پر ٹریفک کی کوئی کمی نہیں تھی مگر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے درپے نہیں تھا۔ یہ قوم بڑی پُرسکون ہے اور پھر وہی تقابل، آخر ہم ایسے کیوں نہیں؟ شاید اب ہم ایک قوم نہیں رہے۔ پچھلے دنوں میں نے اپنے چند دوستوں سے کہا کہ ہر قوم کی چند خصوصیات ہوتی ہیں جیسے انگریزوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ بہت غیر جذباتی قوم ہے یا جرمنوں کی اپنی خصوصیات ہیں۔ کیا آج کے میڈیا اور حالات کو دیکھتے ہوئے ہم پاکستانی قوم کی کچھ تعریف کرسکتے ہیں۔ پہلے دوست نے جس طرح اس سوال کا جواب دیا وہ قابلِ غور ہے۔ ''دیکھیے ہر قوم کی ایک تاریخ ہوتی ہے جس سے ہم اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرسکتے ہیں۔ اب آپ پنجاب اور سرحد کو لیجیے پھر بلوچستان اور سندھ کو لیجیے اور آخر میں مہاجر کو دیکھیے۔'' اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کہا وہ ایک الگ کہانی ہے لیکن مجھے ایسا لگا کہ اب ہم ایک قوم پاکستانی نہیں صرف بلوچی، سندھی، پٹھان، پنجابی اور مہاجر ہیں۔ پھر اگر ان پانچ قومیتوں سے الگ ہوکر دیکھا جائے تو ایک اور تفریق ہے اور وہ تفریق ہے امیر اور غریب کی۔ جب ہم سب اپنی جگہ ایک اکائی بن جاتے ہیں اور بقیہ قوم کا حصّہ نہیں رہتے۔ ہم ایک اونچے مقام پر کھڑے ہوکر بقیہ قوم کو دیکھتے ہیں۔

بڑی بڑی شاہ راہوں کے بعد ہم نسبتاً خاموش علاقوں میں داخل ہوجاتے ہیں۔ آٹھ ویدر اسٹون ایک بے حد پُرسکون علاقہ ہے۔ کبھی دور سے گزرتی کسی ٹرین کی آواز آجاتی ہے ورنہ تو لگتا ہے کوئی جادوئی بستی ہے جہاں کوئی نہیں بستا۔ ہر گھر کے باہر جانے کون پھولوں سے بھرے گملے لٹکا گیا ہے۔ سرخ اور سبز پھولوں سے سب چمن دہکتے ہیں۔

یہاں دہکتے کہنا زیادہ بہتر ہے کہ یہاں کے پھولوں میں وہ خوش بو نہیں جو میرے گھر میں مہکتے موتیا یا رات کی رانی کا حصّہ ہے۔ شاید یہ اس زمین میں بسی محبتیں ہیں جن کی خوش بو ہر پھول کا حصّہ ہے۔ مگر محبتوں کی یہاں بھی کمی نہیں، ہمارے یہاں لان اور کیاریوں کو زیادہ تر مالی اور ملازم سنوارتے ہیں جب کہ یہاں پر اہلِ خانہ خود یہ کام انجام دیتے ہیں۔ پیار سے ایک ایک جھاڑی کو سنوارتے ہیں اور یہ پیار ان کے گھروں کے بیرونی حصّوں سے ظاہر ہے۔ کٹی کٹائی جھاڑیاں، بنی سنوری کیاریاں، صاف ستھرے پورچ اس بات کے غماز ہیں کہ یہاں رہنے والوں کو اپنے گھر سے کتنا لگاؤ ہے۔ یہ محبت کیسے کروائی جاتی ہے، ایسی قومیں کیسے بنائی جاتی ہیں مجھے نہیں معلوم کہ یہ سوچ کر میرا دل بھر آتا ہے۔ جب میں دیکھتی ہوں کہ ہم کتنی لاپروائی سے گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر کیلے کا چھلکا یا ٹشو پیپر باہر پھینک دیتے ہیں۔

گھر کے پیچھے ایک جنگل ہے جہاں پیدل چلنے والوں کے لیے پگڈنڈیاں ہیں، سائیکل چلانے والوں کے لیے ٹریکس ہیں، گھنے درخت ہیں، دھیمے سروں میں بہتا ڈان ریور ہے، اڑتی رنگین تتلیاں ہیں، زمین پر چلتے کیٹرپلرز ہیں، بڑے بڑے پیلے مشرومز پر پرورش پاتے سنیلز ہیں۔ انھیں آتے جاتے کوئی نہیں چھیڑتا، یہاں تک کہ علی اور زارا بھی جھک جھک کر ان کا معائنہ کرتے ہیں ان کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم کل پھر تمھیں دیکھنے آئیں گے۔ ہر چار پانچ سو گز پر ہم جیسوں کے لیے لکڑی کے بنچ ہیں جہاں ہم کچھ دیر بیٹھ کر سستا سکتے ہیں۔ آپ چلتے چلے جائیں تو کہیں کہیں اوپر پل پر گاڑیاں بھی چلتی نظر آتی ہیں۔ چمکتی دھوپ میں ایک تپش ہے مگر ساتھ ساتھ ہوا بھی چلتی ہے جو پگڈنڈی کے دونوں طرف لگے خودرو پودوں کو اس طرح ہلاتی ہے کہ ان خودرو پودوں پر گندم کے بالوں کا گمان ہوتا ہے۔ کہیں کہیں خودرو جنگلی پھول ہیں۔ زارا اب تک پیلے، سفید اور گلابی پھول جمع کرچکی ہے۔ ان خودرو پودوں کے علاوہ بعض درختوں سے شگوفے زمین پر گرگر مرجھائے ہوئے پیلے رنگ میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جانے کیوں انھیں دیکھ کر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے جیسے ابھی بھوسے کی کوئی بیل گاڑی

یہاں سے گزری ہے اور ہوا نے اس کا بھوسا ہر طرف بکھیر دیا ہے۔ یہ سوچ میری گہری جڑوں کی عکاسی کرتی ہے۔ میری سوچ، ذہن، تہذیب وہی ماحول وہی عہد ہے جس میں کولھو چلتا ہے۔ بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں فضا میں نغمے بکھیرتی ہیں، بیل گاڑی کے چلنے کی خوابیدہ سی آواز ہے اور پھر دور کہیں چکّی کی آواز اور پھر ساتھ ہی کسی بچے کے رونے کی آواز۔ میں کہ میرا تعلق اسی عہد سے ہے جہاں ایک اداسی پنپتی ہے۔ میں کہیں بھی چلی جاؤں میں کبھی بھی اس زمین سے جدا نہیں ہوسکتی جہاں میرا سندھ بہتا ہے، جہاں چناب کا کنارہ ہے اور کچے گھڑے کی خوش بو ہے۔ لیکن اب وہاں بھی ان نظاروں سے کوئی آپ کو لطف اندوز نہیں ہونے دیتا، کہیں اصرار ہے کہ اکیلے مت جاؤ کراچی ہو یا اسلام آباد کوئی جگہ محفوظ نہیں رہی۔ کراچی میں بارہ مئی کے واقعے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے ہر طرف ایک اداسی چھا گئی ہے۔ ہر ٹی وی چینل اور ہر گھر میں ایک ہی ذکر ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ ہر شخص کے اندر غصّہ پلتا ہے اور عمومی طور پر ہر شخص خوف زدہ ہے۔

میں اگلی صبح بہت جلد بیدار ہوجاتی ہوں۔ کینیڈا کے دوسرے علاقوں کی طرح یہ علاقہ بھی اپنی جگہ مکمل ہے۔ سپر مارکیٹ جانا ہوتو آپ پیدل جاسکتے ہیں۔ بچوں کا اسکول بہت نزدیک ہے، علی ہر روز اپنی سائیکل پر اکیلا جاتا ہے۔ اس کی ماں مینا کے ساتھ آج دادا دادی بھی اسے چھوڑنے جاتے ہیں۔ زارا اپنے اسٹرولر میں اطمینان سے بیٹھی ہے۔ علی تیزی سے سائیکل چلاتا ہوآگے چلا جاتا ہے، آگے ایک کراسنگ ہے، میرے دل میں ایک خوف سا اٹھتا ہے کہیں سڑک پار کرتے ہوئے کوئی گاڑی اسے نقصان نہ پہنچا دے — مگر... اے تحیرِ عشق سن کہ علی اسٹاپ کے نشان پر رک جاتا ہے اور ہمارا انتظار کرتا ہے، جب ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں تب وہ سڑک پار کرتا ہے، اس طرح کی تین کراسنگز آتی ہیں اور ہر جگہ وہ بڑے صبر سے ہمارا انتظار کرتا ہے۔ کیا یہ ہمارا پاکستانی بچہ ہے؟ کیا اس کی رگوں میں ہمارا ہی خون دوڑ رہا ہے؟ خالص پاکستانی خون! آخر کیا ہوا کہ اس میں یہ صبر ہے جو مجھ میں نہیں، یہ کیسے اس روپ میں ڈھل گیا؟ کیا یہی ماں کراچی میں رہتے ہوئے ایسا مہذب اور ڈسپلنڈ بچہ پال سکتی تھی؟ لیکن یہاں آکر تو ہم جیسے پلے پلائے بچے بھی

سنور جاتے ہیں۔ اسی رات بی بی سی پر عمران خان نظر آتے ہیں، مگر میں تو اس عمران خان کو نہیں جانتی، پاکستانی چینلز پر تو یہ ہمیشہ غصّے میں نظر آتے ہیں۔ کومپیئر اور دوسرے ساتھیوں سے ڈانٹ ڈانٹ کر بات کرتے ہیں۔ یہ کون سا عمران خان ہے جو مسکراتا بھی ہے اور بات سنتا بھی ہے۔ شاید یہ وہی بات ہے جو پوری قوم پر صادق آتی ہے کہ لندن کی ٹھنڈی ہواؤں اور سوال پوچھنے والے گورے کے سامنے یہ بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ سوال پوچھنے والے کے تلخ سوالات کے جواب بھی عمران خان بڑے تحمل سے دیتے تھے۔ کومپیئر نے ان سے سوال کیا کہ سات سال پہلے آپ مشرف کے گن گاتے تھے، آج یہ کیا ہوا کہ آپ ان کے اتنے مخالف ہوگئے؟ عمران خان نے نہایت سکون سے اس کا جواب دیا مگر غور طلب بات یہ ہے کہ کیوں اور کیسے عمران خان نے خوش مزاجی سے اور ہنس کر اپنے مخاطب کو جواب دیا؟ اس کا صرف یہی جواب ہے کہ رویّے کے لحاظ سے عمران خان بھی ایک وڈیرے ہیں اور یقیناً یہ پاکستان کی سیاست میں ایک مہرے کی طرح فٹ ہوجائیں گے بقیہ خوبیوں کی طرح ان میں یہ خوبی بھی موجود ہے کہ یہ اپنی قوم کو اپنے آپ سے ادنیٰ سمجھتے ہیں اور حق رکھتے ہیں کہ ان پر حکومت کریں۔

ہم علی کے اسکول پہنچ چکے ہیں۔ صاف ستھرا، چمکتی ہوئی ٹائلز کا فرش، بڑے بڑے خاموش کوریڈورز، ایک جماعت میں صرف بیس بچے اور وہ بھی ایسے جن کو خاموش کرانے کے لیے استاد کو چیخنا نہیں پڑتا۔ ہر جماعت اپنے طور پر تمام ضروریات سے آراستہ ہے اور ایک بات جس نے مجھے حیرت زدہ کردیا مگر دوسری طرف میرا سر فخر سے اونچا کردیا، وہ یہ تھی کہ اس اسکول کی پرنسپل ایک پاکستانی خاتون ہیں۔ ویسے تو ان ممالک میں حیران کردینے والی چیزوں کی کوئی کمی نہیں ہے، جیسے مینا کا ویکیوم کلینر ہے جو آن کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ خود بخود تمام صفائی کردیتا ہے، بستروں کے نیچے، کرسیوں کے پیچھے غرض فرش پر پڑا ذرّہ ذرّہ اپنے سینے میں سمیٹ لیتا ہے۔ میں نے پیار سے اس کا نام عبدل رکھ دیا ہے۔ مگر ہمارے یہاں تو جیتا جاگتا عبدل موجود ہے بلکہ کئی عبدل ہر وقت ہمارے گرد ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں اور پھر فائدہ یہ ہے کہ ہم ان پر اپنا غصّہ بھی اتار سکتے ہیں،

ان کی بے عزتی بھی کر سکتے ہیں اور منہ میں زبان ہونے کے باوجود وہ جواب نہیں دے سکتے۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے
ہم کہیں اور سنا کرے کوئی

شاید یہ شعر ہم جیسوں کے لیے ہی کہا گیا تھا۔ اب یہاں کے لوگ بے چارے نہ اپنے ڈش واشر کو ڈانٹ سکتے ہیں، نہ ویکیوم کلینر کو، نہ اس ریموٹ کو جو دربان کی جگہ ان کے گیراج کا دروازہ کھولتا ہے۔

ان تمام باتوں کے بارے میں جب میں سوچتی ہوں تو لگتا ہے غربت وہ سب سے بڑا زہر ہے جو قوموں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ یہ تمام ممالک جو آج کامیابی کے لحاظ سے سرفہرست ہیں اگر ہم تاریخ میں ڈیڑھ سو سال پیچھے جائیں تو یہ بھی غربت کا شکار تھے، یہاں بھی غلام بیچے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنی یہ سلطنت ہم جیسی قوموں کی لاشوں پر تعمیر کی ہے اور دیکھا جائے تو اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ مگر شاید یہ لوگ اپنی منزل تک پہنچنے کی راہ سے واقف ہیں جب کہ ہم جیسی غریب اقوام اب بھی سرگرداں ہیں اس کہکشاں کو ڈھونڈنے میں جو ہمیں کامیابی تک لے جائے گی۔ خدا جانے یہ سفر کتنا لمبا ہے اور ابھی ہماری کتنی نسلیں اس تلاش میں بھٹکتی رہیں گی۔

◇

جب میں نے یہ چند صفحے لکھے تو میں قطعاً یہ نہیں سوچ رہی تھی کہ اس کتاب کا کوئی خاص موضوع ہوگا۔ سوچا اور کتابوں کی طرح یہ ایک سفرنامہ ہوگا۔ مگر جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی مجھ پر ایک آمد کی سی کیفیت طاری ہوگئی، مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنی identity کی تلاش میں ہوں۔ ولی خان سے پوچھا گیا کہ آپ خود کو کیا سمجھتے ہیں کہ آپ پختون ہیں یا مسلمان ہیں یا پاکستانی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ”میں چھ ہزار سال پرانا پختون ہوں، چودہ سو سال پرانا مسلمان ہوں اور ستائیس سال پرانا پاکستانی ہوں۔“ شاید یہی پُرانا پن ہے جس کو روٹس کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں، میں کیا سوچتی ہوں یہ تو آپ کو

بار بار نظر آئے گا ہی لیکن ضروری ہے کہ میں اس میں دوسرے لوگوں کو بھی شامل کروں۔ وہ لوگ جو عام لوگ ہیں اور وہ لوگ بھی جو اپنے معاشرے میں کسی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ تمام لوگ جو اپنے ملک سے نکل کر کسی دوسرے ملک میں رہنے لگتے ہیں، ان سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آپ خود کو کہاں کا باشندہ سمجھتے ہیں، جیسے لاکھوں پاکستان سے گئے لوگ انگلستان میں بستے ہیں، ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آپ خود کو زیادہ پاکستانی سمجھتے ہیں یا زیادہ انگلستانی؟ اس بات کا جواب تو یہی ہونا چاہیے کہ دونوں۔ مگر اکثر اوقات یہ جواب نہیں ہوتا۔ حالاں کہ ان سے یہ سوال اس لیے غلط ہے کہ وہ دراصل دونوں ملکوں کی تہذیبوں، زبانوں، اقدار، روایات اور ثقافت کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو پاکستان میں پیدا ہوا، اردو زبان میں سوچتا ہے، اس نے منٹو، احمد ندیم قاسمی، فیض، اقبال، غالب اور فراز کو پڑھا ہے۔ اس نے اپنی تمام زندگی اپنے بزرگوں کے گاؤں میں گزاری، بچپن میں اپنی دادی سے اس زمین کی کہانیاں سنیں، یقیناً اس کی گھٹی میں، اس کی رگوں میں پاکستان کا رنگ موجود ہے۔ مگر دوسری طرف جب وہ لندن پہنچا تو اگلے تیس سال اس نے یہاں گزارے، اس نے یہاں کی زبان پر عبور حاصل کیا، اس کا ہر دن، ہر قدم یہاں کی زمین پر گزرا، یہاں کے لباس، قوانین اور اقدار کو اپنایا اس کے لیے یہ ملک، یہ شہر قطعاً اجنبی نہیں رہا۔ کیا وہ آدھا پاکستانی اور آدھا انگریز ہے؟ مگر ہم کسی بھی شخص کو اس طرح ٹکڑوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ وہ بہرحال ایک شخصیت کا مالک ہے۔ اس میں دونوں جگہ کی محبت اور belonging کا احساس موجود ہوگا۔ پھر بھی اندر بہت گہرائی میں ضرور کوئی ایسا احساس ہوگا جو اسے ایک انگریز یا پاکستانی تہذیب سے زیادہ نزدیک کرتا ہوگا۔ اس کا پاس پورٹ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ دو ممالک کا باشندہ ہے مگر اس کے اندر ضرور ایک آواز ہے جو اسے کسی ایک ملک سے زیادہ محبت کا احساس دلاتی ہوگی۔ انسان کوئی مشین نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک ڈیٹا بھر دیا جائے اور وہ اس کا فرفر جواب دینے لگے۔ انسان کے جذبات اور احساسات ہی اسے ایک کمپیوٹر سے جدا کرتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ کسی کی انفرادیت دراصل صرف یہ ہے کہ وہ کہاں پیدا ہوا، یا کس

قومیت کے لوگوں کے یہاں پیدا ہوا اور زندگی کا بقیہ سفر کہ اس نے زندگی کو کیسا محسوس کیا، اس نے زندگی کے مختلف ذائقوں کو کن تجربوں کے تحت جانا، ان سب کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیوں کہ جب ہم کسی شخص کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کو صرف اس کے رنگ، نقش اور زبان سے جانچتے ہیں۔ ہم اسے مذہبی، قومی، نسلی اور جغرافیائی حدود کے لحاظ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ اگرچہ وہ ایک ایشین ہے مگر ہوسکتا ہے اس کی سوچ، اس کا اندازِ فکر ایک امریکن کی طرح ہو کیوں کہ اس نے زندگی کا زیادہ عرصہ امریکا میں گزارا ہے۔ اگر کسی ایک مذہب کے شخص کو کسی دوسرے مذہب میں کوئی خوبی نظر آجائے تو ہم اسے غدار سمجھتے ہیں، ہم اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ کبھی بھی اپنے ذہن سے سوچ سکے۔ مگر ایک ایسا بچہ جو ایک مسلمان باپ اور ایک عیسائی عورت کا بچہ ہے ہم اس سے کیا توقع کرتے ہیں یا اگر مذہب کو چھوڑ دیں اور صرف یہ کہیں کہ ایک امریکن ماں اور پاکستانی باپ کا بچہ خود کو کس تہذیب میں فٹ کرتا ہے تو اس کا جواب کیا ہے؟ کیا اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ پاکستان میں ہے تو وہ خود کو پاکستانی سمجھے گا اور اگر امریکا میں ہے تو وہ خود کو امریکن سمجھے گا؟ یا شاید وہ دونوں قومیتوں کا مرکب ہے۔

اس کے بعد آپ اس نسل کو لیں جس کے ماں باپ پاکستانی تھے مگر وہ کینیڈا میں پیدا ہوا۔ وہ بہت اچھی انگریزی یا فرنچ بولتا ہے۔ اس نے اسی زبان میں تعلیم حاصل کی۔ دوسری طرف وہ مسجد بھی جاتا ہے، دونوں قومیتوں کے تہوار مناتا ہے۔ وہ خود اپنے کو کیا سمجھتا ہے؟ یہ ایک الگ سوال ہے مگر سوسائٹی اسے کیا سمجھتی ہے؟ یہ ایک الگ حقیقت ہے۔ میں نے صرف ایک مثال دی ہے، جب کہ آج کے دور میں ہر قسم کے امتزاجات دیکھے جاسکتے ہیں، مثلاً ایک ترک جو جرمنی میں پیدا ہوا، اس نے اپنے ملک کی شکل بھی نہیں دیکھی مگر کیا قانون اسے جرمن بننے کی اجازت دیتا ہے یا لوگ اس کو جرمن سمجھتے ہیں؟ کیا ایک انسان کو یہ حقیقتیں کسی کش مکش میں مبتلا کررہی ہیں؟ ایک طرف وہ ملک ہے جو اس کے آبا و اجداد کا ملک تھا اور دوسری طرف وہ ممالک جنھوں نے اس کو پناہ دی، جس ملک کی ہوائیں اس کے جسم میں رچ بس گئی ہیں، جس ملک کے تجربوں سے وہ ہر دم

گزرتا ہے۔ اگر وہ واپس اپنے آبا و اجداد کے ملک میں جاتا ہے تو وہ سب کچھ اسے اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ دوسری طرف بعض اوقات وہ ملک جہاں اس نے زیادہ زندگی گزاری ہے وہ اس کو اجنبی سمجھتا ہے اور وہاں کے اصلی باشندے اسے ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے پوچھ رہے ہوں کہ تم ہمارے ملک میں کیا کررہے ہو؟ کون ہے جو ہمارے ذہنوں میں یہ زہر گھولتا ہے اور پھر یہی مختلف ہونے کا احساس ہم میں ایک غصہ یا مایوسی پیدا کرتا ہے۔ چاہے وہ مختلف ہونا مذہب کے لحاظ سے ہو یا جغرافیائی لحاظ سے ہو۔ آج کے دور میں یہ غصہ اتنا زیادہ ہوچکا ہے کہ اور جرائم کے علاوہ ہم ہر جگہ خودکش حملوں کا ذکر بھی سنتے ہیں۔

◇

کینیڈا کی صبح آج کل بڑی خوب صورت ہوتی ہے۔ شاید یہ یہاں کا پرفیکٹ موسم ہے۔ مجھے میوزک ماسٹر کی تلاش ہے۔ دوسرے فنون کی طرح میوزک بھی ایک ایسا جنون ہے جس کے لیے ایک عمر کی تپسیا چاہیے، اگرچہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اس تپسیا کا پچاسواں حصہ بھی پاسکوں مگر پھر بھی اس تلاش میں جو مزہ ہے میں اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی نے ہیمنت کے بارے میں بتایا ہے جو ٹورونٹو کی ایک بڑی سڑک ینگ پر 8640 میں ملیں گے۔ میں کسی آفس جیسی جگہ کی تلاش میں تھی مگر تلاش کے بعد یہ پتا چلا کہ یہ ایک مندر ہے۔ ایسا مندر جس میں اسکول بھی ہے، کیفے ٹیریا بھی ہے۔ اس جگہ پر ڈانس کلاسز بھی ہوتی ہیں اور باقاعدہ پڑھنا لکھنا بھی ہوتا ہے۔ ویداس ایک بہت بڑی عمارت ہے بالکل ایسی ہی عمارت جیسی ٹورونٹو کی کسی عمارت کو ہونا چاہیے۔ میں چند سیڑھیاں اتر کر ایک بڑے سے ہال میں داخل ہوتی ہوں، ایک نوجوان لڑکا میرا منتظر ہے۔ وہ مجھ سے سوال کرتا ہے، ''کیا آپ پاکستان سے آئے ہیں؟'' اور یہ معلوم ہونے پر میں حیران ہوجاتی ہوں کہ یہ لڑکا استاد ہیمنت ہے۔ اب تک میں نے جتنے بھی استاد دیکھے ہیں وہ زیادہ تر عمر رسیدہ ہوتے ہیں۔ مگر بہرحال استاد ہونے کے لیے عمر رسیدہ ہونا ضروری نہیں جس طرح شاگرد ہونے کے لیے کم عمر ہونا ضروری نہیں اور اس کی مثال اس

وقت میں تھی کہ میرا استاد خود میرے بیٹے سے چھوٹا تھا۔ جینز اور نیلے چیک کی قمیص میں ملبوس میرا استاد اپنے بالوں کو بار بار ہاتھ سے پیچھے کرتا میرے سامنے تھا۔ میوزک روم ایک کوریڈور سے گزر کر ایک ہال کے کونے پر واقع تھا۔ ہر جگہ کا فرش اتنا صاف تھا کہ جی چاہتا تھا کہ اس پر ننگے پیر چلا جائے، میری آرزو برآئی اور ہمیں میوزک روم سے باہر جوتے اتارنے پڑے کہ یہ ان کے عقیدے کے مطابق ایک پاکیزہ کمرہ تھا۔ دیوار پر ایک ڈانس کرتی تصویر خود ہیمنت کی تھی، اس کے علاوہ ہیمنت کے استاد کی تصویر تھی۔ سامنے کی بڑی دیوار پر بہت ہی شوخ رنگوں میں ایک جنگل پینٹ کیا گیا تھا جس میں گھنے کیلے کے درخت تھے۔ ہیمنت کا کہنا تھا کہ میوزک کا تعلق ایسے ہی ماحول سے ہے۔ ایک چوکی پر طبلہ ہارمونیم اور چند اور ساز تھے۔ ایک کونے پر دو دروازے تھے جہاں سے کچھ لوگ ایسا لباس پہنے اندر باہر جاتے تھے جیسے وہ احرام پہنے ہوں شاید وہ ان کا عبادت کا کمرہ تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے ایک دری بچھی تھی جس پر استاد ہیمنت کا ہارمونیم تھا اور دو الیکٹرک تانپورے تھے۔ ایک ماحول تھا جو کم ازکم میرے لیے نیا تھا۔ میرے استاد نے پہلے میری ابتدائی تعلیم کے بارے میں پوچھا جو شاید اس کی نظر میں صفر تھی۔ لیکن بہرحال اس نے میرا ٹیسٹ ضرور لیا میں اس میں پاس ہوئی یا فیل یہ مجھے نہیں معلوم لیکن بہرحال اس نے مجھے اپنی شاگردی میں لینے کی منظوری دے دی کہ بہرحال پیٹ اس کے ساتھ بھی لگا تھا۔ اور روزی کی تلاش نے ہی اسے دیس نکالا دیا تھا۔ روٹی تو بہرطور کما کھائے مچھندر۔ ہیمنت کی شکل بالکل ویسی ہی ہے جیسی میرے کسی بھائی بند کی ہوسکتی ہے۔ وہی سانولی سلونی رنگت، ریشم کی طرح کالے سیدھے بال۔ ہنسنا، بولنا، چلنا سب ہماری طرح مگر فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ہندوستانی تھا اور ہندو تھا۔ مذہب کا فرق بھی کیا فرق ہے کہ ہزار ایک جیسا ہونے کے باوجود وہ مجھ سے جدا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ میں اسے کم تر سمجھتی تھی یا اس کی نظر میں، میں کم تر تھی۔

کیا آواز تھی کہ ریاض نے اس آواز کو ایسا بنادیا تھا جس کے لیے کسی مائیک یا لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ آواز کسی کنویں سے نکلتی تھی اور پھر پانی پر

تیرتے ہوئے ہر فریکوئنسی پر اپنے بہترین روپ کو پیش کرتی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ آواز کی الفاظ میں تعریف ناممکن ہے، مگر جی ضرور چاہتا ہے کہ میں اس کیفیت کو آپ تک پہنچا سکوں۔ اب وہ کیسا استاد تھا، اس کا فیصلہ کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ فوری طور پر میں اس سے مرعوب تھی۔ اس راجستھانی آواز سے جس کی کیفیت بھی کسی ریگستان میں رہنے والے بدو کی سی تھی۔ اس آواز میں اونٹوں کے ریگستان میں قدم رکھنے کی تھاپ کے علاوہ ان گھنٹیوں کی بازگشت بھی شامل تھی جو کارواں کے کہیں دور ہونے کی نشان دہی کرتی تھی۔ ایک ایسی آواز جس میں نکھار پیدا کرنے کے لیے کسی جدید سائنسی آلے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ آواز کہ کانوں سے ہوتی ہوئی دل میں اتر جاتی تھی، وہ آواز جسے الفاظ کا سہارا نہیں چاہیے، ایک قدیم آواز جو آج کے جدید دور میں اجنبیت کا احساس دیتی تھی۔ جودھپور کا رہنے والا یہ جوان ایک بنجارہ تھا جسے وقت نے ٹورنٹو میں لاکھڑا کیا تھا۔ مگر وہ تو شروع ہی سے اپنے ماحول کی نفی کرنے کا عادی تھا۔ وہ جو ایک راجپوت تھا، وہ جو اپنے باپ کو ناراض رکھنے کی ہمت رکھتا تھا، راجپوت جو جنگجو ہوتے ہیں اور کوئی اور پیشہ ان کے لیے قابلِ مذمت ہوتا ہے، ان کے خاندان میں کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا تھا، ان کے خاندان میں ساز و سنگیت کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مگر اس کے موسیقی کے عشق نے اس میں بغاوت کی ہمت پیدا کی۔ وہ صرف چودہ سال کا تھا جب وہ راجستھان سے بھاگ کر دلّی کی گلیوں میں چھپ گیا۔

یہ بات مجھے اس دن معلوم ہوئی کہ گانا بجانا سب ہندوؤں میں عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے ہیمنت نے ایک اسکول میں داخلہ لیا جہاں وہ میوزک اور ڈانس سیکھتا رہا اور شام کو کام کرتا رہا تاکہ اسکول کی فیس ادا کرتا رہے۔ تمام رشتے داروں اور ماں باپ نے اس سے ناتا توڑ لیا۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی فن کو سیکھنا بھی ایک تپسیا ہے جس کے لیے اسے دنیا کو چھوڑنا پڑا۔ یقیناً یہ جذبۂ شوق ہی تھا جس نے اس کی آواز میں رس بھر دیا۔ میں نے بے تاب ہوکر پوچھا، ''پھر کیا ہوا، کیا آپ کے والد آپ سے اب ملتے ہیں؟'' کہنے لگا، ''سنتی جائیے دیدی۔ پھر ہوا یوں کہ چار سال

کے کورس کے بعد بھی میں اسی ہوسٹل میں رہتا رہا۔ سب لوگ چھٹی میں گھر جاتے مگر میرے پاس جانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ایک گرمی کی چھٹیوں میں چند لوگ نس بندی کے سلسلے میں ایک فلم بنا رہے تھے۔ فلم کا نام تھا 'سانجھ سویرا' انھیں مرکزی کردار کے لیے کوئی لڑکا چاہیے تھا جسے گانا بھی آتا ہو اور ڈانس بھی۔ میرا اسکرین ٹیسٹ ہوا اور مجھے فلم میں لے لیا گیا۔ مجھے فلم سے یا ایکٹنگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر پیسا تو مجھے چاہیے تھا اس لیے کام کرلیا۔ اور پھر بھگوان کی اِچھا سے کچھ ایسا ہوا کہ وہ فلم گاؤں گاؤں دکھائی گئی اور ان جگہوں میں میرا گاؤں بھی شامل تھا۔ جب وہاں میرے لوگوں نے دیکھا تو انھیں لگا کہ یہ لڑکا کچھ بُرا نہیں کر رہا۔ اس پندرہ بیس منٹ کی فلم نے میری زندگی بدل دی۔ آپ کامیاب ہوں تو بہت سے لوگ آپ کو اپنانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر میں اپنے گھر جانے لگا۔ والد صاحب پھر بھی کافی عرصہ مجھ سے نہیں بولے، مگر پھر رفتہ رفتہ ٹھیک ہوگئے۔ دیدی آپ کو کچھ لگتا ہے کہ میں اچھی اردو بولتا ہوں؟ یہ اس لیے ہے کہ میں دلّی میں رہا ہوں۔"

میں نے سوچا، ہاں میں بھی دلّی کو جانتی ہوں عالم میں ایک شہر تھا اور اے دیس سے آنے والے بتا کچھ مجھے بھی سنا اس شہر کا قصہ کہ کبھی وہاں میرے پیارے بستے تھے۔ میں نے اپنے لوگوں سے اس شہر کے بہت سے قصے سنے ہیں جہاں سے ہمارے لوگ جان بچا کر بھاگے تھے۔ مگر اب بھی انھیں وہ شہر یاد آتا ہے۔ اس شہر نے دلوں پر کیسے کیسے داغ چھوڑے ہیں۔ میرے بہن اور بھائی وہ وقت اب بھی نہیں بھولتے جب وہ لاہور شہر میں اپنے ماں باپ کا انتظار کرتے تھے۔ وہ دلّی سے آنے والی ہر ٹرین کی پذیرائی کرتے تھے اور ایک دن اس ٹرین کو بھی خوش آمدید کہا جس میں صرف لاشوں کا تعفن تھا۔ ایک ایک لاش کو دیکھا کہ کہیں وہ ان کے ماں باپ نہ ہوں، کہیں بچوں میں ان کی دو سالہ بہن نہ ہو، مگر میں وہ خوش قسمت بہن تھی جس کو اپنے پیارے پاکستان کو دیکھنا تھا۔ اور اس ٹرین میں نہ جانے کون لوگ ہوں گے جن کے چاہنے والوں نے ان سے جدائی کا صدمہ اٹھایا ہوگا۔ زمین وہ بھی اپنی تھی زمین یہ بھی اپنی ہے، زمین کا کیا ہے بدلتی ہی رہتی ہے۔ ہم

اپنی تلاش جاری رکھتے ہیں۔ کبھی دوسری زمین کی تلاش اس لیے ہوتی ہے کہ بہتر زندگی گزار سکیں اور کبھی زمین خود ہی ہمیں دیس نکالا دے دیتی ہے۔ ہم تو خانہ بدوش ہیں۔ دلّی سے نکالا تو کراچی جا بسے، وہاں غمِ دوراں نے گھیرا تو ٹورونٹو آ بسے۔ ابھی تک ہم یہ ہی نہیں طے کر پائے کہ ہم کہاں کے باسی ہیں، دل ہے کہ ہر جگہ اٹکا ہے۔ ہماری جڑیں کہیں بھی پوری طرح نہیں پنپ پائیں۔ ہم تو کٹھ پتلیاں ہیں، اور ان کے دھاگے کس کے ہاتھ میں ہیں، یہ سب جانتے ہیں مگر ہم ان ہاتھوں کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ہیمنت اور میں کبھی ایک ہی ملک کے باسی تھے۔ وہاں تم بھی تھے اور ہم بھی تھے۔ آج پھر تم اور ہم ایک اور نئے شہر میں اکٹھے ہیں۔ ہماری آنکھوں میں نہ اجنبیت ہے نہ وہ غصہ ہے کہ میں تمھیں اپنے باپ کا قاتل سمجھوں، پھر یہ کیا ہے کہ صرف اشارے کی دیر ہے تمھارے اور ہمارے ملک میں بیٹھے لوگ جب چاہیں ہماری پُرانی دشمنیوں کو زندہ کر دیں۔

میں نہ جانے کہاں پہنچ گئی اور ہیمنت ہے کہ اب تک اپنی کہانی سنانے میں مصروف ہے۔ اسے گورنمنٹ آف انڈیا نے تین سال کے لیے گیانا بھیج دیا۔ اس کے بعد ایک سال تک چین میں رہا۔ میں نے حیرت سے کہا چین میں؟ اس نے کہا ہاں دیدی، ہم وہاں اپنا سنگیت اور ڈانس سکھاتے تھے۔ اگرچہ چین اور ہم دشمن تھے مگر ایک عام آدمی کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی وہ لوگ ہم سے محبت کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد ہم وہیں سے ایک شو کرنے کے لیے ٹورونٹو بلائے گئے۔ بلانے والے یہی ٹیمپل والے وائس آف ویداس والے تھے۔ یہاں آیا تو مجھے کام کی آفر آ گئی اور آج آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ چلیے دیدی اب سر لگائیے ایمن ہی کو جاری رکھتے ہیں، پہلے پلٹے کیجیے۔ آپ 'اے ری عالی...' تو جانتی ہیں میں آپ کو ایک اور بندش دیتا ہوں۔ آپ بھلے اردو میں لکھیں میں اردو نہیں پڑھ سکتا۔

پیا کی نجریا جادو بھری
موہ لیو من پریم بھری
کون جتن اب کریے عالی — چین پرت نہیں ایک پل گھڑی۔

نظر اٹھا کر دیکھا تو میرا پیا پینتالیس منٹ واک کرنے کے بعد مجھے لینے آچکا تھا۔

میں نے ہیمنت سے تعارف کروایا کہ یہ میرے پپا ہیں اور یہ ذات کے نہیں بلکہ واقعی جنگ کرنے والے خاندان سے ہیں۔ مزید تعارف شاید دونوں کو ناگوار ہوتا اس لیے اس موڑ پر بات ختم ہوئی، کل کا وعدہ ہوا اور ہم نے اپنے گھر کی راہ لی۔

◇

ٹورونٹو میں بچوں کی زندگی قابلِ رشک ہے۔ کاش میں بھی یہاں پیدا ہوئی ہوتی تو ان تمام چیزوں سے لطف اندوز ہوتی۔ آج شام علی اپنی سوکر کی کلاس میں جائے گا، اماں ابا کے ساتھ دادا دادی بھی اپنے چیمپئن کو کھیلتا دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ ایک دن پہلے کینیڈین ٹائرز سے سوکر کے جوتے خریدے گئے ہیں۔ جانے سے دو گھنٹے پہلے دادا اور علی سوکر کی پریکٹس کررہے ہیں۔ میں دوپہر کی نیند کی غنودگی میں نیچے سے آتی ان کی آوازیں سن رہی ہوں۔ علی باربار دادا کو کھیلنے کا صحیح طریقہ سمجھارہا ہے اور دنیا کو ہر بات سمجھانے والے دادا بڑے تحمل سے علی کے احکامات پر عمل کررہے ہیں۔ مجھے اپنا ایسا بچپن یادنہیں۔ یہ اس نئی نسل کی خوش قسمتی ہے کہ یہ ان تمام محبتوں سے لطف اندوز ہوسکتی ہے۔ میں تو اپنے دادا دادی کے بارے میں تصور بھی نہیں کرسکتی کہ اس زمانے میں تصویریں بھی نہیں ہوتی تھیں اور جو تھوڑی بہت تھیں وہ انیس سو سینتالیس کی نذر ہوگئیں۔ جس طرح اس وقت بہت سے خاندانوں نے صفر سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا اسی طرح میری طرح کے بہت سے بچوں نے رشتوں اور محبتوں کے لحاظ سے بھی اپنی زندگی کا آغاز صفر سے کیا۔ دادی اور دیگر رشتوں کو ہم ترس گئے۔ چند رشتے دار کراچی میں جابسے اور برسوں بعد اس قابل ہوسکے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔ علی کی تیز آواز آتی ہے وہ دادا کو ڈانٹ رہا ہے کہ وہ دھیان سے نہیں کھیل رہے۔

آج گراؤنڈ میں دو میچ ہورہے ہیں۔ دو ٹیمیں جن کا آپس میں مقابلہ ہے وہ سبز اور نیلا لباس پہنے ہیں۔ علی کی ٹیم سرخ ٹی شرٹس پہنے ہے اور مقابل ٹیم پیلی ٹی شرٹس پہنے ہے۔ یہ تمام بچے پانچ اور چھ سال کے ہیں۔ سیٹی بجتے ہی سب بچے گیند کی طرف بھاگتے

ہیں۔ ہر بچے کی ٹی شرٹ کی پشت پر اس کا نمبر ہے۔ تمام ماں باپ اپنے اپنے بچے کو بھاگنے کے لیے کہتے ہیں اور چلا چلا کر کہتے ہیں کک دا بال۔ ہر ٹیم میں آٹھ بچے ہیں۔ بچے مختلف قومیتوں کے ہیں۔ ریڈ ٹیم کا نمبر پندرہ بچہ چینی ہے، لگتا ہے کہ وہ اکیلا پوری یلو ٹیم کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ جس مہارت سے وہ گیند کو بچا کر نکال لے جاتا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ قابلِ رشک اس لیے کہ ہمارا علی بڑے آرام سے بچوں کے ساتھ بھاگتا ضرور ہے مگر پوری کوشش کرتا ہے کہ بال سے دور رہے ایک مرتبہ تو بال بالکل اس کے قدموں میں تھا اور ہم سب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے ''علی کک دا بال۔'' مگر علی بڑی صفائی سے بلکہ احتیاط سے بال کے اوپر سے قدم بچا کر گزر گیا۔ ہمارا بس چلتا تو ہم خود لال ٹی شرٹ پہن کر علی کی جگہ کھڑے ہوجاتے۔ کوچ نے بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، سیٹی بجائی۔ پانچ ریڈ ٹیم کے بچے متوجہ ہوئے مگر تین بچے اسی کورٹ میں کوئی اور کھیل کھیلنے میں مصروف رہے۔ بڑی مشکل سے ان کو دوبارہ کھیل کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اسی عرصے میں وقفہ ہوگیا۔ تمام بچوں کو جوس دیا گیا۔ علی صاحب بھی ہمارے پاس آگئے اور اپنے کھیل کے مظاہرے پر داد چاہی۔ اس کی اس ادا پر ہمیں اور بھی پیار آیا اور ہم سب نے اسے داد دی اور دادی نے جذبات میں آکر اسے گلے لگالیا اور وہ اس وقت یہ بالکل بھول گئیں کہ پبلک میں علی کو یہ بالکل پسند نہیں کہ کوئی انھیں اس طرح پیار کرے کہ اس سے ان کی مردانگی پر حرف آتا ہے۔ ایک بار پھر سیٹی بجی علی بار بار ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلاتا تھا، اس کی دلچسپی کھیل سے زیادہ ہم میں تھی۔ اس مرتبہ ایک اور چینی بچہ نمبر اکیس اپنے کھیل کے جوہر دکھا رہا تھا۔ لگتا ہے جس طرح دنیا کی مصنوعات میں چین سرِفہرست ہے اسی طرح ہر میدان میں چینی بازی لے جانے والے ہیں۔ بہت عرصہ چین خوابِ غفلت کا شکار رہا مگر آج چین جاگ رہا ہے۔ مگر نیند سے جاگنے کے لیے اس قوم کو بہت بڑی قربانی دینی پڑی ہے۔ پوری ایک نسل ہر طرح کے عیش و عشرت سے دور رہی، بہت ہی روکھا سوکھا کھایا، صرف نیلے رنگ کا یونی فارم پہنا، صرف سائیکل چلائی اور گھر کے ہر فرد نے کام کیا۔ اتنی قربانیاں دے کر قومیں بنائی جاتی ہیں۔ کیا ہم قربانیاں دینے کو تیار ہیں؟ ہم تو راتوں رات

دنیا کے اس دھارے میں انفرادی طور پر داخل ہونا چاہتے ہیں جسے آج مغرب کہا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آج کی دنیا گلوبل ہے جس میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات قابلِ غور نہیں کہ آپ کی کوئی روٹس ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ اس کو صحیح سمجھتے ہوں مگر میں اس بات سے متفق نہیں۔ آپ کا پاسپورٹ کچھ بھی کہے، آپ کی شکل بتاتی ہے کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے اور وہ کہاں اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ آپ دنیا کی نظر میں کیسے ہیں۔ اور اس لمحے آپ ایک فرد نہیں رہتے بلکہ اس قوم کا ایک نمائندہ بن جاتے ہیں۔ وہ ایک چینی بچہ اپنی پوری قوم کی نمائندگی کرر ہا تھا، چاہے اس سے پہلے والی نسل بھی کینیڈا میں پیدا ہوئی ہو مگر وہ اب بھی چینی تھا۔

کھیل ختم ہوا، کون جیتا کون ہارا اس پر زیادہ زور نہیں تھا شاید مجھے بھی یاد نہیں رہا کہ کون سی ٹیم جیتی۔ دونوں ٹیمیں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں اور ایک ایک بچے نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور شکریہ ادا کیا۔

اگلی صبح کا سورج ابھی تک بادلوں میں چُھپا تھا۔ علی ساڑھے آٹھ بجے اسکول کے لیے نکلتا ہے، آج میں اور شعیب اسے چھوڑنے جارہے ہیں۔ مینا کا خیال ہے کہ وہ گھر میں اس پندرہ منٹ میں کچھ کام کرلے گی۔ میں اور علی آگے آگے ہیں اور دادا اور پوتی پیچھے ہیں۔ اسکول پہنچ کر داخلے کے دروازے تک جانے کے لیے علی کا ایک الگ ٹریک ہے۔ میں اس کا بیگ لیے دروازے پر کھڑی ہوں اور وہ گھاس پر سائیکل چلانے میں مصروف ہیں۔ بڑی مشکل سے دروازے پر پہنچ کر اس کی نظر اپنے بیگ پر پڑتی ہے مجھے غصّے سے دیکھتا ہے؛ آپ میرا غلط بیگ لے آئی ہیں You have brought the wrong bag میں بیگ کھول کر اس کو دکھاتی ہوں کہ تمھاری کتابیں اور تمھاری پانی کی بوتل تو اس میں ہے۔ تمھارا بیگ اس لیے بدلا گیا ہے کہ پُرانا بیگ پھٹ چکا ہے۔ مجھے اپنا پُرانا بیگ چاہیے۔ اس کی ٹیچر باہر آجاتی ہے اور اس کو اندر آنے کے لیے کہتی ہے مگر— آخرکار میں گھر کی طرف واپس جاتی ہوں، مینا اس کا پُرانا بیگ لے کر اسکول کی طرف روانہ ہوجاتی ہے۔

◇

ہیمنت مجھ سے بار بار ایک سوال کرتا ہے، کیا ایک عام پاکستانی ہم سے نفرت کرتا ہے؟ میری عمر کے لوگ، کیا وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ میں خاموش رہتی ہوں مجھے اس کا جواب نہیں معلوم، بظاہر جواب ہے کہ نہیں۔

لیکن اگر بہت اندر جھانکوں تو ہاں۔ اگر مقابلے کا وقت آجائے تو ہم اپنی فوج اور قومی نغموں کے ساتھ دشمن کے خلاف زہر اگلیں گے۔ میں اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے سوال کرتی ہوں، ''کیا آپ ہم سے نفرت کرتے ہیں؟''

''نہیں۔'' اس کا جواب ہے۔ میں کہتی ہوں، ''میرا بھی یہی جواب ہے۔'' میں ہیمنت سے پوچھتی ہوں، ''کیا تم یہاں خوش ہو؟''

''بہت خوش ہوں۔''

''کبھی گھر یاد نہیں آتا؟''

''کون سا گھر دیدی؟— میں تو چودہ سال کا گھر سے نکل گیا تھا۔ میرا اوڑھنا بچھونا میرا سنگیت ہے۔ وہ کسی بھی اس کمپیوٹر انجینئر کی طرح تھا جو سیلیکون ویلی میں رہتا ہے اور کبھی دو چار سال میں ایک مرتبہ اپنے دیس چلا جاتا ہے۔ اس دیس جو اسے اجنبی اجنبی سا لگتا ہے، جس کے باسی کچھ عجیب سی زبان بولتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی ٹورونٹو میں کمی نہیں۔ لورا جو علی کی دوست سیسلیا کی ماں ہے، اس کا تعلق کولمبیا سے ہے، اس کے ماں باپ کا تعلق کولمبیا سے ہے۔ لورا جو ڈینٹسٹ ہے مگر یہاں پر اسکول کی بس چلاتی ہے سیسلیا کا باپ اپنے ملک میں ایک کامیاب آرکیٹیکٹ تھا مگر یہاں پر اسی فیلڈ میں کسی چھوٹے عہدے پر کام کرتا ہے۔ لورا ہر وقت سیسلیا کو کولمبیا کے قصّے سناتی ہے، اس سے سپینش میں بات کرتی ہے، اس کو سپینش کھانا کھلاتی ہے۔

آج کا دن اور شام دونوں مصروف ہیں۔ دن اس لیے کہ آج علی کی گریجویشن کی تقریب ہے اور شام اس لیے کہ آج میں اپنے ان دوستوں سے ملنے والی ہوں جن سے بیس سال پہلے بچھڑی تھی۔ میرے ٹی وی کے زمانے کے دوست، جب میں پی ٹی وی سے خبرنامہ پڑھتی تھی۔ علی کی گریجویشن؟ جی ہاں علی اب گریڈ ون میں جائے گا۔ اسکول کے

باہر بورڈ لگا ہے کہ آج کنڈرگارٹن کے بچوں کی گریجویشن ہے۔ اس بورڈ کو پڑھ کر مجھے جانے کیوں ہنسی آتی ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ سب کچھ ہمارے یہاں نہیں ہوتا، کم ازکم عام اسکولوں میں یہ نہیں ہوتا۔ یہاں تو عام لوگ بھی اتنے اہم ہیں جب کہ ہمارے یہاں عام لوگ محض کوڑا کرکٹ ہیں۔ ہال کو بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا ہے۔ ہر طرف رنگ برنگے غبارے لگے ہیں، بچوں کے والدین اور گرینڈ پیرنٹس ہیں مختلف اقوام کے نانا، نانی اور دادا دادی۔ چینی، جاپانی، سپینش، گریکس، انڈین، پاکستانی، عرب اور نہ جانے کون کون— لڑکوں اور لڑکیوں کا فرق اسی عمر سے ظاہر ہے۔ لڑکیاں بڑے اطمینان سے ایک جگہ بیٹھی ہیں جب کہ لڑکے ایک بے چین روح کی طرح اپنی جگہ سے بھاگنے کو تیار ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے یہاں کی طرح چند بچوں کے نام پکارے جائیں گے اور بس۔ مگر یہاں ہر بچے کو باری باری بلایا گیا۔ ہر گروپ میں چھ بچے تھے جن کی پہچان ان کی مختلف خوبیوں کی وجہ سے تھی۔ وہ بچے جو لکھنے پڑھنے میں بہت اچھے تھے، وہ بچے جو بہت کوآپریٹو تھے، وہ بچے جو محنتی تھے، وہ بچے جو دوسروں کی بہت مدد کرتے تھے، وہ بچے جو ایک دوسرے کے ساتھ بہت مہربانی کا سلوک کرتے تھے۔ غرض وہ تمام خوبیاں جو انسان کو ایک اچھا شخص بناتی ہیں ان کے لیے سب بچوں کو سرٹیفکیٹس دیے گئے۔ لڑکیاں ان سرٹیفکیٹس کو لے کر آرام سے کھڑی رہیں جب کہ لڑکوں نے ان سے دوربین کا کام لینا شروع کردیا یا انھیں بیٹ کی طرح استعمال کرنا شروع کردیا۔ اس کے بعد ان ماؤں کو ایک ایک پھول پیش کیا گیا جنھوں نے بغیر کسی معاوضے کے اسکول میں کام کیا تھا۔ چند ماؤں کے علاوہ ان میں ایک آیا بھی شامل تھی۔ ٹیچر انچارج نے بڑی خوب صورت تقریر کی کہ میں وہ خوش قسمت ہوں جس نے ان بچوں کو ایک سال میں بڑھتے دیکھا، ان کی آہستہ آہستہ کھلتی تہوں نے خود کو مجھ پر آشکار کیا۔ ابتدائی زندگی میں انسان کتنا خوب صورت ہوتا ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ وہ بچہ جس پر ابھی زمانے نے اپنے نقش نہیں بنائے ہوتے، بچے کی ان کھلتی تہوں کے ہر سال میں اس کے بہتر انسان بننے یا نہ بننے میں استاد کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ویسے تو زمانہ خود بڑا استاد ہے— میں تھرڈ ورلڈ سے تعلق رکھنے والی تو

یہی کہہ سکتی ہوں کہ ہمارا تو سب سے بڑا استاد وقت ہی ہے۔ ہم چاہے گریمر اسکول میں ہوں یا امریکن میں، گورنمنٹ اسکول میں ہوں یا پبلک میں، ہمیں زمانہ بتاتا ہے کہ تم کون ہو، ہر شخص کی اپنی اپنی حدود ہیں اور اسے پتا ہے کہ اسے کن حدود میں رہنا ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی کوئی حدود نہیں۔ اگر آپ کسی وڈیرے کے بیٹے ہیں تو اپنی نمبر پلیٹ پر بڑے فخر سے گندا بچہ لکھوا کر پورے شہر میں ہارن بجاتے نکل سکتے ہیں اور کسی مائی کے لال کی ہمت نہیں ہوتی کہ آپ کو کچھ کہہ سکے۔ اچھے اسکول یا اچھی تعلیم یہاں کسی کا بال بیکا نہیں کرسکتی۔

جانے کیوں مجھے ایک سندھی ادیب حفیظ شیخ کی کہانی یاد آگئی، ''میں سکول نہیں جاؤں گا'' اس کہانی کے وہ بچے یاد آگئے جو ایک درخت کے سائے میں ایک ظالم اور جابر استاد کی تحویل میں دے دیے گئے تھے۔ اس ماسٹر کا کام صرف بچوں کو مارنا پیٹنا تھا۔ ایسی کہانی جو صرف اس ماحول سے تعلق رکھنے والا شخص ہی لکھ سکتا ہے۔ جب تک آپ اس ماحول کے تندور سے گزرے نہ ہوں آپ کا ذہن کسی ایسی کہانی کو جنم نہیں دے سکتا۔ میں نے سوچا کتنے بدقسمت ہیں وہ بچے جو اس ظلم وستم کا شکار رہتے ہیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی دنیا ہے جہاں اسکول مٹی کا تپتا صحرا نہیں بلکہ مرمر کے چمکتے فرش ہیں، جہاں استاد قہر وغضب نہیں بلکہ مہر و محبت کا سرچشمہ ہیں، جہاں اسکول نام ہے رنگین Crayons اور رنگین پلاسٹسین کا، خوب صورت کتابوں اور خوش رنگ فرنیچر کا۔ ''میں اسکول نہیں جاؤں گا'' کا مرکزی کردار ایک سات سال کا بچہ ہے جسے تختی پر ملتانی مٹی نہ لگانے پر گھونسوں لاتوں اور چھڑی سے اس قدر پیٹا جاتا ہے کہ بچہ لہولہان ہوجاتا ہے اور یہ لہولہان ہونا جسمانی سے زیادہ ذہنی ہوتا ہے۔ بچہ بخار میں پھنکتا ہوا صرف ایک ہی رٹ لگاتا ہے کہ ''میں اسکول نہیں جاؤں گا۔'' غریب باپ ماسٹر سے خود اتنا ڈرتا ہے کہ اس کی دھمکی پر بے ہوش بچے کو کاندھے پر ڈال کر اسکول کی طرف چل پڑتا ہے۔ کہانی کے پس منظر سے صرف ایک ہی آواز آتی ہے کہ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ کیا یونیسکو یا کسی دوسرے این جی او کے لوگ ایسے بچوں کے لیے کچھ کرسکتے ہیں؟— نہیں کبھی

نہیں... یہ بچے اس عذاب سے صرف اسی صورت میں نکل سکتے ہیں جب ان ہی میں سے کوئی تہیہ کرلے کہ مجھے اپنی مٹی کو اس عذاب سے نکالنا ہے۔

بچوں کے شور نے مجھے اس بھیانک خواب سے نکال لیا۔ سب بچے اسنیکس کھانے میں مصروف ہیں، سب کے ہاتھوں میں ایک ایک بسکٹ اور اور تربوز کی قاش ہے۔ میں گھر کی طرف روانہ ہوجاتی ہوں۔ جب ہم اسکول کی طرف گئے تھے تو ایک چینی عورت اپنے باغ میں مصروف تھی، اب بھی وہ اسی طرح پودوں کو سنوارنے میں مصروف ہے۔ مینا کا کہنا ہے کہ اس گھر کے سب افراد یعنی ماں، بیٹا اور باپ اپنا زیادہ تر وقت اپنے باغ کی دیکھ بھال میں گزارتے ہیں۔ یہ خاندان کب سے اس ملک میں بستا ہے معلوم نہیں؟ انھیں اپنے شہر کے موسم اور گل بوٹے یاد آتے ہیں یا نہیں؟ اس علاقے میں بہت چینی خاندان بستے ہیں۔ ایک بات جو میں نے ان خاندانوں میں دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ ہر گھر میں جوان اور بوڑھے اکٹھے بستے ہیں۔ اکثر صبح کوئی نہ کوئی بغیر دانتوں والا دادا یا نانا اپنے پوتا، پوتی کے ساتھ اسکول کی طرف جاتا نظر آتا ہے۔ سب لوگ اپنے بچوں سے چینی زبان میں بات کرتے ہیں۔ علی کی جماعت کا ایک بہت لائق بچہ وہ ہے جو انگلش میں سب سے اچھا ہے جب کہ اس کے ماں باپ بمشکل انگریزی بول پاتے ہیں۔ شاید چینی کلچر کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ تین چار نسلیں گزرنے کے باوجود یہ اس سے پیوستہ ہیں۔ میری ہیئر ڈریسر جو اسپینش بولتی ہے، اس کو بھی اس بات پر بہت فخر ہے کہ اسپینش بہت مضبوط زبان ہے اور اس کے تمام رشتے دار جو ایک صدی سے امریکا میں ہیں، اب بھی آپس میں اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔

◇

اس ہفتے ویک اینڈ پر ہم کسی جھیل پر جانے والے ہیں، یہ کینیڈا کا وہ علاقہ ہے جہاں جھیلیں ہی جھیلیں ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہم جزیرے اور جھیل کی تعریف یاد کرتے تھے کہ جھیل اس خطۂ زمین کو کہتے ہیں جس کے چاروں طرف زمین ہو مگر یہاں کے بچوں

کو یہ سب یاد کرنے کی ضرورت نہیں، یہاں تو قدم قدم پر جزیرے اور جھیلیں ہیں۔ گلو لیک ٹورونٹو سے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ اس شام مچلز جھیل میں غروبِ آفتاب کے وقت دو سورج ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ ایک سچ مچ کا سورج تھا اور دوسرا اس کا عکس، دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے اور کسی ایک پر بھی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ بالکل شاعر کے خواب کی طرح کہ خیال کی رعنائیاں محبوب کو اور بھی زیادہ خوب صورت بنادیتی ہیں۔ جھیل میں چھوٹی چھوٹی لہریں اور پس منظر میں ہوا سے جھومتے ہوئے درخت نقل کو اصل سے زیادہ خوب صورت بناتے تھے۔ چھوٹی سی آبادی میں صرف ایک گروسری اسٹور تھا اور سوچیے اس ویرانے میں کون تھا جس نے اپنی دُکان سجائی تھی؟ وہی چین کا رہنے والا باسی۔ اپنا جذبات سے عاری سپاٹ چہرہ لیے منتظر تھا کہ ہم اس کے بزنس میں اضافے کا باعث بنیں، وہی قوم جس کا ارادہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر حصے پر چھا جائے۔ کاٹیج نمبر سینتیس پر ایک اور چینی میزبان ہماری منتظر تھی۔ چار کمروں، کچن اور لیونگ روم پر مشتمل صاف ستھری کاٹیج جس کا نیچے کا حصہ بھی ایک بڑا سا لاؤنج تھا جس کا سامنے کا حصہ ایک بڑے ڈیک پر کھلتا تھا۔ اس ڈیک کے سامنے خوب صورت جھیل آئینے کی طرح چمکتی تھی۔ ہلکی ہلکی لہریں اس کی خاموشی میں خلل پیدا کرتی تھیں اور چمکتے آئینے میں سلوٹیں پڑجاتی تھیں۔ کبھی کبھی جھیل کی تہوں سے مچھلیاں بھی اچھلتی نظر آتی تھیں اور اگر نزدیک سے جھیل میں جھانکیں تو چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے قافلے کے قافلے تہوں میں تیزی سے اِدھر سے اُدھر بھاگتے تھے۔ مگر ہاتھ ڈال کر اگر انھیں پکڑنے کی کوشش کرو تو ہاتھوں سے ایسے پھسل جاتی تھیں جیسے زندگی کے لمحے آپ کے ہاتھوں سے نکلتے چلے جاتے ہیں اور ہزار کوشش پر بھی کوئی اچھا یا برا لمحہ رک نہیں سکتا۔ زندگی بھی کیا چیز ہے ایک بہتے دھارے کی طرح۔ مگر ہر گزرتا دن اپنے ان مٹ نقوش چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ بعض مرتبہ لگتا ہے کہ ان نقوش کے بنانے میں آپ کا اپنا کوئی دخل نہیں۔ وہ قوت جو تمام کائنات پر حاوی ہے چاہے تو منٹوں میں آپ کی خوشی کو غم اور غم کو خوشی میں بدل دے۔ ہم ایک دوسرے کو الزام دیتے ہیں اپنے اردگرد رہنے والوں کو الزام دیتے ہیں مگر اس کو الزام نہیں دیتے جو کائنات کی اس

شطرنج کا کھلاڑی ہے۔ جو ہمیں بے جان مہروں کی طرح استعمال کرتا ہے۔ ہمارا کام اس کی نعمتوں کا شکر کرنا ہے مگر کبھی کبھی یہ بھی جی چاہتا ہے کہ ہم اس سے پوچھ سکیں کہ تم کیوں ہماری زندگی سے کھیل کر ہمیں دکھ دیتے ہو تم یہ بھی تو کر سکتے ہو کہ ہماری جھولی صرف خوشیوں سے بھر دو۔

میں نے ایک جگہ انفرادیت کا ذکر کیا ہے، اگر آپ اپنا شناختی کارڈ دیکھیں یا اپنا پاسپورٹ دیکھیں تو اس میں آپ کی انفرادیت میں ایک خانہ یہ بھی ہے کہ آپ مرد ہیں یا عورت۔ یہ ایک ایسا خانہ ہے جو معاشرے میں آپ کا مقام مقرر کرتا ہے۔ خاص طور ہمارے ملک میں یہ خانہ فیصلہ کرتا ہے اس بات کا کہ زندگی کی ڈرائیونگ سیٹ پر کون ہوگا۔ اگر آپ عورت ہیں تو زندگی کا ریموٹ آپ کے ہاتھ میں مشکل ہی آئے گا۔ خالد حسینی کی ایک کتاب میں ایک افغانی عورت اپنی بیٹی کو بار بار کہتی ہے کہ تم عورت ہو، تم میں ایک چیز کا ہونا بہت ضروری ہے اور وہ ہے برداشت اور صبر۔ اگرچہ ایسا نہیں کہ ہر عورت ہی اس کا نمونہ ہے مگر جب ہم بات کرتے ہیں تو وہ بات اکثریت کی ہوتی ہے۔ اگر آپ معاشرے میں اپنا مقام جان لیں تو زندگی زیادہ اچھی گزرتی ہے مگر بعض مرتبہ یہ فارمولا بھی غلط ہو جاتا ہے۔ آپ جو کام صحیح سمجھ کر کرتے رہے وہ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کہانیوں میں سے ایک کہانی مہر اور احمد کی بھی ہے۔

میں مہر کو اس وقت سے جانتی ہوں جب اس کی شادی کو دو سال ہوئے تھے۔ میری نئی نئی شادی تھی اور میں ایک ایسے خوابِ غفلت میں تھی کہ جس میں آپ ہلکی لہروں پر ڈول رہے ہوتے ہیں۔ ہر چیز خوب صورت لگتی ہے۔ عملی زندگی سے بہت دور، خاص طور پر خواتین کہ جب آئینے میں دیکھتی ہیں تو نہ جانے کیسے وہ آئینہ اس حسن کو دیکھ کر پاش پاش کیوں نہیں ہو جاتا۔ مجھے مہر کی زندگی اپنی زندگی سے بھی زیادہ خوب صورت لگتی۔ وہ مہر جو کراچی کے ہوم اکانومکس میں پڑھاتی تھی۔ یہ پچھلی صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ انیس سو تریسٹھ میں جب ہمیں لاہور کے ہوسٹل تک میں جانے کی اجازت نہیں تھی اس وقت مہر پی ایچ ڈی کرنے لندن گئی تھی۔ تعلیم میں اتنی کامیابی کے ساتھ ساتھ مہر کو

محبت میں بھی بہت خوشیاں ملیں سوائے ایک صدمے کے کہ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوگئی جس نے اسے بہت تنگ کیا اور بقول اس کے کہ اس کے والد نے اسے اس جنجال سے نجات دلوائی۔ مہر کا خیال تھا کہ شاید یہ زندگی بھر کا غم ہے مگر کچھ ہی عرصے بعد اس کی ملاقات ایئرفورس کے ایک افسر سے ہوئی جو نہ صرف دیکھنے میں بہت پُرکشش تھا بلکہ ایسی شخصیت کا بھی مالک تھا کہ لوگ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ دوسری طرف مہر دیکھنے میں بہت معمولی تھی۔ اگرچہ جب آپ اس کے نزدیک آجائیں تو جس طرح تہ در تہ وہ آپ کے سامنے کھلتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک خوب صورت کتاب ہے کہ آپ پڑھتے چلے جائیں اور مزید پڑھنے کی خواہش کے تحت آپ اس کو اٹھا کر رکھ نہ سکیں۔ شاید یہی خوبی تھی جو فلائنگ آفیسر احمد شاہ کو پسند آگئی۔ ایئرفورس والوں کو بڑی حیرانی تھی کہ اتنے ہینڈسم شخص کو مہر جیسی معمولی شکل والی لڑکی کیسے بھا گئی۔ احمد ایک بہت نفاست پسند شخص تھے اور مہر اس سے بڑھ کر تھی۔ مہر بہت دھیمے لہجے میں بڑی بڑی باتیں کرنے والی لڑکی تھی۔ اس کا گھر اس کی اپنی شخصیت کا عکاس تھا۔ احمد واہ وا کرتے نہ تھکتے تھے۔ اور مہر کی ایک مسکراہٹ ان کی تعریف کا جواب تھی۔ مہر کے ڈرائنگ روم میں لہراتے پردے تھے، گھر میں ہر چیز نفاست سے اپنی مناسب جگہ پر رکھی تھی۔ دیواروں پر لگی پینٹنگز جو اس نے خود بنائی تھیں اور پھر چھوٹے چھوٹے شیشوں کے ٹکڑوں سے بنی وہ عورت جس کے چہرے پر تمام زمانے کا دکھ تھا، اس کے ٹیلنٹ کی عکاس تھی۔ اپنے ہاتھوں سے بنائے مٹی کے نوادرات اس کے گھر کا حصّہ تھے۔ جگہ جگہ سجے لیمپ مہر ہی کی روشنی سے مرصع تھے۔ اب خدا جانے یہ مہر و محبت تھی یا پھر سورج کی روشنیوں کی کرنیں تھیں جو اس گھر کو روشن کیے ہوئے تھیں۔ مہر کھانا پکانے کے فن میں بھی یکتا تھی۔ چائنیز کھانا ان کی میز پر سجتا تو خوشبوؤں سے کمرہ مہک اٹھتا۔ مہر کا کام تھا کھانا میز تک لانا اور پھر لوگوں کو پیار محبت اور اصرار سے کھلانا احمد کا کام تھا کہ وہ اس کھانے سے مہمانوں کی تواضع کریں۔ غرض دونوں کا جوڑا ایک مثالی جوڑا تھا۔ شادی کو دو سال گزرے، تین سال گزرے تو گھر میں کچھ کمی محسوس ہونے لگی۔ کبھی کبھی مہر اور احمد شاہ کو گھر اداس لگتا۔ زندگی اپنی ڈگر پر چلتی گئی،

دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہ کی اور پھر سب نے اچانک ایک دن دیکھا کہ ان کے گھر میں ایک بچہ لاڈوں سے پالا جارہا تھا۔ وہ بچہ کس سے لیا گیا تھا یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ زیب کو بھی ایک خاص طریقے سے پالا گیا۔ اس پر کبھی کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا گیا، نہ پڑھائی کا نہ کسی خاص طریقہ کار کا۔ جو اس کا جی چاہتا وہ ہوتا چلا جاتا۔ خدا جانے زیب خود جینئس تھا یا پھر اس کو پالنے کا طریقہ ایسا تھا کہ وہ ہمیشہ عام بچوں سے مختلف نظر آتا۔ اسکول میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ احمد شاہ ایک کامیاب ایئرفورس افسر تھے۔ جنگوں میں انھیں بہت سے تمغے اور ستارے مل چکے تھے۔ زندگی میں اتنے ڈسپلن کے عادی تھے کہ بعض مرتبہ مہر بھی ان کا مقابلہ نہ کر پاتی۔ ان کی کچھ اقدار تھیں، کچھ اصول تھے جن کے تحت وہ کام کرتے تھے۔

اپنے ان ہی اصولوں پر چلتے ہوئے انھوں نے اپنے کیریئر میں بھی بعض مرتبہ اپنے افسروں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ریٹائر کر دیے گئے۔ تلاشِ معاش کا سلسلہ شروع ہوا اور آخرکار یہ فیصلہ ہوا کہ وہ ملک سے باہر چلے جائیں۔ یہ قصہ انیس سو ستّر کا ہے جس زمانے میں اتنے لوگ ملک سے باہر نہیں جاتے تھے اور جو جانا چاہتے تھے ان کو ملک سے باہر جانے میں دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ کینیڈا پہنچ گئے۔ ایک چھوٹا سا گھر لیا گیا اور ایک بار پھر تلاشِ معاش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تلاش دونوں کر رہے تھے ایک دن مہر کو نوکری کی پیش کش ہوگئی۔ نوکری کے سلسلے میں گھر سے کافی وقت باہر بھی گزارنا پڑتا تھا۔ احمد جس زندگی کے عادی تھے اس میں ان کا گھر میں رہنا اور مہر کا باہر جانا کافی عجیب تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن مہر نے اپنی نوکری احمد کو دلوادی۔ احمد اسی میں خوش تھے کہ مہر گھر میں رہیں اور احمد یہ محسوس کریں کہ وہ گھر کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ شاید ان کی انا کی تسکین کا باعث یہی تھا اور مشرق کے رہنے والے مرد اسی میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ مہر نے اس بات کو بالکل محسوس نہیں کیا اور خاموشی سے اپنے رول کو نبھاتی رہی۔ درمیان میں کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ مہر نے نوکری کرنی چاہی مگر اس کی خوشی احمد کی خوشی تھی اور احمد اس کے کام کرنے سے کوئی خاص خوش نہیں

تھے۔ ان کا کہنا ایک طرح سے صحیح بھی تھا کہ گھر اور باہر دونوں کا بوجھ وہ مہر پر نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کا پیسا مہر کا پیسا تھا۔ مہر پر کوئی پابندی نہیں تھی، وہ بازار بھی جاتی اور جس طرح چاہے شاپنگ کرتی۔ کبھی کبھی تنہائی کا احساس ضرور ہوتا اور اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ نہ کرنا تعلیم کا زیاں بھی لگتا مگر... جہاں مہر میں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں یہ بھی تھا کہ وہ بے حد حساس تھی اور اس کے خیال سے یہ اس کی کم زوری تھی۔ شاید اس کا سوچنا صحیح تھا، لاپروا لوگ زندگی میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں اور جو ہر دکھ کو اپنے گلے سے لگالیں خود اپنی زندگی کو گھن لگاتے ہیں۔ زندگی جو صرف ایک بار ملتی ہے۔ اس کو ضائع کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ زندگی کی طرف ایسا رویہ ہو کہ کوئی دکھ آپ کے اندر سرایت نہ کر سکے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ اگر سب کچھ اپنے بس میں ہو تو پھر بنانے والے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں کہ جو کچھ ہوں اس کی ہی وجہ سے ہوں جس نے مجھے ایسا بنایا۔

مہر اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ دوسری طرف احمد کی یہ مجبوری تھی کہ انھیں کام کرنے کا جنون تھا۔ دن اور رات، ہر وقت کام میں مصروف رہتے۔ ان کے لیے کوئی دن چھٹی کا دن نہیں تھا۔ زیب کی مصروفیت کے باوجود یہاں مہر کتنی اکیلی تھی، یہ صرف مہر ہی جانتی تھی۔ احمد ہمیشہ کہتے، بس مجھے کچھ پیسا جمع کرنے دو جب ہم ریٹائر ہوجائیں گے تو بس میں اور تم ہوں گے اور ہم دنیا کی سیر کریں گے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ تمھاری خاطر ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو شاید مجھ میں یہ ذوق و شوق اور گرمی نہ ہوتی۔ تم تو میری راحت ہو، تم مجھے آج بھی اتنی ہی اچھی لگتی ہو جتنی پینتیس سال پہلے لگتی تھیں۔ تمھارے بالوں میں یہ چاندی کے تار میرے گزرتے سالوں کی محبت ہے۔ جیسے جیسے یہ بڑھتے جاتے ہیں میری محبت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ میرے آفس میں کتنے لوگ آئے اور گئے کتنی محبتیں اور طلاقیں ہوئیں ایک میں ہوں جس پر لوگ رشک کرتے ہیں۔ کیا تمھیں مجھ سے زیادہ کوئی چاہ سکتا ہے۔ مہر اپنی زندگی پر خود رشک کرنے لگتی، اسے یقین نہ آتا کہ اس کی زندگی اتنی اچھی گزری ہے۔ زیب اب تیس سال کا ہو چکا تھا اور مغربی روایات کے مطابق ایک الگ گھر میں رہتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ مغرب

میں رہتے ہوئے بھی وہ مشرق کا شیدائی تھا۔ فرنچ کے ساتھ ساتھ وہ اردو میں بھی پی ایچ ڈی کرنا چاہتا تھا۔ مہر اور احمد اس کی زندگی کی دعائیں کرتے کہ اب وہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ احمد ریٹائر ہوئے مگر پھر پرائیویٹ طور پر کام کرنے لگے۔ مہر بہت روئی دھوئی مگر احمد نے پھر اپنی مہر کو منالیا۔ مہر اس دوران کئی مرتبہ پاکستان گئی، کبھی اکیلی اور کبھی احمد کے ساتھ۔ آخرکار ستر سال کی عمر میں احمد کا کام کرنے کا جنون کچھ کم ہوا تو دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب دنیا کی سیر کو نکلا جائے۔ معمول کے مطابق احمد نے پورا پلان بنایا کہ کہاں کہاں جائیں گے اور آخر میں پاکستان میں چند مہینے گزاریں گے۔ غرض ایک سال کی چھٹی گزاری گئی اور پھر واپس کینیڈا پہنچ گئے۔ اس چھٹی کے دوران مہر سخت بیمار ہوئیں اور احمد نے اتنی خدمت کی کہ اور سب کے ساتھ خود مہر بھی حیران تھی اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھی۔ میری بھی اس دوران ان لوگوں سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ احمد ایک بہت خوش مزاج انسان تھے۔ ان کی صحبت ہر ایک کو ہی اچھی لگتی تھی۔ مہر سے دوستی کے ساتھ ساتھ میری احمد سے بھی اتنی ہی دوستی تھی اگرچہ ان کی نازک مزاجی کی وجہ سے میں ان سے تھوڑا خائف رہتی تھی۔ جہاں تک ان کی ذہانت کا تعلق تھا اس پر کون شک کرسکتا تھا۔ گورے چٹے احمد اب سفید بالوں کے ساتھ بالکل فادر کرسمس لگتے تھے۔ فوجیوں کی طرح اب بھی ان کی چال میں اتنا ہی تناؤ تھا۔ مگر اس کا احساس مجھے اس وقت بھی ہوتا تھا کہ اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

جب آخری بار میں مہر کے گھر گئی تو مجھے گھر میں ایک تبدیلی نظر آئی۔ کچن میں ہر چیز ایک دوسرے پر اس طرح رکھی تھی کہ کہیں ایک پیالی رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ میں نے کہا بھی کہ مہر یہ تمھارا کچن ہے؟ یہی حال باقی گھر کا تھا، ڈائننگ روم کی میز پر ہر طرف فائلیں اور کاغذ تھے۔ ضرورت کے وقت ان کاغذات کو ایک طرف کردیا جاتا اور اس پر چند پلیٹیں لگادی جاتیں۔ مہر تمھیں کیا ہوگیا ہے؟ تم ایسی تو نہ تھیں۔ جواب یہ تھا کہ ''بس میرا یہاں دل نہیں لگتا۔ احمد اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے اپنی پوری زندگی ضائع کردی۔'' میں نے کہا، ''تمھیں تو ایسا نہیں کہنا چاہیے کہ سب تمھارے

جوڑے کی آج بھی مثال دیتے ہیں۔ مگر مہر کا کہنا تھا کہ وقت کے ساتھ ہر چیز پرانی ہوجاتی ہے، اگرچہ احمد آج بھی اپنی محبت کے اسی طرح دعوے کرتے ہیں مگر نہ جانے کیوں کہیں کسی چیز کی کمی لگتی ہے۔ شاید یہ اپنے ماحول کا خلا ہے یا پھر ان سالوں کی تلاش ہے جو شاید مجھے اپنے وطن میں گزارنے چاہییں تھے۔ میں بہت زور سے ہنسی۔ ''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ آج اگر تم وہاں چلی جاؤ تو بجلی اور پانی کے نہ ہونے کا رونا روگی، جگہ جگہ بکھرا ہوا کوڑا تم سے برداشت نہیں ہوگا۔ تم یہاں رہ کر پلیوشن کی بات کرتی ہو، وہاں گئیں تو مرہی جاؤ گی۔'' مہر نے بہت آہستگی سے کہا، ''ہوسکتا ہے۔ مگر شاید میں اس زندگی سے تھک چکی ہوں اور کوئی تبدیلی چاہتی ہوں یا شاید احمد کی توجہ چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کی محبت آج بھی میرے لیے وہی ہے مگر خیر...''

زندگی کے چند اور سال گزرے۔ پھر میں نے سنا کہ مہر اور احمد مل کر ایک فلم بنا رہے ہیں، ان لوگوں کے بارے میں جو پینسٹھ کی جنگ میں لاپتا قرار دیے گئے تھے۔ مہر اور احمد پہلے آسٹریلیا گئے وہاں سے ایک شہید کی بیگم کو ساتھ لیا اور پھر ہندوستان پہنچ گئے۔ میں بہت خوش ہوئی کہ اب کم از کم دونوں مل کر کام کررہے ہیں اور مہر کی زندگی کا خلا پورا ہوچکا ہوگا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس نے جس تلاش میں زندگی گزاری تھی وہ بے کار گئی، مگر شاید وہ ایک بار پھر ایک بھرپور زندگی گزار رہی ہے۔ کیا ہوا اگر یہ سب بہتر اور تہتر سال کی عمر میں ہورہا ہے۔ زندگی میں جو سال بھی اچھے گزر جائیں وہ ایک نعمت ہے۔ اور پھر کچھ عرصے بعد جب میں ٹورونٹو میں تھی اور چائے کی پیالی لیے باہر بیٹھی طلوع ہوتے سورج کو دیکھ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ کون تھا جو صبح صبح فون کررہا تھا؟ شاید پاکستان سے فون ہو۔ دوسری طرف سے ایک ہلکی اور نازک سی آواز آئی، ''میں مہر بول رہی ہوں۔''

''اوہ — کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہوں اور تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

میں نے وقت دیکھا صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ ''آجاؤ اور ہمارے ساتھ ناشتا کرو۔'' میں نے ان کو پتا سمجھایا اور دس منٹ بعد گھر کی گھنٹی کی آواز آئی۔ ہم بہت تپاک

سے ملے۔ میں نے ایک پیالی چائے اور بنائی اور ہم پھر باہر جا بیٹھے۔ میں نے جیسے ہی حال پوچھا۔ مہر کی آنکھوں سے جھرنے بہہ نکلے۔ میں نے فوراً پوچھا، ''احمد کیسے ہیں؟''

''بالکل ٹھیک۔'' تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ میں نے اسے خوب رونے دیا اور پھر جب اس نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھا تو میں کانپ اٹھی۔ شروع میں تو میں نے سمجھا یہ میرا وہم ہے۔ احمد راتوں کو جاگتے تھے۔ پوری پوری رات کمپیوٹر پر گزارتے تھے۔ مگر یہ تو ان کی پرانی عادت تھی۔ ''تمھیں یاد ہے، کوثر میری پرانی دوست، جب امجد بھائی شہید ہوئے تو میں ہی تھی جس نے اسے دوبارہ زندگی کا راستہ دکھایا تھا ورنہ تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے دو بچوں کو چھوڑ کر شاید خود بھی امجد کے پاس چلی جائے گی۔ پھر کس طرح میں نے احمد سے کہہ کہہ کر ایئرفورس والوں سے اس کو پنشن وغیرہ دلوائی۔ چند سال بعد اس نے دوسری شادی کی، وہ بھی کامیاب رہی، اس کے دو اور بچے ہوئے۔ اب اس کے سب بچوں کی شادی ہوچکی ہے، وہ آسٹریلیا میں رہتی ہے۔ میں نے فلم بنانے کا پروگرام بنایا، میں نے اسکرپٹ لکھا، کوثر کو تلاش کیا۔ احمد اور میں نے اس سے مہینوں انٹرنیٹ پر رابطہ رکھا اور پھر ہم ایک دن سڈنی جا پہنچے۔ سڈنی اترے تو کوثر ایئرپورٹ پر کسی خوب صورت گڑیا کی طرح سجی بنی کھڑی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ چند ہی دن میں جانے کیسے وہ احمد کے دل میں اتر گئی اور اس دن کے بعد میں احمد کے لیے کچھ نہیں رہی۔'' میرے سامنے ایک لٹی پٹی بوڑھی عورت بیٹھی تھی جس کے بال مکمل سفید تھے، جس کے چہرے پر جھریاں تھیں، غم نے اسے مزید بوڑھا کردیا تھا۔ وہ محور اس سے بہت دور جاچکا تھا جس کے گرد اس کی زندگی گھومتی تھی۔

''وہ میری شکل نہیں دیکھنا چاہتے، وہ اپنی مہرو کو بھول چکے ہیں۔ میں نے مانا کہ میں کبھی خوب صورت نہیں تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آج بھی چینی کی گڑیا لگتی ہے، مگر آخر وہ کتنی مرتبہ اپنی خوب صورتی کو کیش کروائے گی اور میں کب تک اپنے خوب صورت نہ ہونے کی سزا بھگتوں گی— کیا میری خدمت کا یہی صلہ ہے؟— کیا میرا زندگی بھر کا جوگ بے کار گیا؟ میں جو اگر کام کرتی تو آج دولت کے لحاظ سے کہاں ہوتی— میں، جس نے احمد کی انا کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے کو کہاں کہاں پس منظر میں رکھا— ہمیشہ اپنی لیاقت کو چھپایا کہ ایسا نہ ہو کوئی مجھے ان سے زیادہ لائق سمجھ لے۔ وہ شخص جسے میں نے سب سے بڑھ کر چاہا، آج مجھ سے بات کرنے کا روادار نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس گھر سے چلی جاؤں تاکہ وہ اپنی بقیہ زندگی اچھی طرح گزار سکے۔ اس کے خیال سے اس کے اور میرے درمیان کبھی کوئی چیز مشترک نہیں رہی۔ مجھ سے الگ ہونے کے لیے اس کے پاس آج بہت سے جواز ہیں۔ کبھی میں سوچتی ہوں وہ شاید سچ ہی کہتا ہے، میری ہی آنکھوں پر پردہ تھا۔ اس نے شاید ہمیشہ خود کو مجھ سے ارفع سمجھا۔ اس نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے گھر میں کسی ایسے شخص کی جگہ نہیں تھی جس کا تعلق مجھ سے تھا۔ میں نے کبھی اپنا حق نہیں مانگا شاید اسی ڈر سے کہ کہیں وہ مجھ ناراض ہوکر مجھ سے الگ ہونے کا فیصلہ نہ کرلے۔ مگر جانے والے کو روکا نہیں جاسکتا، میری تمام تر ریاضت کے باوجود وہ میرا نہیں ہوسکا۔ اس کا کہنا ہے کہ تمھارے ساتھ میری زندگی کے دن ضائع ہوگئے، اب جو تھوڑی بہت زندگی بچی ہے میں اس سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے رو رو کر ان سے گزرے ہوئے سالوں کی بھیک مانگی۔ مگر ان کا کہنا تھا تمھارے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کا ہر لمحہ میرے لیے ضائع کرنے کے برابر تھا۔ ابھی پچھلے دنوں وہ بیمار ہوئے تو اسپتال میں ریسیپشن پر خاص طور پر آرڈر تھا کہ میں انھیں نہیں دیکھ سکتی۔ جب کہ کوثر جو ان کی کچھ نہیں لگتی، وہ وہاں موجود تھی۔ وہ شخص جس کی میں نے ہر موڑ پر خدمت کی جس کی تکلیف پر میں آج بھی تڑپ اٹھتی ہوں۔''

میں نے حیرانی سے مہر کو دیکھا، یہ کس قسم کی عورت ہے، کیا اس طرح کی محبت کرنا جائز ہونا چاہیے؟ کیا کوئی صورت ہوسکتی ہے کہ مہر اس سے نفرت کرنے لگے؟ کیا اگر مہر احمد کے ساتھ یہ سب کچھ کرتی تو احمد کی سوچ بھی یہی ہوتی؟ وہ احمد جس نے مہر کو اس کے اپنوں سے دور کردیا، وہ جو پہلے دن سے یہی کہتا رہا کہ تم اپنے لوگوں سے ملتی ہو تو مجھے لگتا ہے تم انھیں مجھ سے زیادہ چاہتی ہو، اس لیے تم ان سے ملنا چھوڑ دو۔ مہر اس کی محبت کا یقین کرتی چلی گئی۔ احمد نے پہلے اس کو اکیلا کیا، اس سے اس کا اعتماد چھینا، جب

بھی مہر کا بھائی یا بہن اس کے گھر آئے احمد نے ان سے سرد مہری کا سلوک کیا، اور جب بھی ان کے گھر گیا ہمیشہ مہر پر بہت بڑا احسان رہا۔ ہمیشہ وہاں سے واپس آکر اس نے یہی کہا کہ میں وہاں جاکر بہت بور ہوتا ہوں۔ وہ جب بھی ناراض ہوا منانے میں مہر ہی نے پہل کی۔ رفتہ رفتہ اس کے اپنے لوگ اس سے دور ہوگئے اور مہر نے اپنے ساتھ یہ زیادتی بھی ہونے دی۔ اب وہ زندگی کے اس موڑ پر تنہا ہے۔ شاید جو لوگ دوسروں کا بنتے بنتے اپنے پیاروں کو چھوڑ دیتے ہیں یہ ان کی سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔ سوال پھر وہی ہے کہ کیوں؟ احمد نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ آخر ان تمام باتوں کا کوئی جواب ہے؟

مہر رودھو کر خاموش ہوچکی تھی۔ ایک پژمردہ سی مسکراہٹ لیے وہ زندگی کے اگلے حملے کے لیے تیار تھی۔ کیا وہ احمد کو اب بھی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی؟ اس تمام سلوک کے باوجود وہ منتظر تھی کہ احمد دوبارہ اس کی طرف رجوع ہوں۔ پروین شاکر کا ایک شعر مجھے کبھی پسند نہیں آیا:

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

مگر شاید پروین شاکر نے بھی یہ شعر ایسی ہی کسی مجبوری کے تحت کہا ہوگا، جس کو لوگ محبت کا نام دیتے ہیں۔ کبھی میں اس طرح بھی سوچتی ہوں کہ احمد کا کوئی قصور نہیں، وہ بھی سچ تھا کہ وہ کبھی مہر سے پیار کرتا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ اب مہر کی بجائے کسی اور کو چاہتا ہے۔ ضروری نہیں کہ زندگی کے ایک لمحے میں جو آپ کو اچھا لگے وہ زندگی بھر اچھا لگتا رہے، باقی تمام شاعرانہ باتیں ہیں۔

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

کتنا اچھا ہوتا کہ مہر حساس نہ ہوتی، کتنا اچھا ہوتا کہ وہ خود کو چاہتی، اپنی کھوج کو جاری رکھتی اور اپنی تعلیم کو یوں رائگاں نہ کرتی لیکن اگر ایسا ہوتا تو اتنی کہانیاں کیسے جنم لیتیں؟

پتیوں کی پلکوں پر اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر دھوپ پر سکھاتی ہے
چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلکتی ہے

پھر بھی اک اندھیرا ہے جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہو جائے

مہر کے بالوں میں چاندی کے تار آج بھی چمکتے ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ پورا سر ہی چاندی کا ہوچکا ہے مگر احمد کی نظر سے اوجھل ہیں، محبت کے تمام دعوے جھوٹے نکلے۔ وہی گھر ہے، وہی مہر ہے مگر اب ماحول وہ نہیں رہا۔ احمد اپنا ناشتا اور کھانا خود بناتے ہیں، مہر زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتی ہے یا پھر اپنی بہن کے یہاں چلی جاتی ہے۔ قانون کے مطابق یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ ہر جائیداد کا آدھا حصّہ مہر کا ہوگا اور آدھا حصّہ احمد کا ہوگا مگر احمد کے فیصلے کے مطابق گھر مہر کو ملے گا، آدھی پنشن مہر کو ملے گی اور بقیہ بینک میں جو بھی پیسا ہے وہ صرف احمد کا ہوگا۔ مہر کو ہر فیصلہ منظور ہے، اب بھی اس کے دل میں امید کی ایک کرن ہے کہ شاید احمد اس کو دوبارہ اپنالیں۔ میرے اندر کی باغی عورت کہتی ہے کہ کیا مہر کوئی بے جان چیز ہے کہ جب چاہے استعمال کرلیا اور جب چاہے کونے میں پھینک دیا۔ مگر مہر کو یہ بات کون سمجھائے، مہر تو آج بھی وہ خط لیے پھرتی ہے جو کبھی آج سے چالیس سال پہلے احمد نے اسے لکھے تھے۔ وہ مجھے کہتی ہے کہ میں وہ خط پڑھوں جو میرے لیے کافی ambarassing ہے۔ آج بھی وہ احمد کو معصوم سمجھتی ہے، اس کے خیال سے سب قصور کوثر کا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ عورت کبھی مرد کو دوش نہیں دیتی۔ خدا جانے وہ کیا چاہتی ہے؟ شاید وہ اپنے آپ کو تسلی دینا چاہتی ہے، ماضی میں جینا چاہتی ہے وہ ماضی جو محض ایک جھوٹ ثابت ہوا۔

مہر کی زندگی کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ شاید ہم عورتیں جونک کی طرح ہیں کہ ایک بار کسی کے ساتھ چمٹ جائیں تو اسے چھوڑتے نہیں۔ چاہے وہ شخص کتنا بھی اپنے آپ سے چھڑانے کی کوشش کرے مگر ہم اس کو نہیں چھوڑتے۔ شاید ایسا کہنا بہت سخت بات ہے اور کافی دکھ کا سبب بھی — مگر اکثریت کی حقیقت یہی ہے:

شاید عشق اسی کا نام ہے کہ انسان معشوق کے لیے اپنی ذات کو مٹا دیتا ہے!

◇

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ میرا چہچہانا

نہ وہ میرا آشیانہ تھا، نہ باغ کی بہاریں تھیں اور نہ میں کسی ایسے موڈ میں تھی لیکن نہ جانے کیوں برڈ کنگڈم دیکھ کر مجھے یہ شعر یاد آگیا۔ اگر علامہ اقبال کا پرندہ اس جگہ ہوتا تو کبھی یہ فریاد نہ کرتا۔ نیاگرا کے کنارے ایک بڑا سا ہال تھا جہاں ہر رنگ کی چڑیاں تھیں، بہت سا سبزہ تھا، ٹہنیاں تھیں اور جھاڑیاں تھیں۔ ہر طرف ایک ایسی چہچہاہٹ تھی جو کسی جنگل میں ہی سنی جاسکتی تھی۔ دنیا کے ہر حصّے سے چڑیاں جمع کرکے یہاں ایک خوب صورت ماحول بنایا گیا تھا، صرف ایک چیز تھی جو یہاں کھلتی تھی اور وہ تھی انسانی آوازیں اور کیمرے کی فلیش لائٹس۔ اس کمرے کی کھڑکی کے باہر رین بو برج تھا جہاں نیاگرا بہت آہستہ آہستہ بہتا تھا، اگرچہ اس جگہ سے تھوڑی دور پر وہ اس قدر رفتار سے گرتا تھا کہ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ رین بو برج کے پار امریکا کا شہر بفلو نظر آتا تھا۔ یوں تو اس سرحد پر بہت سے پل ہیں جن کے ذریعے آپ امریکا میں داخل ہوسکتے ہیں مگر اس پل کی خاص بات یہ ہے کہ آپ یہاں سے پیدل امریکا میں داخل ہوسکتے ہیں۔ بہرحال برڈ کنگڈم کا یہ حصّہ اتنا قدرتی اور خواب ناک تھا کہ جی چاہتا تھا کہ یہاں سے باہر نہ جایا جائے۔ اس بڑے ہال میں چڑیاں بالکل آزاد تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ ابھی آپ سے ٹکرا جائیں گی۔ یہ سب اپنے ملک، اپنے موسموں کو بھول چکی تھیں اور کھانے کی اتنی فراوانی تھی کہ پھر کس کو اپنا ماحول یا گھر یاد آتا ہے۔ چڑیوں کے ساتھ بھی مغرب نے وہی سلوک کیا تھا جو انسانوں سے کیا ہے کہ انھیں بہتر جگہ اور آرام دے کر خرید لیا تھا۔ امریکا بھی ایک بہت بڑا سا پنجرہ ہے جس میں ہر آرام مہیا ہے۔ اچھا کھانا، اچھا نظام، زندگی کی کون سی سہولت ہے جو یہاں موجود نہیں۔ ایک غریب ملک کا باشندہ جب یہاں پہنچتا ہے تو کچھ عرصے میں ہی وہ ایک گاڑی اور گھر کا مالک ہوجاتا ہے۔ اگرچہ ہر چیز ادھار کی ہوتی ہے مگر کم ازکم فوری زندگی تو آرام سے گزرتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ اتنے قرضوں میں پھنس جاتا ہے کہ واپس جانا ناممکن ہوجاتا ہے۔ میں ابھی پچھلے دنوں پاکستان کی بڑی

بڑی مشہور شخصیات سے ملی ان تمام لوگوں کا تعلق ریڈیو یا پی ٹی وی سے تھا، مثلاً سہیل رعنا تھے جن کا شمار ملک کے کامیاب میوزک ڈائریکٹرز میں ہوتا ہے۔ زبیرالدین تھے جنھوں نے کم ازکم پچیس سال تک خبرنامہ پڑھا ہے۔ طارق فتح اور نجم الحسن جو پی ٹی وی کے پروڈیوسر تھے۔ سعید احمد نسیم ایک اور ٹی وی نیوز ریڈر اور ان کی بیگم راحیلہ جو کافی عرصے کومپیئر کی حیثیت سے ٹی وی سے منسلک رہیں۔ پوری شام تھی اور... ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا— اور وہ پری وش تھا پاکستان— رہتے باہر ہیں اور بات صرف پاکستان کی کرتے ہیں۔ بعض لوگ اسے نوسٹیلجیا بھی کہیں گے۔ جب وہ یہاں بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ واہ کیا عیش تھے وہاں کہ ہم باہر سڑک پر کرکٹ کھیلتے تھے، ساتھ ہی، دادی اماں صحن میں ہمیں کہانی سناتی تھیں، پرسکون ماحول تھا۔ کتنا وقت ہوتا تھا۔ کاش ہم پھر وہاں واپس چلے جائیں تو شاید کچھ وقت ملے اور ہم کام کے علاوہ بھی کچھ سوچ سکیں۔ شاید اس حد تک میں بھی ان کی اس سوچ سے اتفاق کروں گی... لیکن آج اگر یہ سب اپنے ان محلوں میں واپس جائیں تو مشتاق احمد یوسفی کی طرح وہ بھی یہی کہیں گے کہ یہ تو وہ جگہ نہیں جو میرا تصور مجھے دکھاتا تھا۔ کہاں گئی وہ خوب صورت ندی جو گھر کے پیچھے بہتی تھی، یہاں تو ہر طرف شور ہی شور ہے اور یہ کیا یہاں پر لوگ بغیر اطلاع کے گھر میں گھسے چلے آتے ہیں، مانا کہ ماموں یا چچا ہیں مگر اتنی بھی کیا بے تکلفی؟ اور ایک بہت مشہور جملہ جو اکثر سننے کو ملتا ہے کہ Pakistan stinks میرے تصوّر کے محلے میں اس گٹر کی بو تو نہیں تھی اور پھر اتنی گرمی اور نلکوں میں پانی نہیں آتا— نہ نہ مجھے یہ سب نہیں چاہیے، میں اپنے حال میں بہت خوش ہوں۔ وہ حال جہاں بجلی نہیں جاتی، ایک بہت بڑا پنجرہ جہاں ٹمپریچر بھی کنٹرولڈ ہے اور راستے بھی بڑے واضح ہیں اور قوانین بھی بہت سخت ہیں جن سے آپ قطعاً روگردانی نہیں کرسکتے۔ جہاں آپ ایک بہت بڑے پنجرے میں جمہوریت کی مالا جپتے ہیں اور بالکل آزاد ہیں۔

اس شام ہمارے ساتھ زیادہ تر وہ پاکستانی تھے جنھوں نے اپنا زیادہ وقت سعودی عرب میں گزارا اور پھر عافیت کی تلاش میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہاں آ بسے۔ کچھ عرصہ ایسا بھی گزرا جب وہ خود سعودی عرب میں تھے اور بیوی بچے ٹورونٹو میں آباد تھے۔ کئی حصّوں میں بٹے یہ خاندان اپنے بچوں کا بہتر مستقبل ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آ پہنچے ہیں۔ وہ بچے جو اپنی زبان سے ناآشنا ہیں، اپنے کلچر، اپنے ادب اور اپنی روایات سے ناواقف ہیں، جو شاید بعض اوقات خود اپنے ماں باپ کے لیے اجنبی ہیں۔ ان میں وہ بچے بھی شامل ہیں جو پاکستان کی زمین کو اپنا مانتے ہی نہیں۔ جب اس زمین کی بات کرتے ہیں تو ان کے لہجے میں ایک حقارت ہوتی ہے۔ اس بات پر مجھے اپنے میوزک کے استاد فہیم صاحب کا سنایا ہوا ایک قصّہ یاد آ گیا۔ وہ کسی بہت بڑے عہدے پر فائز کسی ایئر فورس والے کے یہاں میوزک سکھانے جاتے تھے۔ ان صاحب کے والد نے بہت غربت میں محنت کر کے اپنے بیٹے کو اس مقام تک پہنچنے میں مدد دی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ہر روز سائیکل پر اپنے بیٹے کو اسکول چھوڑ کر آتے، کسی نہ کسی طرح اس اسکول کی فیس دیتے اور اب جب بیٹے کی گاڑی پر ایک جھنڈا لگا تھا تو وہ باپ اسی بیٹے کے محل کے کوارٹر میں پڑا تھا۔ ہماری نسل نے صرف باپ کو کوارٹر میں پھینکا تھا جب کہ آج باہر پلنے بڑھنے والی ہماری اولاد پوری قوم کو کوارٹر کا درجہ دیتی ہے، وہ کوارٹر جہاں جاہل، بے کار اور غلام قوم بستی ہے۔

مگر صرف غریب ملکوں کے لوگ ہی امریکا نہیں آتے بلکہ کئی اور ملک بھی ہیں جہاں کے لوگ یہاں بستے ہیں۔ آج لورا اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ہماری مہمان ہے۔ لورا ایک نازک سی خاتون جس نے آج شیفون کی اسکرٹ اور سلک کا بلاؤز پہنا ہے۔ ان خوب صورت رنگوں میں وہ اس لورا سے کہیں مختلف لگ رہی ہے جو بچوں کی اسکول بس چلاتی ہے۔ اس دن مجھے وہ ایک معمولی شکل کی لڑکی لگی تھی مگر آج جب میں اسے غور سے دیکھتی ہوں تو اس کی شکل بہت خوب صورت ہے۔ اس کی سفید رنگت میں ایک ہلکی سی آمیزش ہے جو اس کی صورت میں کشش پیدا کرتی ہے۔ بوٹا سا قد جو اس کو مزید نازک بناتا ہے۔ گھنی بھنوؤں کے سائے میں گہری آنکھیں، چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ، کالے بالوں میں سنہری تار تھے۔ بیضوی چہرہ تھا اور ہنستے ہوئے خوب صورت

والت آپ کو اس کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیکری کا ڈبا تھا جس میں کچھ رولز تھے۔ ان کے یہاں بھی یہ روایت ہے کہ جب کسی کے گھر جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس کا ایک بڑا بیٹا بھی ہے جو چودہ سال کا ہے۔ کیوں کہ وہ خود اٹھائیس تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔ اس کی بیٹی سیسلیا شاید اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اگرچہ سیسلیا جو علی ہی کی عمر کی ہے مگر وہ علی سے کہیں زیادہ سمجھ دار لگتی ہے۔ وہ سیسلیا جس کے بارے میں علی اپنے نانا سے کہتا ہے کہ اب سیسلیا آتی ہے تو اسے دیکھ کر تمھاری آنکھیں چمکنے کیوں لگتی ہیں؟ سیسلیا نے آتے ہی سب سے پہلے یہ کہا کہ ”علی تمھارا پلے روم اتنے برے حال میں کیوں ہے؟“

لورا کی انگریزی زیادہ اچھی نہیں ہے، لہجے میں اس کی اپنی زبان کا ایکسینٹ موجود ہے۔ لورا کو ٹورونٹو آئے ہوئے نو سال گزر چکے ہیں۔ کولمبیا وہ ملک ہے جو دنیا کی چھبیس ویں بڑی قوم ہے اور رقبے کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر ہے۔ لورا اور اس کا شوہر الوارو، کولمبیا کے ایک چھوٹے سے شہر گرارڈوٹ کے باشندے ہیں۔ الوارو ایک کامیاب آرکیٹیکٹ تھا اور لورا ایک ڈینٹسٹ تھی۔ ان کے ملک کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے، گوریلاز سب پر حاوی آتے چلے گئے۔ وہ ملک جو زمین کے لحاظ سے بہت زرخیز ہے وہاں صرف کوکین اگائی جانے لگی۔ یہ گوریلاز کا حکم تھا کہ کوکین اگانے والے کو نہ صرف زیادہ پیسے ملیں گے بلکہ اس کے جان و مال کی حفاظت بھی ہو گی۔

نتیجہ یہ تھا کہ ملک رہنے کے قابل نہ رہا۔ اس کے والد ایک بئیر بنانے کی بھٹی میں کام کرتے تھے، یقیناً بہت امیر آدمی نہیں تھے مگر ان کا شمار اپر مڈل کلاس فیملی میں ہوتا تھا۔ ہاں اس کے شوہر کے گھر والوں کا شمار بہت امیر لوگوں میں ہوتا تھا۔ الوارو کے والد اور دادا بہت بااثر زمین دار تھے۔ آہستہ آہستہ حالات اتنے خراب ہو گئے کہ ان لوگوں کو لگا کہ ان کے گرد خطرے کا حلقہ تنگ ہونے لگا۔ دہشت گرد کسی کو بھی چن لیتے اور پھر آپ کتنا بھی بچنے کی کوشش کرتے وہ آپ کے کسی بھی فرد کو اٹھا لیتے اور مزید دہشت پھیلانے کے لیے قتل کرنا کوئی بڑی بات نہ رہی۔ کچھ لوگوں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا مگر جو ملک سے

باہر جانے کی قوت رکھتے تھے انھوں نے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ لورا کی گاڑی کو تین مرتبہ گن پوائنٹ پر اٹھایا گیا۔ اس کے شوہر سے کئی مرتبہ پیسے چھینے گئے۔ ملک کی فوج سے زیادہ دہشت گرد مضبوط ہوگئے، کسی طرح کی حفاظت نہ رہی، چھوٹے سے چھوٹا کام کروانے کے لیے رشوت کی ضرورت پڑنے لگی۔ جب لورا مجھے یہ باتیں بتا رہی تھی تو میں اس کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ کیوں کہ میں یہ سب کچھ اپنے ملک میں دیکھ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے پنجاب چورنگی پر اپنی گاڑی کا شیشہ کھلا رکھا تو کم از کم میرا موبائل اور بیگ تو مجھ سے ضرور چھین لیا جائے گا اور اگر احتجاج کیا تو اس حکم عدولی پر مجھے گولی بھی ماری جاسکتی ہے، اس پولیس والے کی موجودگی میں جو جان بوجھ کر میری طرف سے منہ پھیرے کھڑا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے بچوں کو ملک سے باہر بھیج دیا۔

میرے اور میرے بچوں کے لیے باہر جانے میں اتنی مشکلات نہیں تھیں جتنی لورا کو تھیں۔ لورا اور اس کا شوہر انگریزی کا ایک لفظ نہ جانتے تھے۔ سب سے پہلے انھیں انگریزی سیکھنی پڑی۔ امریکا وہ جانا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ امریکن انھیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، اس کے علاوہ امریکا جانے کے لیے کوئی جائز صورت نہیں تھی اور وہ غیر قانونی طور پر وہاں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے پانچ سالہ بیٹے کو لے کر وہ ٹورونٹو آگئے۔ سیموئیل کو بھی انگریزی سیکھنی پڑی مگر اس کے لیے زبان سیکھنا زیادہ آسان تھا۔ لوارو کی ڈگری یہاں قابلِ قبول نہیں تھی اس لیے وہ ایک آرکیٹیکٹ کے یہاں ریسیپشن پر کام کرنے لگا۔ سب سے ضروری بات یہ تھی کہ لورا زبان سیکھے۔ صبح کو سیموئیل کنڈر گارٹن جاتا، اس وقت لورا انگلش کی کلاس میں جاتی۔ پیسا پھر بھی اور چاہیے تھا، اب سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ لورا نے ہنس کر بتایا کہ ”ایک کام تھا جس میں زبان کی ضرورت نہیں تھی اور وہ کام تھا صفائی کا۔ بہت مشکل سے میں نے کلیننگ وومن کا کام ڈھونڈا۔ یہ کام مجھے رات کے لیے ملا مگر اس وقت ضرورت کی وجہ سے میں کوئی بھی کام کسی بھی وقت کرنے کو تیار تھی۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے ڈرائیونگ لائسنس کے لیے بھی کام کیا، ایک کام جس میں اچھے

پیسے بن سکتے تھے، وہ کام تھا اسکول کے بچوں کی بس چلانا۔ اس لائسنس کے لیے بھی کافی عرصہ لگتا ہے، بہت سے مراحل سے گزرنے کے بعد آپ وہاں تک پہنچتے ہیں۔ اس کے لیے چھ ہفتے کی ٹریننگ لی۔ ویسے بھی اب مجھے انگریزی آگئی تھی اور زندگی کافی آسان ہوگئی تھی۔ یہ اس طرح کا کام تھا جس میں، میں بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکتی تھی۔“

میں نے اس سے پوچھا، ”کیا تمھیں ایک ہائی اسٹیٹس سے نیچے گرنا برا نہیں لگا؟“ کہنے لگی، ”بالکل نہیں کیوں کہ جان سے پیاری کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں یہاں محفوظ ہوں۔ مجھے ڈر نہیں کہ کوئی مجھے یا میرے بچوں کو اٹھا کر لے جائے گا۔ میں نے اپنے لوگوں کو وہاں ختم ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے اپنے سسر کے بہت بڑے گھر کے وہ کھنڈرات دیکھے ہیں جہاں میرے شوہر نے اپنا بچپن گزارا ہے۔ جب حکومت آپ کو تحفظ نہ دے سکے تو اس ملک کا یہی انجام ہوتا ہے۔“ لورا کا کہنا ہے کہ اس کے یہاں تعلیم کا معیار بہت اچھا ہے۔ ”ہمارے یہاں نوسو ساٹھ ٹی وی چینلز ہیں اور گاؤں گاؤں لوگ ٹی وی دیکھ سکتے ہیں۔ ان چینلز پر اور ریڈیو پر ایلیمینٹری اور ہائی اسکول کی کلاسز ہوتی ہیں۔“ شاید اکثریت پڑھی لکھی ہے۔ میں نے اس سے کہا، ”مگر تعلیم سے تمھارے ملک میں کوئی فرق نہیں پڑا، اسی طرح تمھارا کہنا ہے کہ تمھارے ملک میں نوے فی صد لوگ کیتھولک ہیں، تمھارے خیال سے مذہب کیا ہے؟ کیا یہ ایک شخص کو اچھا بنانے میں مدد دیتا ہے؟“ اس کا جواب تھا، ”ہاں میں یقین رکھتی ہوں کہ مذہب ایک بہت بڑی طاقت ہے جس کا ہونا بہت ضروری ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ مذہبی لحاظ سے ہمارے کیتھولک ہونے پر مجھے فخر ہے۔“ میں نے پھر اس کی بات کاٹی اور کہا کہ ”مگر کیا وجہ ہے کہ نوے فی صد لوگ مذہب کے ہونے کے باوجود ظلم وستم کر رہے ہیں؟“ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور کہا، ”ہاں جب میں اس بات کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ مذہب محض ایک روایت ہے کہ جو کچھ آپ کے ماں باپ کرتے چلے آرہے ہیں آپ بھی وہی کرنے لگتے ہیں۔ اس مذہب کا کوئی فائدہ نہیں جو آپ کو اچھا انسان نہ بنا سکے، آپ کے دل میں رحم نہ پیدا کر سکے۔ غلط کام کر کے اپنے آپ کو کسی مذہب کا پیروکار کہنا اس مذہب کی تذلیل ہے۔ جب بچہ پیدا

ہوتا ہے تو ہمارے یہاں اس کو مذہبی طریقے سے ہپناٹائزڈ کیا جاتا ہے اور بس مذہب یہاں آکر ختم ہوجاتا ہے۔'' اس سوال کا جواب شاید وہ مزید دینا چاہتی تھی مگر اس کے آنسوؤں نے اس کی آواز میں ایک لرزش پیدا کردی اور وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ میری پوری شام لورا کے ساتھ اسی دھوپ چھاؤں میں گزری، کبھی اس کی آواز رندھ جاتی اور کبھی وہ ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کرتی۔ جب میں نے اس سے باتیں شروع کی تھیں تو مجھے لگتا تھا جیسے یہ انٹرویو بے حد کاروباری سا ہوگا، اس نے اپنی کہانی بڑے سادے طریقے سے شروع کی تھی مگر میرے بعض سوالات نے اسے اتنا جذباتی کردیا کہ اس نے اپنے ساتھ مجھے بھی رُلادیا۔ لورا کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو تھے جب میں نے اس سے پوچھا کہ ''کیا وطن کی محبت کوئی چیز ہوتی ہے؟'' لورا نے غصے سے کہا، ''مجھے کیوں اس وطن سے، اس زمین سے محبت ہوگی جس نے میرا سب کچھ چھین لیا۔'' اس کی تکلیف کی شدت کا احساس اس بات سے ہوتا تھا کہ اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا، ''میرے دل میں درد ہوتا ہے، میرے دل میں زخم ہیں جو مجھے میرے ملک نے دیے ہیں۔ جب میں سوچتی ہوں کہ میرے لوگوں نے مجھے کتنا دکھ پہنچایا میرے ساتھ کتنی ناانصافی ہوئی، مگر... مگر پھر بھی نہ جانے کیوں میں اس زمین سے پیار کرتی ہوں— چاہے میں جو بھی کہوں وہی زمین میری پہچان ہے۔ میں اپنے ماں باپ کی سب سے چھوٹی اولاد تھی، اپنی بہن سے سات سال چھوٹی۔ میرے ماں باپ نے مجھے بڑے لاڈ سے پالا کیوں کہ اس وقت ان کے پاس پہلے کی نسبت پیسا بھی زیادہ تھا مگر میں ان کے لیے کچھ نہیں کرسکی۔ میری ماں اس وقت پچاسی سال کی ہے، وہ بیمار ہے اور میں اس سے کہیں دور یہاں اس ملک میں ہوں جہاں بہترین کوالٹی آف لائف ہے۔ اور میری ماں شاید اس وقت موت کے بہت نزدیک ہے— اور میں، میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتی... راتوں کی تنہائی میں اس اجنبی زمین پر جب میری آنکھ کھلتی ہے تو میں اپنے پیاروں کو یاد کرتی ہوں... میں اس ملک سے، اس ملک کے لوگوں سے کیوں محبت کروں جنھوں نے مجھے میرے اپنوں سے جدا کردیا— مگر شاید یہ انھوں نے نہیں کیا، یہ میری کم ہمّتی نے کیا ہے۔ وہ ملک جتنا ان ظالم لوگوں کا ہے اتنا میرا بھی تو

ہے۔ مگر میں ان کی بندوقوں کا مقابلہ کیسے کرسکتی تھی؟ وہ میرے جیٹھ کو تین مرتبہ گاڑی سمیت لے گئے اور ہمیں محسوس ہوا کہ اب حلقہ تنگ ہوتا جارہا ہے، اب یہ سب کچھ ہمارے ساتھ کبھی بھی ہوسکتا ہے اور وہی ہوا، ایک دن وہ میرے شوہر کو اٹھالے گئے۔ یہ دو مرتبہ ہوا اور پھر ہم نے سوچا کہ یہاں سے چلے جانا ہی اچھا ہے۔ ہم نے بہت لوگوں سے مدد مانگی مگر پولیس یا حکومت سب ہی ان گوریلاز کے ہاتھوں مجبور تھے۔ بھتا بڑھتا جارہا تھا ہم جو کچھ بھی کماتے اس کا زیادہ حصّہ دہشت گردوں کو چلا جاتا تھا، ہمارا رہنے سہنے کا معیار گرتا چلا گیا۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ ہم ہر وقت فکرمند رہنے لگے کہ کہیں ہمارے بیٹے کو اغوا نہ کرلیا جائے۔ اگرچہ ہم امیر نہیں تھے اس کے باوجود ڈر تھا کہ وہ کب ہمیں اپنی لسٹ میں شامل کرلیں اور پھر ہم کچھ نہ کرسکیں مگر ہم اتنا کرسکتے تھے کہ کہیں اور کسی اور ملک میں چلے جائیں۔ اس ملک سے دور جہاں سوشل ورکرز بھی ان کے ہاتھوں مجبور تھے، وہ اپنے کالموں میں حکومت اور فوج کو برا بھلا کہہ سکتے تھے مگر ان ظالموں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، جو عورتوں کی چھاتیاں کاٹ کر درختوں پر لٹکا دیتے تھے۔ میں جب اس زمانے کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ وہ جسم کے اعضا میری بہن، میری بیٹی اور میری ماں کے بھی ہوسکتے ہیں۔ میرا ملک جس کی زمین زرخیز ہے، جس میں صرف کافی، کوکو، پھل، سبزی ہی نہیں بلکہ زمرد کے خزانے ہیں۔ میری زمین چاند کی طرح حسین ہے اور وہاں خوب صورت پرندے بستے ہیں۔ پھلوں سے لدے درخت زمین کو چھوتے ہیں مگر ہمارے لوگوں نے اس کی قدر نہیں کی، برے لوگ اچھے لوگوں پر حاوی ہوتے چلے گئے اور آج میں اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے یہاں بس چکی ہوں۔ میں، جس کا خواب تھا کہ ایک ڈاکٹر بن کر اپنے ملک میں رہوں گی۔ یہاں میں کتنا عرصہ بھی رہ لوں مجھے کولمبیا کا شہری ہی سمجھا جائے گا۔ لیکن اتنا عرصہ یہاں رہنے کے بعد کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہم سب کتنے بے حس ہوچکے ہیں۔ میرے خیال میں اگر آپ میں رونے کی حس ختم ہوجائے تو آپ انسان نہیں رہتے۔ میں کیسی انسان ہوں کہ رونا بھول چکی ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ باتیں جن پر افسوس ہونا

چاہیے، ہم کمبین ان پر ہنستے ہیں۔ غریبوں کے بارے میں ایسے لطیفے ہیں جیسے ہم کہتے ہیں کہ ایک بچہ کہیں چھپا بیٹھا ہے اس انتظار میں کہ کوڑے کا ٹرک کب آئے گا۔ جیسے ہی ٹرک آتا ہے تو وہ کہتا ہے 'ماما کوڑا آ گیا ہے' اور ماں جواب دیتی ہے، 'بیٹا ابھی یہ نیچے کا کوڑا ہے اوپر کا حصّہ آنے دو وہ زیادہ اچھا ہوتا ہے۔' یہ میرے ہی وطن کے لوگ ہیں جو ایسی باتوں پر ہنس سکتے ہیں۔ میں خود بھی ویسی ہی ہو چکی ہوں، جب کوئی قوم کسی بات پر رو نہ سکے تو وہ قوم، قوم نہیں رہتی۔ میں ان کو کیا کہوں، میں تو خود رونا بھول چکی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ میں ہی ہوں۔ میں اس قابل نہیں کہ انسان کہلا سکوں۔''

میں نے موضوع بدلا اور اس سے کہا کہ ''تمھارے اور یہاں کے لباس میں تو کوئی فرق نہیں ہوگا؟'' کہنے لگی، ''نہیں نہیں، بہت فرق ہے۔ یہاں کے لوگ نسبتاً پُرانے خیالات کے ہیں۔ اگر میں اپنے یہاں کا لباس یہاں پہنوں تو لوگ کہیں گے کہ شاید میں بکینی پہنے پھر رہی ہوں۔ ہمارے یہاں اسکرٹ بلاؤز تو پہنتے ہیں مگر وہ اتنا باریک ہوتا ہے کہ نیچے پہنے ہوئے انڈرویرز صاف نظر آتے ہیں۔ وہاں وہ لوگ ان کپڑوں کے عادی ہیں اس لیے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔'' اب لورا باہر جانے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ اس کو اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کو تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میں نے اس سے آخری سوال پوچھا، ''تمھارے یہاں عورت کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہاں مرد اور عورت یا لڑکوں اور لڑکیوں سے ایک جیسا سلوک ہوتا ہے؟'' کہنے لگی، ''ہاں بالکل ایک جیسا—— کم از کم وہاں کی عورت یہاں کی عورت سے بہتر ہے۔ یہاں غریب طبقے میں عورت باہر کام بھی کرتی ہے اور رات کو جب مرد شراب پی کر گھر آتا ہے تو اس کی مار بھی کھاتی ہے۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے، وہاں مرد گھر کی پوری ذمے داری اٹھاتا ہے۔'' میں نے مزید کریدا ''تو گویا مرد عورت میں کسی قسم کی تخصیص نہیں؟'' کہنے لگی، ''بس اتنا ہے کہ جب سب کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو مرد کی پلیٹ سب سے بڑی ہوتی ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گھر میں کما کر لاتا ہے۔''

''اور اگر عورت کما کر لاتی ہے تو کیا اس کی پلیٹ بھی نسبتاً بڑی ہوتی ہے؟''

کچھ دیر وہ چپ رہی اور پھر کہا، ''نہیں، ایسا نہیں ہوتا۔''

مجھے ایسا لگا جیسے پوری دنیا میں ایک ہی کہانی ہے، چاہے وہ عورت کی ہو یا قوم کی۔ تمام ہجرت کرنے والوں کی کہانی بھی ایک ہی ہے چاہے وہ اپنی خوشی سے ہجرت کریں یا مجبوری میں۔ ابھی پچھلے دنوں میں انٹرنیٹ پر دیکھ رہی تھی جہاں کوئی مجھے کہتا تھا (مجھے اس لیے کہ میرا تعلق انھیں لوگوں سے ہے جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آئے تھے۔) آج ساٹھ سال پاکستان میں رہنے کے باوجود مجھے یہ سننے کو ملتا ہے کہ ''یو بلڈی امیگرینٹس، تم واپس ہندوستان کیوں نہیں چلے جاتے؟'' ہوسکتا ہے یہ کسی دیوانے کی بڑ ہو۔ مگر پھر بھی اس نے جا کر دل میں کہیں ایک تیر سا مار دیا۔ کیا ہم وہ لوگ ہیں جنھیں کہیں کوئی نہیں اپنائے گا؟ مگر میرے بیٹے عامر کا کہنا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ جھنجھلا کر کہتا ہے، ''امی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں، اب سرحد کوئی چیز نہیں رہی، اب دنیا گلوبل ہے، دنیا سب کی ہے۔ یہاں بوسٹن میں دیکھیں کہاں کہاں کے لوگ بستے ہیں۔ سب ایک جیسے لگتے ہیں، کسی کو کسی سے کوئی عناد کوئی اجنبیت نہیں ہے۔'' مگر میں شاید پُرانے زمانے کی ہوں کہ جو اس آنکھ دیکھتی ہے وہ میں نہیں دیکھ سکتی۔ اتنا تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ اب ایک شخص اپنی زندگی کے دس سال اگر ایک جگہ گزارتا ہے تو بیس سال کہیں اور۔ اور پھر ہوسکتا ہے کہ زندگی کے بقیہ سال کہیں اور گزارے۔ مگر پھر بھی اس کی ایک پہچان ضرور ہے۔ ایک پہچان وہ ہے جس سے لوگ اسے پہچانتے ہیں اور پھر ایک پہچان وہ ہے جو اس کی کوروں میں بسی ہے وہ چاہے زندگی کے آخری ایام گزار رہا ہو مگر کہیں اندر اگر وہ جھانک کر دیکھے تو وہ تین چار جگہوں سے اپنا تعلق نہیں پاتا۔ اس کے باوجود کہ وہ مختلف تہذیبوں کا آمیزہ ہوتا ہے مگر کہیں اندر وہ اب بھی کسی ایک جگہ سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید اسی کا نام کلچر ہے جو سکھایا نہیں جا سکتا بلکہ آپ کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ وہ جو آپ کی شہ رگ سے نزدیک ہوتا ہے۔

بوسٹن

یہ ایک چھوٹا سا جہاز ہے بلکہ ایک ٹڈا ہے جس میں ہم بوسٹن جا رہے ہیں۔ میرے سامنے کی سیٹ پر ایک اور جوڑا ہے جو اردو میں بات کر رہا ہے۔ عورت نے اسکارف پہنا ہے، چار بچے ساتھ ہیں جن کی عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان ہیں۔ میرے بائیں طرف ایک چینی بھائی ہے اس کے سامنے ایک امریکن ہے۔ جہاز کے عملے میں صرف ایک ہی شخص نظر آتا ہے جو ایک لمبا چوڑا گورا ہے۔ جسم کا وزن زیادہ اور سر پر بالوں کی کمی بتاتی ہے کہ وہ بھی چالیس کی حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ بے حد خوش مزاج شخص جو بقیہ امریکنوں کی طرح اونچی آواز میں بات کرتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے سب مسافروں کا پُرانا واقف ہے۔ جہاز کے دروازے بند کرنے کے بعد وہ مسافروں کے لیے اناؤنسمنٹ کرتا ہے، وہی لگی بندھی ہدایات جو روز کے سفر کرنے والوں کو زبانی یاد ہو چکی ہیں۔ جہاز فضا میں اٹھتا ہے اور ایک بار پھر صاف ستھرا اور ہریالا ٹورونٹو ہمارے سامنے ہے۔ نیچے تمام گھر اور عمارات اتنی ترتیب سے ہیں کہ بنانے والے کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اگرچہ مطلع قطعاً ابر آلود نہیں مگر پھر بھی نیلے آسمان میں سفید بادلوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہمارے ساتھ چلتے ہیں، جہاز کی کھڑکی کھلی ہوتی تو شاید میں انھیں ہاتھ لگانے کی کوشش کرتی مگر پھر بھی ہاتھ نہ لگا سکتی مگر میرے ہاتھ ضرور گیلے ہو جاتے۔ بالکل ان یادوں کی طرح جو مجھے ان

گزرگاہوں پر بار بار لا کھڑا کرتی ہیں جن سے بچ کر میں حال میں سفر کرنا چاہتی ہوں کیوں کہ بہتر یہی ہے کہ میں ماضی کی بجائے حال میں رہوں مگر دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ میں ماضی کی بھول بھلیوں میں جان بوجھ کر گم ہو جانا چاہتی ہوں مگر درمیان میں وقت کی ایک ایسی چلمن ہے جس سے چھن چھن کر یادیں آتی ہیں اور میں پیاسی رہ جاتی ہوں۔ جہاز کے عملے کا واحد نظر آنے والا شخص مجھے چونکا دیتا ہے۔ وہ سب کو جوس اور ڈرنکس دے رہا ہے۔ (میں نے پیش کر رہا ہے کا لفظ اس لیے نہیں استعمال کیا کہ ایک تو اس کا انداز مختلف ہے اور دوسرے میرا ذہن اس سلسلے میں بہت صاف ہے کہ کوئی گورا ہمیں کچھ دے ضرور سکتا ہے مگر پیش نہیں کر سکتا۔) جب تک وہ مجھ تک پہنچا اس کے رٹے ہوئے سوال مجھے یاد ہو چکے تھے۔ کون سی ڈرنک چاہیے؟ او کے، تو میٹو؟ چھوٹا یا بڑا؟ برف کے ساتھ یا بغیر برف کے؟ کیا آپ کا جونٹس خریدنا چاہتے ہیں؟ اگر ہاں تو مجھے تین ڈالرز دے دیجیے۔ نیکسٹ۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے چینی بھائی اور امریکن بھائی اپنے لیپ ٹوپس کھولے کوئی فلم دیکھنے میں مصروف تھے۔ ایک گھنٹا بیس منٹ کی بات تھی کہ ہمیں بوسٹن کا شہر نظر آنے لگا، بوسٹن کا شہر جو امریکا کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اس شہر کا جب ذکر کریں تو اس شہر میں آنے والا پہلا نام ریونڈ ولیم بلیک کا ملتا ہے جو سولہ سو انتیس میں یہاں آیا۔ اس کے ایک سال بعد یعنی سولہ سو تیس میں ستمبر کے مہینے میں جون ون تھروپ اپنے بہت سے پیوریٹن ساتھیوں کے ساتھ یہاں آبسا۔ کچھ عرصے بعد ون تھروپ نے سوچا کہ اس جگہ کو وہ پیوریٹن کی مستقل آماج گاہ بنائے گا۔ وہی شخص ہے جس نے اس جگہ کا نام بوسٹن رکھا۔ پیوریٹنز کے سخت رویّے اور پالیسی کو دیکھتے ہوئے یہاں آنے والا پہلا شخص بلیک اسٹون یہ جگہ چھوڑ کر چلا گیا۔ اگلی دو صدیاں یہاں پر پیوریٹنز نے حکومت کی۔ اس زمانے میں یہاں بہت سے دانش ور پیدا ہوئے اور یہاں پر بہت سے لاطینی اسکول کھلے، یونی ورسٹیاں قائم ہوئیں اور سب سے بڑی یونی ورسٹی ہاورڈ قائم ہوئی۔ کیوں کہ یہ جگہ سمندر کے ساحل پر واقع ہے اس لیے یہاں صنعتی ترقی بھی ہوئی اور یہ جگہ ایک تجارتی مرکز بن گیا۔ اور اٹھارویں صدی میں یہ انگریزوں کی کولونیز کا سب سے

کامیاب مرکز تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کے گرد بہت سے چھوٹے چھوٹے شہر آباد ہونے لگے۔ دریا کے کنارے نئی بستیوں کے ساتھ ساتھ مچھیرے اور کسان بھی ترقی کرنے لگے۔ اگرچہ یہ کالونیاں مرکز سے بہت دور تھیں مگر بہرحال یہ سب حکومتِ برطانیہ کی تابع تھیں۔ حکومتِ برطانیہ کو جب ایسا لگا کہ اس کے اخراجات زیادہ ہیں اور اسے مزید دولت کی ضرورت ہے تو اس نے اپنی کولونیز پر ٹیکس بڑھا دیے۔ گویا سترہ سوتیں وہ زمانہ تھا جب انقلاب کے بیج بوئے گئے اور ایک نئی سوچ نے جنم لیا۔ اسکول اور یونی ورسٹی ہونے کی وجہ سے لوگ اس قابل تھے کہ کچھ سوچ سکیں۔ ایک فلسفے کے تحت لوگ سوچنے لگے کہ بادشاہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہم ان کے عائد کردہ قوانین کی پیروی کیوں کریں؟ کیا یہ ہر شخص کا حق نہیں کہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے اور اس کو بھی اسی طرح جینے کا حق ہو جس طرح بادشاہ کو ہے۔ اسے ہم پر کس نے بادشاہ مقرر کیا۔ سترہ سو تہتر میں ٹی پارٹی ایکٹ پاس ہوا اور یہاں کے لوگوں نے حکمرانوں کی تمام چائے سمندر میں بہا دی۔ یہ احتجاج بالکل پسند نہیں کیا گیا اور حکومت نے اس پر قابو پانے کے لیے مزید فوج اس طرف روانہ کردی اور یہاں کے لوگوں کے ہتھیار ضبط کر لینے کا حکم دیا۔ لیکسینٹن پر اتنا شدید حملہ ہوا کہ اس کی آواز پوری دنیا نے سنی۔ اس وقت جارج واشنگٹن کو کانگریس نے یہاں کے باشندوں کی مدد کے لیے بھیجا۔ جارج واشنگٹن جس کا امریکن تاریخ میں ایک بہت بڑا مقام ہے۔ اس نے اس کے علاوہ نیو یارک اور نیوجرسی کے مقام پر بھی امریکا کی آزادی کے لیے بہت سی جنگیں لڑیں۔

بوسٹن میں تمام ترقی انیس ویں صدی میں ہوئی جب سڑکیں، نہریں، ریلوے اور پل بنائے گئے۔ جب اٹھارہ سو اکتالیس میں کام کرنے والوں کی کمی ہوئی تو سب سے پہلے آئرلینڈ کے لوگ یہاں آئے۔ جب سول وار ہوئی تو بوسٹن کو مزید فائدہ ہوا۔ یہاں پر فوجیوں کے لیے اسلحہ، جوتے، کمبل اور فوج کے لیے دوسرا سامان بننے لگا۔ بیس ویں صدی میں یہاں پر فیکٹریاں اور کارخانے بند ہونے لگے تو ایسا لگا کہ اب یہاں کہیں زوال نہ آجائے مگر یہاں پر اس کی جگہ بینکنگ، ہول سیل اور صنعت نے ترقی کی۔ دوسری

جنگِ عظیم کے وقت یہاں پر کارخانے ایک مرتبہ پھر جاگ اٹھے اور بوسٹن اسلحے کا ایک بڑا مرکز بن گیا انیس سو پچاس میں بوسٹن کمپیوٹر اور ہائی ٹیک انڈسٹریز کا لیڈر بن کر ابھرا اور آج بوسٹن کی اسکائی لائن بڑے بڑے آفس اور بلڈنگز سے منور ہے۔

بوسٹن امریکا کا وہ شہر ہے جس میں دنیا کی مشہور یونی ورسٹی ہاورڈ واقع ہے، وہ یونی ورسٹی جہاں سے نکلے ہوئے لوگوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ ان کو وہاں داخلہ ملا اور پھر وہ اس سے کامیاب ہوکر نکلے، مثلاً جون ایف کینیڈی اور ان کا بقیہ خاندان اسی یونی ورسٹی سے نکلا اور پھر اس ملک پر حکومت کی۔ بڑے بڑے نوبل انعام یافتہ لوگوں کا تعلق اس یونی ورسٹی سے رہا ہے۔ ہمارے یہاں سے بے نظیر بھٹو جیسے لوگوں کا تعلق بھی اسی یونی ورسٹی سے ہے جو یقیناً لیڈر شپ کوالٹیز کی حامل ہیں۔ بہت سی بڑی بڑی کمپنیوں کے بانی اور مالک جنھوں نے یہاں سے تعلیم حاصل کی۔ جب آپ کسی محفل میں کہتے ہیں کہ 'آئی ایم فروم ہاورڈ' تو وہاں بیٹھے لوگ خود بخود اپنے آپ کو بونا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ یونی ورسٹی سولھویں صدی کے اوائل میں بنی تھی۔ یہاں کی ہر عمارت بذاتِ خود اپنے قدیم ہونے کی دلیل ہے۔ بوسٹن کا ایئرپورٹ وہی ایئرپورٹ ہے جہاں سے وہ جہاز اڑے تھے جنھوں نے دنیا کی کیفیت بدل دی۔ جی ہاں نائن الیون کا واقعہ اسی شہر سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ طالبِ علم اسی شہر میں رہتے تھے جنھوں نے پوری دنیا کو ایک مشکل میں ڈال دیا۔ آج آپ جس ایئرپورٹ پر بھی جائیں آپ کی پوری تلاشی ہوتی ہے، آپ کے جوتے تک اتروائے جاتے ہیں اور آپ ایک سرحد سے دوسری سرحد میں ننگے پیر داخل ہوتے ہیں۔ (بلکہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق تو اب آپ برہنہ دوسرے ملک کی سرحد میں قدم رکھیں گے)

عامر جس شہر میں رہتا ہے اس کا نام آرلنگٹن ہے، ایک چھوٹا سا شہر جو خود کفیل بھی ہے اور پُرسکون بھی۔ اس کے علاوہ جب آپ کا جی چاہے اس علاقے میں پہنچ جائیں یہاں خوب گہما گہمی ہے، جہاں ریورنڈ کے گھوڑے کے قدموں کے نشان ہیں۔ آپ سڑک پر چلتے ہیں تو بہت عجیب لگتا ہے کہ اس سڑک پر گھوڑے کی نالیں کیوں پیوستہ ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ کیا کوئی قوم اس طرح بھی اپنی تاریخ کو یاد رکھتی ہے۔ ہر وہ جگہ جہاں تاریخ

نے اپنے نشان چھوڑے ہیں، تاریخ کا ہر وہ قدم جو انھیں اپنے بزرگوں کی کوششوں کی یاد دلاتا ہے، انھوں نے اسے سنبھال کر رکھا ہے اور یہ سب آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک یادگار بن گیا— ایسی یادگار جو ان کے لیے باعثِ فخر ہے۔ جب تک یہ نشان باقی ہیں انھیں اپنے آبا و اجداد کی قربانیاں یاد رہیں گی۔ چاہے وہ نشان گھوڑے کی نال کی صورت میں ہوں یا وہ دیوار ہو جو گولیوں سے چھلنی کی گئی تھی۔ اسی سڑک پر ذرا آگے ایک کتابوں کا اسٹال نظر آتا ہے جہاں ہر کتاب کی قیمت تین ڈالر ہے۔ کتابوں کے اسٹال پر ایک ہجوم ہے، اس اسٹال کا مالک ایک بوڑھا شخص ہے جو اس وقت نوٹوں کی ایک بڑی گڈی لیے بیٹھا ہے۔ لگتا ہے آج اس کی ساری کتابیں بک جائیں گی۔ آپ جب بھی آئیں گے اس کو اسی جگہ پر پائیں گے۔ مجھے یاد آیا کراچی میں بھی ریگل کے پاس پرانی کتابیں بکتی ہیں۔ لوگوں نے زمین پر کتابیں لگائی ہوتی ہیں اور تھوڑے بہت پڑھنے پڑھانے والے لوگ جو پاکستان میں بچے ہیں وہاں اکثر دیکھے جاتے ہیں۔ منٹو، احمد ندیم قاسمی، فیض، اقبال، غالب یہاں تک کہ ایسی بہت سی کتابیں بھی مل جاتی ہیں جو اب نایاب ہیں۔ کتابیں پڑھنے والے بھی نایاب ہیں اور کتابیں بھی نایاب ہیں۔ شاید ہم وہ لوگ ہیں جو اپنے ہونے پر شرمندہ ہیں، اپنی روایات، اپنی اقدار اور اپنی تاریخ کو سنبھالنا نہیں جانتے۔ اٹھارہ سو اڑتیس میں لارڈ میکالے نے لنڈن میں پارلیمنٹ میں ایک تقریر کی جس میں اس نے کہا کہ ”میں نے ہندوستان کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔ وہاں بے انتہا دولت ہے۔ وہاں بہت قابل اور اعلیٰ اقدار کے لوگ بستے ہیں۔ اگر ہم واقعی ان کو توڑنا چاہتے ہیں تو اس کے تعلیمی نظام اور ثقافت کو نقصان پہنچانا ہوگا، ایک ایسا تعلیمی نظام رائج کرنا ہوگا جس سے وہ احساسِ کم تری میں مبتلا ہو جائیں اور انھیں اپنا لگے جیسے جو کچھ بھی انگریز کے پاس ہے، ان سے بہتر ہے۔ اس سے ان کی خودداری کو ٹھیس پہنچے گی اور پھر وہ صحیح معنوں میں وہ قوم بن جائیں گے جن پر ہم حکومت کر سکیں گے۔“ نہ جانے کون لوگ ہوتے ہیں جو اتنا آگے کا سوچ سکتے ہیں۔ ہم آج بھی وہ قوم ہیں جو احساسِ کم تری میں مبتلا ہیں اور اپنا اچھا برا نہیں جانتے۔

ہاورڈ کی جس سڑک پر ہم ہیں یہاں ہر طرف ان کی نوجوان نسل نظر آتی ہے۔ جگہ جگہ کیفے ہیں، بڑے بڑے درخت ہیں جن کی چھاؤں میں بنچ پڑے ہیں۔ بعض جگہ لوگ گھاس پر لیٹے ہیں، زیادہ تر لوگ کچھ پڑھتے پڑھاتے نظر آتے ہیں۔ کتابوں کی اتنی بڑی بڑی دکانیں ہیں کہ آپ ایک دکان پر گھنٹوں گزار سکتے ہیں بلکہ اگر مہینے بھی گزار دیں تو صرف کتابوں کے ٹائٹل دیکھ سکتے ہیں۔ تین چار منزلوں پر مشتمل وہ دکان جس سے نکلنے کو ہی نہیں چاہتا۔ وہاں پر بیٹھنے کی بھی جگہ ہے کہ اگر آپ کتاب خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو ہر روز وہاں آکر بیٹھ جائیں اور کتابیں پڑھتے رہیں۔ سڑک کے کنارے بعض لوگ اپنا موسیقی کا شوق پورا کرتے ہیں، بعض طالبِ علم اپنا ساز لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنا دن گزار دیتے ہیں اور اس بہانے کچھ جیب خرچ بھی کما لیتے ہیں۔ ہر شخص اپنے میں مگن ہے کوئی کسی دوسرے کو گھور کر نہیں دیکھتا۔ ہر قومیت اور ہر مذہب کے لوگ یہاں نظر آتے ہیں۔

آج صبح ہم نے جس جگہ ناشتا کیا اس جگہ کو ایک خاتون چلاتی ہیں، اگرچہ پیشے کے لحاظ سے یہ صاحبہ وکیل ہیں مگر کیوں کہ ان کو کھانے سے دلچسپی تھی اس لیے انھوں نے یہ پیشہ اپنالیا۔ ہمارے یہاں اوّل تو ایسی دکانیں ہی کم ہیں جنھیں خواتین چلاتی ہوں اور پھر یہ تو کافی مشکل ہے کہ وکیل ہو کر کوئی یہ کام کرے۔ دکان بہت روشن ہے، باہر کے شیشے کے ساتھ ساتھ فلکسڈ بینچز ہیں جن پر لگے ہوئے رنگا رنگ کشن اس جگہ کو ایک گھر کا سا افیکٹ دیتے ہیں اور آپ زیادہ ریلیکسڈ محسوس کرتے ہیں۔ آج یہاں پائیریٹ ڈے ہے اس لیے جو لوگ پائیریٹ کا لباس پہن کر آئے ہیں اب کا ناشتا مفت ہے۔ خود خاتونِ خانہ بھی اسی لباس میں ہیں اور کھانا پیش کرنے والے بھی اسی لباس میں ہیں۔ ویک اینڈز پر یہاں طالبِ علم کام کرتے ہیں۔ ایک ہنستا مسکراتا لڑکا ہم سے آرڈر لینے آیا، یہ بھی قزاق کے لباس میں ہے اس کی ایک آنکھ ایک چمڑے کی پٹی سے بند ہے۔ کان میں بڑے بڑے بالے ہیں اور ایک گال پر کوئی ٹیٹو بنا ہے۔ آلو چھلکے سمیت بنائے گئے ہیں، نئے آلو ہیں اس لیے زیادہ مزے کے ہیں۔ اس کے علاوہ چیز آملیٹ ہے اور بڑی خوب صورتی

سے اسی پلیٹ میں چند انگور بھی رکھے ہیں اور خربوزے کی ایک قاش ہے۔ مجھے خیال آیا کہ ہمارے یہاں بھی ایک صاحبہ نے 'خیابانِ توحید' پر چاٹ کی ایک دُکان کھولی ہے اور وہ خود اس دُکان پر موجود رہتی ہیں۔ ان کے شوہر ایک وھیل چیئر میں ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ میں ان کو بڑے فخر سے دیکھتی ہوں کہ کراچی کے ان حالات کے باوجود وہ اپنی جگہ کام کر رہی ہیں۔ کراچی کے حالات اس لیے کہا کہ ان کے یہاں بھی دن دہاڑے ہمارے چند نوجوان اپنی کلیش این کوف کے ساتھ آچکے ہیں۔ کیا کریں کہ چند نوجوانوں کا یہی ذریعۂ معاش ہے۔ آخر ان کو بھی اپنے پیٹ پالنے ہیں، عورت کی دکان پر ڈاکا ڈالنا بھی زیادہ آسان لگا ہوگا کہ وہ بہرحال صنفِ نازک ہے اور سب سے اچھی بات یہ کہ اس کا شوہر وھیل چیئر پر ہے۔ مگر آرلنگٹن میں رہنے والی خاتون کو کم از کم ایسا کوئی ڈر نہیں۔ نہ یہاں باہر سیکیورٹی گارڈ کھڑا کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اس بات کا ڈر ہے کہ اگر کچھ ہوا تو پولیس گھنٹوں بعد پہنچے گی۔ مجھے یاد ہے کہ بیس سال پہلے میں منیلا گئی تھی اور میں بڑی حیران تھی کہ یہ کیسی جگہ ہے جہاں ہر دُکان کے سامنے ایک گارڈ کھڑا ہے۔ آج جب دیکھتی ہوں تو کراچی کا یہی حال ہے۔ اور ہم نے اس کیفیت کو قبول بھی کرلیا اور اس پر قابو پانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

عامر کے علاقے میں تمام گھر اسّی یا سو سال پُرانے ہیں، خود عامر کا گھر بے حد پُرانا ہے۔ جب میں ان کی سیڑھیوں میں داخل ہوئی تو نہ جانے کیوں مجھے پشاور کے پُرانے گھر یاد آگئے۔ لکڑی کی سیڑھیاں ہیں جو بل کھاتی ہوئی اوپر کی طرف جاتی ہیں۔ اوپر پہنچ کر ایک چھوٹی سی جگہ ہے جہاں آپ اپنے جوتے اوورکوٹ وغیرہ اتارتے ہیں۔ آپ کا پہلا قدم کچن میں پڑتا ہے اور اچانک منظر بدل جاتا ہے کیوں کہ کچن نہایت ماڈرن ہے۔ تمام جدید مشینوں سے آراستہ، چاندی سا چمکتا کچن۔ جس میں فریج بھی سلور ہے، اسٹوو بھی سلور ہے، ڈش واشر بھی سلور ہے۔ کچن کا تمام ٹوپ بھی سلور ہے اور گاربیج کے ڈبے بھی سلور ہیں۔ اس کے فوراً بعد ڈائننگ ٹیبل اور چیئرز ہیں جو عامر کی بیگم ویرا کا شوق ہے کہ ان کو نئی چیزوں سے زیادہ پُرانی طرز کی چیزیں پسند ہیں۔ تھوڑا سا اور آگے بیٹھنے کا

کمرہ ہے جہاں ہر گھر کی طرح ایک عدد ٹی وی ہے اور سامنے کی کھڑکی میں ایک بلی سجی ہے جو سچ مچ کی ہے۔ اس کا نام تاشا ہے اور اس گھر میں وہ سب کو اس گھر کی دونوں بیٹیوں کی طرح پیاری ہے کہ یہ ان بیٹیوں سے بھی پُرانی ہے۔ ایک سیڑھیوں کا اور سیٹ ہے جو بیڈ رومز تک لے جاتا ہے۔ ہمارا بیڈ روم نیچے کی منزل پر ہے یعنی بیٹھنے والے کمرے کے ساتھ۔ اسی منزل پر ایک بالکونی ہے جو میری اور شعیب کی پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں سے ہم اِکادُکا جاتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھ سکتے ہیں اور سامنے کے گھروں کے لہلہاتے لان بھی نظر آتے ہیں۔ ہماری اس بالکونی کے بالکل سامنے ایک گھر ہے جہاں مالک مکان اوپر رہتی ہیں اور نیچے کرائے دار رہتے ہیں۔ اوپر کے حصّے میں جو خاتون ہیں وہ اتنی بوڑھی ہیں کہ اکثر پولیس اس گھر میں صرف یہ دیکھنے آتی ہے کہ خاتون کو کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا کہ انھوں نے پچھلے چند دنوں سے دروازہ نہیں کھولا۔ کیوں کہ وہ زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتیں اس لیے یہ قطعاً نہیں معلوم کہ ان کا بقیہ خاندان کہاں ہے۔ کبھی کبھی وہ نظر آتی ہیں جب وہ نیچے رہنے والوں کو ہدایت کرتی ہیں کہ وہ باغ کو کس طرح بہتر بنائیں۔ یہاں کی زندگی اس لحاظ سے بہت مختلف ہے کہ بوڑھا ہوکر انسان ایک بے کار شے بن کر رہ جاتا ہے۔ تمام بوڑھوں کی آنکھیں تنہائی کی شکایت کرتی نظر آتی ہیں، اگرچہ انتظامات بہت اچھے ہیں مثلاً بسوں میں بوڑھوں کے لیے خاص نشستیں ہیں۔ اگر کوئی بوڑھا بس سے اترنے لگے تو پائیدان کو نیچے کردیا جاتا ہے کہ کہیں بوڑھا شخص گر نہ جائے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ان سب میں جذبات کا کوئی دخل نہیں۔ بس ایک مشینی زندگی ہے، جسمانی لحاظ سے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں یہ بھی بڑی بات ہے۔ ہمارے یہاں تو بے حسی کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی بوڑھا اتر رہا ہو تو اس کے لیے بس کو پوری طرح روکتے بھی نہیں۔

عامر چاہتا ہے کہ ہم ہر روز گھر سے باہر جاکر شہر کی سیر کریں اور ہر چھ مہینے بعد کسی نئے ملک کی سیر کریں۔ میرا یہ کہنا کہ اب ہم بہت زیادہ گھومیں تو تھک جاتے ہیں۔ عامر اس کا یقین نہیں کرتا۔ میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ جیسے جیسے انسان بوڑھا ہوتا جاتا ہے، وہ موت کے نزدیک ہوتا چلا جاتا ہے۔ انسان ایک دن اچانک نہیں مرتا بلکہ زندگی کا ہر دن

اسے موت کے قریب لے جاتا ہے اس طرح کہ جسم کا کوئی حصّہ کوئی حس ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ سماعت، بصارت اور جسم کے بقیہ حصّے جواب دیتے چلے جاتے ہیں۔ نہ دل میں وہ ولولہ رہتا ہے نہ جسم میں وہ ہمت رہتی ہے۔ نہ وہ خواہشیں رہتی ہیں نہ ان خواہشوں پر دم نکلتا ہے اور نہ خواہشوں کے حصول پر اتنی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔

آج صبح سے ہم بالکونی میں بیٹھے ہیں، آج کافی بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ارادہ تو ہے کہ آج ہم فریڈم ٹریل پر چلیں گے۔ آج صبح سے سامنے والی بوڑھی خاتون نظر نہیں آئیں ورنہ وقتاً فوقتاً وہ اپنے بہت سے سفید بالوں کے ساتھ نیچے جھانکتی ہیں۔ ویرا اپنی بیٹی رویام کے بارے میں بات کرتی ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ وہ چوائس جو مجھے نہیں دی گئی وہ میری بیٹی کو ملے۔ تاکہ وہ زندگی میں وہ کرے جو اس کا جی چاہتا ہے۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی ٹیلنٹ ہوتا ہے، ضروری ہے کہ اس ٹیلنٹ کو تلاش کیا جائے اور پھر اس کے تحت زندگی کو گزارا جائے۔

مجھے یاد آیا کہ جب ہم چھوٹے تھے تو صرف دو ہی پیشے تھے جن کو اپنایا جاسکتا تھا، یا آپ ڈاکٹر بن جایئے یا انجینئر۔ شاید غریب لوگوں کی یہی کہانی ہوتی ہے، صرف یہی دو پیشے تھے جن میں نوکریاں ملتی تھیں اس لیے یہ ہی قابلِ عزت تھیں اور یہی بننے کی تلقین کی جاتی تھی۔ آرٹ اور موسیقی تو اس معاشرے میں فروغ پاتے ہیں جہاں غمِ دوراں سے فراغت ہو۔ کتنا اچھا ہو کہ ہر شخص وہ کام کرسکے جس کا اس کو شوق ہو اور جو ٹیلنٹ اس میں موجود ہو۔ اگر بچپن میں کوئی مجھ سے پوچھتا کہ تم کیا بننا چاہتی ہو تو میرا جواب ہوتا کہ میں ایکٹریس بننا چاہتی ہوں یا گانا سیکھنا چاہتی ہوں مگر مجھے معلوم تھا کہ اگر یہ کہا تو نہ جانے کتنی ڈانٹ پڑے گی اس لیے ہمیشہ یہی خواہش ظاہر کی جیسے میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ اور گھر والے سمجھتے تھے کہ واہ ہماری کیا بات ہے ہماری تقریر کی کیا خوبی ہے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہی اس کے دل میں ہے۔ کتنا اچھا ہے کہ عام لوگ دل کا حال نہیں جانتے۔ مگر کیوں کہ یہ آواز دل سے نہیں نکلتی تھی اس لیے ڈاکٹر نہیں بن سکی۔

◇

آج شام عامر کا ایک دوست ملنے آرہا ہے جو فرانس کا رہنے والا ہے۔ آج شام ہم ڈیک پر باربی کیو کریں گے اور پوری شام وہیں گزاریں گے۔ میں منتظر ہوں کہ میری ملاقات جیروم سے ہو اور میں ایک ایسے شخص سے بات کروں جس کا تعلق ایک امیر ملک سے ہے، جسے غمِ روزکار کی ضرورت یہاں کھینچ کر نہیں لائی پھر آخر وہ کیوں یہاں کا باشندہ بن گیا۔ شام کے سات بج چکے ہیں ہم چھ بجے سے جیروم کے منتظر ہیں، عامر کا کہنا ہے کہ وہ فرنچ وقت کے حساب سے آرہا ہے میں یہ سن کر خوش ہوئی کہ ہمارے علاوہ کوئی اور بھی ہے جو وقت کی پابندی نہیں کرتا۔ گرل سے دھواں اٹھنا شروع ہوچکا ہے، ہر طرف ماحول کی خوش بو پھیلنی شروع ہوچکی ہے۔ رویام اور پیر یہاں کی ایک اور دوست ان کے ساتھ چھوٹے سے سوئمنگ پول میں گھسی ہوئی ہے۔ اس بچی کی ماں عینی فن لینڈ کی رہنے والی ہے اور باپ ہیٹی کا رہنے والا ہے۔ لگتا ہے بچی بالکل اپنے باپ کی طرح ہے۔ خاص طور پر رنگ جو کافی سیاہی مائل ہے اور بال بالکل سیاہ اور خوب گھنگھر والے ہیں۔ یہ بچی ہماری دونوں بچیوں سے کہیں زیادہ صحت مند اور مضبوط ہے۔ ساتھ کے گھر سے چند لوگوں کی آواز آرہی ہے۔ میں اپنا قلم اور رائٹنگ پیڈ لانے کے لیے اوپر جاتی ہوں۔ کمروں میں کالی اندھیرا چھا چکا ہے۔ جب میں واپس آئی تو وہ آچکا تھا۔ میں نے سنا تو تھا کہ فرانسیسی لوگ خوب صورت ہوتے ہیں مگر اتنے خوب صورت ہوتے ہیں یہ میں نے آج ہی دیکھا۔ چہرے پر ایک بے حد مناسب ناک، موتی کی طرح جڑے ہوئے دانت، ہنستی ہوئی آنکھیں اور اس پر ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ۔ بہت مناسب قد نہ بے حد لمبا نہ چھوٹا، گردن تک لمبے بال جن میں شام کی سیاہی بھی تھی اور صبح کا جھٹپٹا بھی۔ اگر کوئی مرد بہت خوب صورت ہو تو اس میں تھوڑا سا نسوانیت کا عنصر آجاتا ہے مگر اس میں اتنی مردانہ وجاہت تھی کہ میں قطعاً یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ عورتوں کی طرح خوب صورت تھا۔ انداز اتنا بے تکلفانہ تھا جیسے نہ جانے کب سے ہمیں جانتا ہو۔ میں جو لوگوں سے بہت جلدی بے تکلف نہیں ہوتی مجھے اس سے بات کرنا بالکل مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے زندگی میں کوئی غم نہیں ہے۔ پوری شام اس نے جو بھی بات کی اس میں کہیں منفیت کا دخل نہیں

تھا۔ ہر بات کا جواب شیور اور وہائے نوٹ تھا۔ وہ آرام سے اپنا سٹیک اور کورن کھاتا رہا اور اپنے فارم کی بات کرتا رہا۔ اس نے کہا، آخرکار میری بیوی کا امریکن خواب پورا ہوگیا۔ سنا ہے کہ امریکن لوگوں کے لیے آئیڈیل زندگی یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس ایک فارم ہو اور چند جانور ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بات کا فیصلہ ایک سال بعد ہوگا کہ فارم پر رہنا واقعی پریکٹیکل ہے یا نہیں۔ جب ٹریسی کام کرکر کے تھک جائے گی تو ہوسکتا ہے خواب اتنا سہانا نہ رہے۔ پھر اس نے اچانک مجھ سے پوچھا، ''سنا ہے آپ کوئی کتاب لکھ رہی ہیں؟ یہ کتاب کس بارے میں ہے؟'' میں نے کہا، ''میں یہ کتاب امیگرینٹس کے بارے میں لکھ رہی ہوں۔ میں نے جب یہ کتاب شروع کی تو ایک فلسفے کے تحت کی تھی کہ جیسے کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی محور کے گرد گھوم رہی ہے، کیا انسان بھی اسی طرح ہے؟ کیا انسانی زندگی کا بھی کوئی محور ہے؟ ہم جو دنیا میں ایک ملک سے دوسرے ملک گھومتے ہیں کیا ہم کسی تلاش میں ہیں اور کیا آج کے دور میں وہ تلاش پوری ہوجاتی ہے، جب ہم کسی امریکا جیسے ملک میں پہنچ جاتے ہیں۔'' اس نے ہنس کے مجھے ایسے دیکھا جیسے میری دماغی حالت پر اس کو کچھ شک ہو۔ ''ویری انٹریسٹنگ۔'' پھر بولا، ''جہاں تک میرا تعلق ہے، میری کہانی تو بڑی سیدھی سادی ہے۔ میں فرانس کے ایک گاؤں بوردو میں رہتا تھا، میرے والد ایئرفورس میں تھے، وہ جہاز میں گولا بارود بھرا کرتے تھے۔ بنیادی تعلیم کے بعد میں پیرس چلا گیا جہاں میں ایک ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ وہاں پر ایک مرتبہ تین امریکن آکر ٹھہرے، ان میں سے ایک ماڈل تھی ایک اس کا بوائے فرینڈ تھا اور ایک پروڈیوسر تھا۔ ان سب سے میری دوستی ہوگئی۔ خاص طور پر پروڈیوسر سے میری بہت دوستی ہوگئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ان کے پاس پیسوں کی کچھ کمی ہوگئی۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا وہ میرے پاس رہنے لگے۔ کچھ عرصہ وہ میرے پاس رہے اور پھر انھوں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا اور فلوریڈا پہنچ گیا۔ مجھے ہمیشہ سے فوٹوگرافی کا شوق تھا۔ میں نے ایک دو کورس کیے اور پھر سوچا کہ کینیڈا جا کر فلم میکنگ کے کورس کروں۔ نیویارک پہنچا تو مجھے ٹریسی مل گئی، ہم نے شادی کرلی اور پھر اس کے بعد میں یہیں رہنے لگا۔ بس اتنی سی

کہانی ہے۔'' شعیب نے کہا، ''تو مہاجر تین طرح کے ہوتے ہیں۔ تم لو ریفیو جی یعنی پیار کے مہاجر ہو، کچھ مہاجر معاشی مہاجر ہوتے ہیں اور کچھ سیاسی مہاجر۔'' اس نے اپنے love refugee ہونے کا بڑا لطف لیا۔ اس نے کہا، ''خیر، مجھے اب یہاں بیس سال ہوچکے ہیں۔ ہاں میں اس مجبوری کے تحت نہیں آیا کہ مجھے نوکری نہیں مل رہی تھی یا میرے ملک میں تحفظ کا کوئی مسئلہ تھا۔''

اسی اثنا میں عینی آگئی، وہ اپنی بیٹی کو لینے آئی تھی۔ عینی یو این میں کام کرتی ہے۔ اس نے ایک امریکن سے شادی کی اور اب پندرہ سال بعد اس سے طلاق لے رہی ہے۔ سنا ہے فن لینڈ دنیا کا صاف ترین شہر ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی جگہ جگہ پوسٹنگ ہوتی ہے لیکن وہ سب سے زیادہ اپنے ملک میں ہوملی (homely) محسوس کرتی ہے۔ میں نے عامر سے پوچھا، ''تم کہاں اپنا گھر سمجھتے ہو امریکا یا فرانس؟''

''میں یہاں کافی آرام سے ہوں۔ میں فرانسیسی اس لیے ہوں کہ میں وہاں پیدا ہوا تھا، میری تمام فیملی وہاں ہے۔ میں سمجھتا ہوں میں ایک اکائی ہوں اور مجھے کوئی فرق نہیں میں جہاں بھی رہوں، مجھے ایک جیسا لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو کسی ایک ملک کا باشندہ نہیں بلکہ پوری دنیا کا کا باشندہ سمجھتا ہوں۔ خدا کی زمین ہے، سب ایک جیسی ہے۔ اگر میں یہاں سے کہیں اور بھی چلا جاؤں تو وہاں بھی ایڈجسٹ ہوجاؤں گا۔ ہاں ہوسکتا ہے اگر کسی اور سیارے پر پہنچ جاؤں تو شاید اس زمین کی یاد آئے۔ کیا دنیا واقعی اتنی گلوبل ہوچکی ہے؟''

''مجھے ایسا لگا جیسے ہر شخص کائنات میں گھومتا ہوا ایک ایسا سیارہ ہے جو اپنے مرکز سے الگ ہوچکا ہے۔ ایسا ہونا اچھا ہے یا برا، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن جب میں یہاں رہ کر اپنے ملک کے خواب دیکھتی ہوں، تو ایسا لگتا ہے جیسے ملک کی محبت کوئی چیز ہے۔ مگر پھر بھی تمھاری پہچان کیا ہے تمھارے خیال میں لوگ تمھیں کیا سمجھتے ہیں امریکن یا...؟''

''بالکل بالکل میں کچھ بھی کرلوں میری پہچان فرانسیسی ہی رہے گی۔''

''کیا تمھیں یہ پسند ہے کہ لوگ تمھیں فرانسیسی کی حیثیت سے پہچانیں؟''

''یقیناً ـــ مجھے فخر ہے کہ میں فرنچ ہوں۔'' وہ عامر سے مخاطب ہوا، ''عامر تم کیا

کہتے ہو اب جب کہ تمھیں پاسپورٹ مل چکا ہے تو تم...''

''میرا خیال ہے میں امریکن ہوں اور یہاں رہنا چاہتا ہوں۔'' عینی نے بھی اب اس بحث میں حصہ لیا۔ ''اگر تمھیں یہ چانس دیا جائے کہ تم کہاں رہنا چاہتے ہو؟...'' میں نے پھر ان کی بات کاٹی اور کہا، ''اس خوب صورت آرام دہ شام میں اس ڈیک پر بھرے پیٹ کے ساتھ یہ باتیں کرنا بہت آسان ہے لیکن جیروم کیا تم نے وہ فلم دیکھی ہے Sophie's choice جب اس عورت کو سرحد کے پار صرف ایک بچے کو لے جانے کی اجازت ہوتی ہے اور اگرچہ وہ اپنی بیٹی سے پیار کرتی ہے مگر بیٹے کو لے کر سرحد پار کرلیتی ہے؟''

''ہاں بالکل دیکھی ہے، بڑی خوب صورت مووی تھی۔ ایک ایسی مووی جسے آپ بہت مرتبہ اصل زندگی کے اسکرین پر چلتا دیکھتے ہیں۔ مگر ایسا وقت زندگی میں بہت کم آتا ہے کہ آپ کو ایسی چوائس کرنی پڑے۔''

جیروم کہتا ہے، ''عامر اگر کوئی تمھارے سر پر گن رکھے اور پوچھے کہ تم کس کے ساتھ ہو تو؟...'' عامر ہنس کر کہتا ہے، ''اس بات پر منحصر ہے کہ گن کس نے رکھی ہے!'' سب لوگ اس بات پر خوب ہنستے ہیں۔ ''مگر ہاں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر امریکا اور پاکستان کا کرکٹ کا میچ ہو تو میں پاکستان کے ساتھ ہوں گا۔'' میرے خیال میں فیصلہ ہوچکا تھا۔

لیکن یہ سب لوگ وہ طارق بن زیاد تھے جو اپنی کشتیاں جلا چکے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ یہ کوئی جگہ فتح کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ خود اس جگہ میں مدغم ہونا چاہتے ہیں۔ آج نہیں تو دو نسلوں کے بعد شاید یہ جگہ ان کی پہچان بن جائے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ سب آج بھی اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے شعیب سے پوچھا تھا، آپ کے خیال میں محبت کیا ہے؟ اور مجھے جواب ملا تھا کہ محبت یہ ہے کہ جس سے آپ پیار کرتے ہیں آپ اس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اس سے بات کرنا چاہتے ہیں، اس کی مشکلات کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ ان لوگوں کی کیسی محبت تھی کہ یہ اپنے ملک میں رہنا نہیں چاہتے، وہ جس مشکلات سے گزرے اس میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔ مگر شاید ملک کی محبت ماں کی طرح ہے کہ چاہے آپ ماں کے ساتھ نہ بھی رہیں مگر اس کی محبت ہمیشہ

آپ کے دل میں رہتی ہے۔ آپ اس سے دور ہوجاتے ہیں کہ وہ آپ کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی۔ آپ ایک نئی دنیا بساتے ہیں، آپ اس دنیا میں بھی خوش ہوتے ہیں مگر آپ جانتے رہنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا کررہی ہے۔ آپ اس کے دکھ پر روتے بھی ہیں مگر اپنی زندگی میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ اس کے پاس جاکر رہ نہیں سکتے۔ میں نے سوچا اتنا بھی کافی ہے۔ کم ازکم یہ لوگ اس جگہ کو اپنا تو مانتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ زندگی ہے کیا؟ جیسے کولمبین لورا نے کہا تھا، ''زندگی میں کیا چاہیے ایک آرام دہ گھر جس میں واشنگ مشین ہو، ڈش واشر ہو، بجلی پانی ہو اور آپ محفوظ ہوں۔'' کیا واقعی زندگی میں صرف یہی سب کچھ چاہیے؟ مگر یہ اس ملک کی عورت کا جواب تھا جس کے پاس اپنے ملک میں یہ سب کچھ نہیں تھا۔ مگر جیروم کے پاس تو یہ سب کچھ تھا، پھر کیا یہ اس کے اندر کا کولمبس تھا جو ایک ایڈونچر کی خاطر نکلا تھا؟ کیا اس کی تلاش پوری ہوچکی ہے؟

میں ابھی تک جیروم کی باتوں کو پوری طرح سمجھ نہیں پائی تھی۔ میں نے اس سے ایک اور سوال کیا، ''کیا زندگی کے لیے ضروری ہے کہ آپ کی کہیں نہ کہیں جڑیں ہوں؟''

''بالکل— بہت ضروری ہے کہ آپ میں کہیں سے تعلق، کسی جگہ سے belonging کا احساس ہو اور میں اگر اپنے بارے میں یہ احساس ڈھونڈتا ہوں تو یہ احساس فرانس کا ہے۔ میں کہیں بھی چلا جاؤں میری جڑیں فرانس میں ہیں، میں بنیادی طور پر فرانسیسی ہوں۔ میں نے زندگی کے تیئس سال فرانس میں گزارے ہیں۔''

عامر ایک بار پھر گفتگو میں شامل ہوگیا، ''میں نے جب پاکستان چھوڑا تو میں سترہ سال کا تھا۔ میں نے پانچ سال ترکی میں گزارے اور اب سترہ سال سے یہاں ہوں یعنی میں جتنے سال پاکستان میں رہا اتنا ہی امریکا میں رہا۔ یقیناً میری زبان، میرا کلچر، میرا لٹریچر ہمیشہ میرا رہے گا، آج بھی میں جس طرح اپنی شاعری غالبؔ، اقبالؔ، اور فیضؔ کو جس طرح پسند کرتا ہوں اس طرح کسی اور شاعری سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا مگر میں زندگی یہیں گزارنا چاہتا ہوں، یہ سب کچھ مجھ میں بہت بعد میں ڈیویلپ ہوا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو کافی عرصے بعد دریافت کیا کہ میں خود کیا چاہتا ہوں، میرے

اپنے کیا خواب ہیں، کیا آئیڈیلز ہیں— I dont know، پتا نہیں۔ میرے خیال میں آپ وہاں کے ہوتے ہیں جہاں کے خیالات کو آپ پسند کرتے ہوں، جہاں کا رہنا سہنا آپ کو پسند ہو۔ آپ کے کچھ آئیڈیلز ہوتے ہیں اور پھر آپ روزمرہ کی زندگی کو دیکھتے ہیں ملک کے کونسٹی ٹیوشن کو دیکھتے ہیں۔ یہاں ہر شخص کے کچھ حقوق ہوتے، ہیں کوئی بے وجہ آپ کو سڑک سے اٹھا کر نہیں لے جاسکتا۔ یہاں اگر پولیس آپ کو روکتی ہے تو اس کے پاس کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ اور پھر دوسری طرف پولیس کے بھی کچھ حقوق ہیں، پولیس والے کی بھی کوئی عزت ہے، یہ نہیں کہ اگر آپ بڑے آدمی ہیں تو پولیس والا آپ سے ڈرتا ہے۔ پاکستان کے ایئرپورٹس پر وی آئی پی لاؤنج ہیں، کیا آپ نے یہاں ایسی کوئی چیز دیکھی ہے؟ ہر شخص ایک ہی قطار میں کھڑا ہوتا ہے۔ بس یہی باتیں ہیں جو مجھے پسند ہیں، آرام دہ لائف اسٹائل کے علاوہ یہ چیزیں بھی ہیں جو آپ کو ذہنی طور پر مطمئن رکھتی ہیں اور آپ فرسٹریشن کا شکار نہیں ہوتے۔''

اب شعیب کی باری تھی۔ ''جیروم یہ بتاؤ کہ تمھارا مذہب کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''مذہب؟... میرے خیال میں مذہب صرف chaos پھیلاتا ہے، ہر جگہ تاریخ میں مذہب فساد کی جڑ ہے اور لوگ مذہب کے نام پر لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔''

عینی کہنے لگی، ''مجھے نہیں معلوم کہ میں مذہب پر یقین رکھتی ہوں یا نہیں مگر میں خدا میں یقین ضرور رکھتی ہوں، خدا تو ضرور ہے ورنہ اتنی بڑی کائنات وجود میں کیسے آتی!''

جیروم نے ہنس کر کہا، ''اس chaos کو بنانے کے لیے کسی باقاعدہ خدا کی ضرورت ہے؟'' اور مجھے جونؔ ایلیا کا وہ شعر یاد آ گیا:

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

عینی نے جیروم کے جملے کو نظر انداز کیا اور کہا، ''مگر میں آدمی کے بنائے ہوئے عبادت کے طریقوں پر یقین نہیں رکھتی۔ یہ سب محض روایات ہیں۔ آپ کس طرح اپنے خدا کو یاد کرتے ہیں، یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہونا چاہیے۔ عینی کا تعلق اس ملک سے جس نے

روس جیسی طاقت کا ڈیڑھ سال تک مقابلہ کیا مگر اس کو اپنے ملک پر قبضہ نہیں کرنے دیا۔ عینی بھی پڑھنے کے لیے امریکا آئی تھی اور پھر یہیں نوکری کر لی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے اس وقت تک امریکی قومیت نہیں لی جب تک یہ قانون نہیں پاس ہوا کہ وہ امریکن ہونے کے ساتھ فن لینڈ کی شہریت بھی رکھ سکتی ہے۔ میں کچھ بھی ہونے سے پہلے فنش ہوں۔ اب قانون یہ ہے کہ آپ وہ قومیت رکھ سکتے ہیں جہاں آپ پیدا ہوئے ہیں لیکن اگر آپ چاہیں کہ امریکن بننے کے بعد آپ فرنچ بن جائیں تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

جیروم نے پوچھا، ''عامر، جب حلف اٹھاتے ہیں تو کہتے ہیں God we trust کیا تم نے یہ کہا تھا؟''

عامر نے کہا، ''نہیں— کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اگر آپ چاہیں تو خدا کے لفظ کو حذف کر سکتے ہیں۔ میں نے حلف میں خدا کا نام حذف کر دیا تھا۔''

بے چارہ خدا!— انسان نے بھی اس کو کس کس طرح استعمال کیا ہے۔

عینی کی کہانی پھر بیچ میں رہ گئی۔ عینی نے پڑھائی کے بعد کافی عرصہ یو این او میں کام کیا جہاں وہ ترجمان کے طور پر کام کرتی تھی۔ یہیں اس کی ملاقات ہیٹی کے ایک نوجوان سے ہوئی اور انھوں نے شادی کر لی۔ امریکن بننے کے بعد اس نے فارن سروس میں کام کیا۔ وہ بہت سے ملکوں میں رہی، اب آخری مرتبہ اس کی پوسٹنگ اسٹونیا میں ہوئی۔ وہیں پر اس کے اور اس کے شوہر کے کچھ اختلافات ہوئے اور اب وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے شوہر سے طلاق لی ہے مگر اب بھی وہ اپنے سسرال والوں سے ملتی ہے۔ آج کل وہ اس لیے امریکا میں ہے کہ سال میں ایک مہینہ اسے اس ملک میں گزارنا ہے جس کے لیے وہ کام کرتی ہے۔ کیوں کہ یہ فارن سروس میں ہونے والوں کے لیے ضروری ہے کہ بیس دن کی چھٹی اس ملک میں گزارنی ہے اور ظاہر ہے وہ ملک امریکا ہے۔ کہنے لگی، ''ہم نے یہاں پر گھر بیچ دیا ہے اب مجھے اس ملک سے کوئی لگاؤ نہیں، نہ یہاں میرا گھر ہے اور نہ کوئی ایسا شخص ہے جس سے مجھے کوئی لگاؤ ہو۔ میرے خیال میں جب کوئی شخص مستقل رہنے کے لیے کوئی دوسرا

ملک چنتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اسے نوکری آسانی سے ملے گی اور اس کی زندگی زیادہ آرام دہ ہوگی۔ بقیہ تمام باتیں بے کار ہیں۔ پریکٹیکل بات یہی ہے کہ کسی بھی ایسے ملک کا انتخاب کرلیا جائے باقی سب محض ذہنی رومینس ہے اور میں نہ کوئی شاعر ہوں نہ فلسفی کہ اتنی باتیں سوچوں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں ایک شخص کے ساتھ پندرہ سال رہی مگر اب رہنا نہیں چاہتی۔ اس میں نہ غم کی بات ہے نہ اسے بے وفائی کہا جاسکتا ہے۔ زندگی وہ ہونی چاہیے جس میں آپ آرام سے ہوں۔''

سوچا جائے تو انسان ملک بدلتا ہے، شہریت بدلتا ہے، زبان اور کھانے کے طریقے تک بدل لیتا ہے مگر مذہب اتنی آسانی سے نہیں بدلتا۔ اس کا مطلب ہوا مذہب وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کی جڑیں سب سے گہری ہوتی ہیں۔ عینی کی باتوں نے اس شام کو اداس کردیا تھا۔ اگرچہ اس نے طلاق کا ذکر اس طرح کیا تھا جیسے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں لیکن پھر بھی جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے ایک درد کا سایہ تھا جو شام کے سائے کے ساتھ ساتھ ہر طرف پھیل گیا۔ ایک ایسی اداسی جو سب میں سرایت کرگئی۔ جدائی بھی کیسی عجب شے ہے کہ چاہے اپنی مرضی سے ہو یا کسی مجبوری سے دل میں ایک شگاف سا ڈال دیتی ہے مگر زندگی ہے کہ ہر صورت گزرتی چلی جاتی ہے نہ کوئی کسی کے لیے مرتا ہے نہ زندگی کا کوئی کام رکتا ہے مگر پھر بھی ہر جدائی دل میں ایک خلا سا چھوڑ جاتی ہے جو کبھی نہیں بھرتا۔

ایک طرف کل شام کی اداسی تھی دوسری طرف بوسٹن کی رونق تھی۔ اگلی صبح ہم بوسٹن کے شاپنگ ایریا میں تھے جہاں آپ کو طرح طرح کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سڑک پر لوگ ہاتھوں میں برگر کھاتے چلے جارہے ہیں۔ ڈرنکس آدھی پی کر بقیہ کوڑے میں انڈیل دیتے ہیں۔ دُکانوں پر اتنی بھیڑ ہوتی ہے اور اتنے لمبے کیو ہوتے ہیں کہ لگتا ہے سب کچھ مفت بٹ رہا ہے۔ دوسری طرف ایسے بھی مناظر دیکھے جہاں لوگ کوڑے سے لوگوں کی بچی بچائی مشروب ڈھونڈتے تھے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دنیا کی ہر زبان سننے کو مل رہی تھی۔ ہم نے ایک چینی دُکان پر کھانا کھایا۔ یہ ریسٹورنٹ چینیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور عامر کا کہنا تھا یہی اس جگہ کے اچھے ہونے کی دلیل تھی۔ اب سے سو سال پہلے یہی لوگ

تھے جن کے یہاں عورتوں کے پاؤں بچپن ہی میں باندھ دیے جاتے تھے۔ اسی قوم کی یہ نسل ہے کہ اس کی لڑکیاں دوڑ دوڑ کر کام کر رہی تھیں۔ نشے سے ہوش میں آئے تو اتنے باہوش ہوگئے کہ ہر جگہ ان کا کھانا، ان کی مشینیں اور ان کے بنے ہوئے ملبوسات نظر آتے ہیں۔ ایک بڑے سے کھلے میدان میں چند کالے لوگوں نے میلے کا سا سماں لگایا ہوا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں انھوں نے ایک بڑی سی بالٹی ڈالرز سے بھرلی۔ اس کے لیے انھوں نے گایا بھی اور ناچا بھی، قلابازیاں بھی لگائیں اور حیرت زدہ کردینے والی جمناسٹک بھی دکھائی۔

◇

جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ایک کیش رجسٹر پر کھڑی حساب کتاب کررہی تھی، کالی قمیص پر سفید ایپرن پہنے وہ بے حد مصروف نظر آرہی تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے ہیلو کیا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ میں اس سے ملنے آنے والی ہوں۔ اس نے سر پر ایک گلابی اور آتشی رنگ کا اسکارف پہنا تھا جسے اس نے گردن کے پیچھے باندھ رکھا تھا۔ یہی ایک چیز تھی جو اسے باقی اسٹاف سے منفرد کرتی تھی۔ اس کی عمر پینتالیس سال رہی ہوگی جب کہ باقی لڑکیاں بیس سال سے اوپر نہیں تھیں۔ اس کا نام ہابے تھا، اس کا تعلق لبنان سے تھا، بے حد صاف رنگ اور شیشے کی طرح چمکتی نیلی آنکھیں مگر ان آنکھوں میں کوئی گہرائی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی شکن نہ تھی۔ نہ کام کی تھکن تھی اور نہ وقت نے اس کے چہرے پر کوئی نشان چھوڑے تھے۔ میں نے صرف چینیوں کے چہرے ہی ایسے دیکھے ہیں جو تاثرات سے عاری ہوتے ہیں مگر آج میرے سامنے ایک لبنانی کا چہرہ تھا جو سب جذبات سے عاری لگتا تھا۔ وہ دُکان کے پچھلے حصّے میں کسی کام کے لیے گئی تو میں نے دیکھا کہ اس کی اسکرٹ کا رنگ دُکان کے فرش کے رنگ کا تھا۔ کچھ عنابی سا رنگ۔ اس دکان (اسے کافی شاپ بھی کہہ سکتے ہیں اور بیکری بھی) کا فرش اور کاؤنٹر عنابی تھے اور دیواریں کریم رنگ کی تھیں۔ سامنے کاؤنٹر کے شیشے میں رنگ برنگی پُرکشش پیسٹریاں، کیک اور سینڈوچ تھے۔ ہر طرف مشینوں کا ایک شور تھا جو پچھلے کمرے میں چل

رہی تھیں۔ ایل شیپ میں ایک کاؤنٹر چلتا تھا جس پر ایک طرف کافی، چائے چاکلیٹ اور دودھ کے بڑے بڑے ڈسپینسر تھے۔ اس کے ساتھ چمچے اور چینی تھی اور پھر دس اسٹول تھے۔ لوگ اپنی پسند کی پیسٹری یا سینڈوچ نکلوا کر ایک پیپر گلاس لے کر اپنی مطلوبہ کافی لیتے اور کاؤنٹر کے ساتھ اسٹول پر بیٹھ جاتے۔ یہ دُکان بوسٹن کی ایک بڑی شاہراہ پر واقع ہے۔ ہر تھوڑی دیر پر کوئی نہ کوئی اندر داخل ہوتا ہے بعض لوگ وہیں بیٹھ جاتے ہیں اور بعض لوگ کافی لے کر باہر چلے جاتے ہیں۔ باہر سے دُکان کو دیکھیں تو کچھ جانور بنے نظر آتے ہیں اور غبارے بھی جانوروں کی شکل میں ہر آنے جانے والے کو اور بچوں کو خصوصاً اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس جگہ کا ماحول بڑا بے تکلفانہ ہے۔ لگتا ہے جتنے لوگ آتے ہیں انھیں یہاں کی لڑکیاں کافی عرصے سے جانتی ہیں۔ باقی لڑکیاں بھی مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ میں ہاربے سے بات چیت کرنے آئی ہوں۔ اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں، مجھے ہاربے نے یہی وقت دیا تھا کیوں کہ اس وقت لنچ آر میں وہ فارغ ہوتی ہے۔ ابھی ہاربے کو دیر ہے اس نے رقم گننی شروع کی اور مجھ سے کافی کے لیے پوچھا۔ میں نے دُکان کا مزید جائزہ لیا، ایک طرف دیوار پر ایک بورڈ لگا ہے جس پر آج کی قیمتیں لگی ہیں۔ میں خاموشی سے ان کام کرنے والی لڑکیوں کو دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ کیا میں بھی اتنی ہی تیزی سے کام کرتی تھی، جب میں ان کی عمر کی تھی۔ اتنے میں ہاربے میرے پاس آتی ہے۔ میرے کاؤنٹر کو دیکھ کر کہتی ہے ''او ہو، یہ کاؤنٹر کتنا گندہ ہے۔'' وہ سینئر ہونے کے باوجود کسی لڑکی کو آواز نہیں دیتی کہ یہ جگہ صاف کرو۔ وہ تیزی سے اٹھتی ہے اور ایک کچن پیپر سے جگہ صاف کرتی ہے، مجھ سے ایک بار پھر کافی کے لیے پوچھتی ہے اور پھر کہتی ہے، ''تمھارا بیٹا اور بہو بہت عرصے سے میرے پاس آ رہے ہیں مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ پاکستانی ہیں، مجھے وہ اسپینش لگتے تھے یا پھر ایرانی۔ اور تم بھی مجھے ایرانی یا عرب لگتی ہو۔ مجھے تمھارے بیٹے نے بتایا کہ تم مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہو۔ میری کہانی تو بہت سادہ ہے۔ میں انیس سو تراسی میں یہاں آئی تھی، میرے ملک کے حالات اور میری ضرورت مجھے یہاں لے آئی۔ تمھیں معلوم ہے اس زمانے میں وہاں سول

وار ہو رہی تھی۔ میں جب یہاں آئی تو میں یہاں کی زبان بالکل نہیں جانتی تھی۔ مگر ضرورت اتنی زیادہ تھی کہ تم اس بات سے اندازہ لگاؤ کہ میں جمعرات کو یہاں پہنچی اور ہفتے کو میں کام کر رہی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ جیٹ لیگ کیا چیز ہوتی ہے۔ میں صرف ہائی اسکول پاس تھی اور پھر زبان بھی نہیں جانتی تھی اس لیے پندرہ سال تک میں نے کلیننگ وومن کا کام کیا۔ میرے شوہر کے پاس بھی بالکل پیسے نہیں تھے۔ میرا شوہر چند مہینے کا تھا جب وہ یتیم ہو گیا۔ تمھیں تو معلوم ہوگا کہ لبنان میں ایسے بہت بچے ہیں جو یتیمی کی زندگی گزارتے ہیں۔ خیر، میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی جس کا میرے پاس کوئی حل نہیں۔ میرے شوہر کو یہاں سیکیورٹی کا کام ملا مگر اس کام کا بندوق سے کوئی تعلق نہیں تھا... اوہ میرا ٹرانسفر آ گیا ہے میں اس سے بات کر کے آتی ہوں۔''

اور وہ ایک بار پھر دُکان کے پچھلے حصّے میں گم ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بات کرنے میں بہت محتاط تھی یا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بات چیت اس کے کام کی جگہ ہو رہی تھی یا پھر شاید وہ ابھی تک امریکا میں خود کو ایک نووارد محسوس کرتی تھی۔ دُکان میں کافی شور تھا اور بعض مرتبہ میں اس کی بات پوری طرح سن نہ پاتی تھی۔ ویسے بھی وہ سرگوشیوں میں بولتی تھی اور بات کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتی تھی۔ وہ دوبارہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور ساتھ ہی ایک لڑکی کو مائیکرو ویو کو چیک کرنے کی ہدایت کی۔ کہنے لگی، ''میں بنیادی طور پر ابھی تک لبنانی ہوں اور کیوں نہ ہوں، وہ میرا ملک ہے، وہاں میرے بہن بھائی ہیں۔ جب تک میرے ماں باپ زندہ تھے میں دو مرتبہ گئی، اس کے بعد ایسا لگا جیسے وہاں جانا بے کار ہے، جب میرے محبت کرنے والے ہی وہاں نہیں ہیں۔ ویسے بھی وہاں جانا کافی مہنگا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے اپنے بچوں کے لیے پیسا بچائیں۔ میرا بیٹا اب یونی ورسٹی میں ہے اور بیٹی کالج میں۔ انسان زندگی میں سب کچھ بچوں کے لیے کرتا ہے۔'' میں نے پوچھا، ''کیا تمھارے بچے بھی تمھاری طرح عربی بول سکتے ہیں؟'' کہنے لگی، ''نہیں، نہیں۔ وہ اب بہت کم عربی بول سکتے ہیں کیوں کہ ان کا زیادہ وقت باہر گزرتا ہے۔''

''کیا وہ خود کو لبنانی سمجھتے ہیں یا امریکن؟''

''وہ مکمل طور پر امریکن ہیں۔ لیکن الحمد للہ! وہ مسلمان ہیں۔ مگر میری جڑیں ابھی تک لبنان میں ہیں۔ میں اپنے ملک کے حالات پر افسوس کرتی ہوں، وہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا اثر ہم پر بھی پڑتا ہے۔'' کچھ دیر چپ رہی اور پھر بولی، ''میں یہ بات کرنا نہیں چاہتی مگر— یہ ایک ایسا غم ہے جو ذکر کرنے پر پھر تازہ ہو جاتا ہے۔ میرا ایک اور بیٹا تھا جو ایک حادثے میں انیس سو ترانوے میں مارا گیا۔ وہ محض ایک حادثہ تھا، میں بار بار خود کو سمجھاتی ہوں مگر— اسکول کے لڑکوں کا کوئی جھگڑا تھا۔ میں یہ بالکل نہیں کہوں گی کہ اس میں یہاں کے باسیوں کا کوئی قصور تھا، انھوں نے تو مجھے اور میرے خاندان کو پناہ دی تھی یقیناً یہ کوئی ذاتی جھگڑا رہا ہوگا۔ دونوں طرف گرم خون تھا اور— اور یہ قصہ نائن الیون سے پہلے کا قصہ ہے۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرانے لگی۔ ''مگر یہاں کے لوگوں کو میں داد دیتی ہوں انھوں نے میری ہر طرح مدد کی، مالی طور پر بھی اور ہم دردی کے طور پر بھی۔ اور مدد کرنے والے میرے دوست نہیں محض میرے کلائنٹس تھے یا میرے پڑوسی تھے۔ اگر رات کو ہم دیر میں گھر آتے تو اسی وقت پڑوس سے فون آجاتا کہ خیریت تو ہے آج تم دیر سے گھر آئے ہو! مگر بہر حال میرا بیٹا بچ نہیں سکا۔ اور اس میں کسی کا قصور نہیں۔'' ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا بھی چاہتی ہے اور کہہ بھی نہیں پا رہی۔ مجھے وہ بہت مصروف نظر آرہی تھی۔ اگرچہ اس کی پہلی شفٹ ختم ہو چکی تھی کیوں کہ وہ صبح پانچ بجے سے بارہ تک کام کرتی ہے۔ مگر اس کے بار بار پیچھے مڑکر دیکھنے سے میں نے اندازہ لگایا کہ کہ وہ کچھ بے چین ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ چلتے چلتے اس نے کہا، ''تم میرا فون نمبر لے لو مجھ سے گھر پر بات کرلینا۔ ایک بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس کا فون بند تھا۔ ویسے بھی میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری وجہ سے دوبارہ کسی کرب سے گزرے۔ کچھ دُکھ ایسے ہوتے ہیں جن کا شاید دبے رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

◇

امریکا میں آپ جس جگہ بھی جائیں، جب میں جس جگہ کہتی ہوں تو اس کا مطلب

ہے کہ جس پاکستانی کے گھر جائیں، وہاں آپ کو پاکستانی چینلز نظر آتے ہیں۔ ان چینلز کی موجودگی بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم کچھ بھی کرلیں اپنی روٹس سے جدا ہونے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ چاہے وہ صدیوں کی صورت میں ہو۔ بعض مرتبہ تو صدی بھی گزر چکی ہے مگر جان ابھی تک اسی زمین میں اٹکی ہے جہاں آبا و اجداد بستے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب تک میں نے جن لوگوں سے بات چیت کی ہے کیوں کہ وہ لوگ پینتیس اور ساٹھ کے درمیان تھے اس لیے ان کی سوچ ملتی جلتی ہے۔ جب میں سان فرانسسکو پہنچی تو میری ملاقات ایسے بچوں سے ہوئی جو ابھی چودہ اور بیس کے درمیان تھے۔

فاطمہ جس کے والد پڑھنے کے لیے ستائیس سال پہلے یہاں آئے تھے۔ فاطمہ کے دادا پی آئی اے میں کام کرتے تھے۔ ان کے پانچ بیٹوں میں سے چار بیٹے امریکی شہری ہیں۔ خدا جانے کیا بات ہوئی کہ ایک بیٹا ابھی تک پاکستان کی محبت کا اسیر ہے۔ فاطمہ جو امریکا میں پیدا ہوئی، وقتاً فوقتاً پاکستان جاتی رہی، اب کچھ عرصے میں اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ وہ اپنی وکالت شادی کے بعد پوری کرے گی۔ ابھی پچھلے ہی دنوں وہ پاکستان سے واپس آئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس مرتبہ اسے پاکستان اتنا اچھا لگا کہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پاکستان میں ہی رہ جائے۔ سانولی رنگت، کالے بالوں اور درمیانے قد والی ہو بہو پاکستانی شکل والی فاطمہ کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم خود کو لاہور کا کیوں کہتی ہو جب کہ تم یہاں پیدا ہوئیں، تم نے یہیں تعلیم حاصل کی۔ مجھے اس کے جواب پر بڑی حیرت ہوئی۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ مناسب اردو میں جواب دے رہی تھی اور دوسری بات یہ کہ اتنی نوعمر ہونے کے باوجود اس کے سوچنے کا انداز بہت میچیور تھا۔ اس کا پہلا جملہ اس حادثے کے بارے میں تھا جسے نائن الیون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ''ایسا لگتا ہے کہ نائن الیون کے بعد ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہیے تھا۔ بعض مرتبہ تو لگتا تھا جیسے یہاں رہنا ناممکن ہے۔ ہمارے پاس کوئی بھی پاسپورٹ ہوتا مگر ہماری رنگت اس بات کی چغلی کھاتی تھی کہ ہم پاکستانی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم وہ نسل ہیں جس کا تعلق کہیں سے نہیں ہم یہاں رہتے ہیں تو پاکستان کا کلچرل بیگیج ہمارے

ساتھ ہوتا ہے۔ اور جب وہاں ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہم امریکا کا بوجھ اٹھائے ہیں۔ وہاں کے لوگ ہمیں امریکن ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور یہاں کے لوگ ہمیں اپناتے نہیں۔ ہماری کتنی بھی نسلیں یہاں رہ لیں مگر ہمیں پاکستانی ہی سمجھا جائے گا۔ میں کتنی بھی اچھی انگریزی بول لوں مگر میں پاکستانی ہی رہوں گی۔ اب آپ کا یہ پوچھنا کہ میں خود کو کیا سمجھتی ہوں، اس کا جواب مختلف موڈز میں مختلف ہوسکتا ہے۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ کاش ہمارے ملک کے حالات ٹھیک ہوجائیں اور میں ایک مرتبہ پھر اپنے دادا کے ملک میں جابسوں۔ مگر جب میں پاکستان جاتی ہوں تو مجھے شرم آتی ہے کہ مجھے جو مشکلات وہاں پیش آتی ہیں اس کا میں یہاں تصور بھی نہیں کرسکتی۔ وہاں کا پولیس والا جب مجھے روکتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ وہ میرا چالان کرے گا، وہ کہتا ہے کہ مجھے جیل میں ڈال دے گا کیوں کہ اسے میرے بولنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ میں اس ملک میں نووارد ہوں۔ وہ مجھ سے ڈالر مانگتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں گریجویشن کے بعد ایک دو سال پاکستان میں گزاروں گی مگر چند مہینے لاہور میں رہنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں نے حجاب بھی پہنا پاکستانی لباس بھی پہنا۔ مگر ان سب چیزوں کا کیا فائدہ جب آپ اندر سے اتنے کرپٹ ہوں، ہر قدم پر آپ کو رشوت دینی پڑے۔ یہاں میں کچھ بھی پہن لوں لوگوں کے پاس فرصت نہیں ہے کہ مجھے گھور گھور کر دیکھیں مگر وہاں تو ہر وقت آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے لوگوں کا کام ہی یہ ہے کہ آپ کا ایکسرے کرتے رہیں۔ پھر ایک رُخ اور بھی ہے، میں سمجھتی تھی کہ یہاں بہت عریانی ہے مگر وہاں میں بعض ایسی پارٹیز میں گئی جہاں لڑکیاں ایسے لباس پہنے تھیں کہ میں تو انھیں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔'' میں نے کہا، ''مگر یہ تمام لوگ پاکستان کی نمائندگی نہیں کرتے۔ یہ تو صرف دو فی صد لوگ ہیں۔ اصل پاکستانی تو وہ لوگ ہیں جن سے تم نہیں مل سکیں۔'' اس نے کہا، ''تو کیا اصل پاکستانی وہ پولیس والا ہے؟ کیا اصل پاکستانی وہ شخص ہے جو میرا سیل فون لے کر بھاگ جاتا ہے؟ کیا اصل پاکستانی وہ ہے جو مجھ سے چیزوں کی ڈبل قیمت مانگتا ہے؟ کیا اصل پاکستانی وہ ہے جو بھری پری سڑک پر کسی غریب شخص کو پیٹتا ہے؟ کیا اصل پاکستانی وہ ہے جس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ

میرے دادا کے ساتھ بیٹھ سکے یا نظر اٹھا کر بات کرسکے؟— نہیں آنٹی، آپ کچھ بھی کہیں مگر میں پاکستان سے بہت ناامید ہوکر آئی۔ کاش کوئی ایسی بات ہوتی کہ میں اس پر فخر کرسکتی! ہم جب یہاں پر رہتے ہیں تو ہمیں اچھے یا برے کی تمیز ہوتی ہے جب کہ وہاں ڈبل اسٹینڈرڈز ہیں۔ وہاں پر اگر آپ اچھی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے پاس بہت سے پیسے ہونے چاہییں، اگر آپ بیمار ہوں تو اچھے علاج کے لیے بھی آپ کے پاس سفارش کے ساتھ بہت سی دولت ہونی چاہیے ورنہ آپ کو صحیح علاج نہیں ملے گا۔ میں وہاں بیمار ہوئی تو کسی طرح تشخیص ہی مکمل نہیں ہو پاتی تھی۔ لوگوں نے کہا یہ صرف تم سے پیسے لینے کے طریقے ہیں۔'' میں نے کہا، ''یہ مت سمجھو کہ پورا پاکستان ایسا ہی ہے۔ یقیناً ہر ملک کی طرح وہاں بھی کچھ لوگ اچھے ہیں اور کچھ لوگ برے۔ وہاں ایدھی جیسے لوگ بھی پیدا ہوئے ہیں۔ اگر واقعی کبھی پوری قوم پر کوئی آزمائش پڑ جائے تو پھر تم پاکستانیوں کا جذبہ دیکھو۔''

◇

امریکا کا ہر حصّہ اپنی جگہ خوب صورت ہے اور پھر کیلی فورنیا جو موسم کے لحاظ سے بھی اپنی جگہ ایک جنت ہے۔ ہم سان فرانسسکو سے اوہائی جارہے تھے۔ اوہائی سانتا بابرا سے چالیس منٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہم ۱۰۱ ساؤتھ پر پچھلے دو گھنٹے سے سفر کررہے ہیں۔ چاندی سے رنگ کی نئی نکور امپالا ہم نے انٹر پرائز سے کرائے پر لی ہے۔ دھوپ تیز تھی اور خوش قسمتی سے ٹریفک بہت ہی کم تھا۔ سانتا بابرا وہ جگہ ہے جہاں ایک سے ایک بڑا اور مہنگا گھر ہے۔ یہ شہر ملینیرز کا شہر ہے جہاں ہالی ووڈ کے بڑے بڑے مشہورِ زمانہ اسٹارز رہتے ہیں۔ گھر کیا تھے، محل تھے اور لان ایسے ہرے بھرے اور خوب صورت کہ لگتا تھا سبز قالینوں سے آراستہ ہیں۔ دورویہ ٹریفک کے درمیان پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ لال، سفید، کاسنی، آتشی اور گلابی پھول ان جھاڑیوں پر کچھ اس طرح سجے تھے کہ لگتا تھا جھاڑیاں ان کے بوجھ تلے کسی دُلھن کی طرح جھکی چلی جاتی ہیں۔ سفیدے کے درخت قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ لہلہاتے کھیت تھے، انگوروں کی بے انتہا گھنی بیلیں تھیں جو بڑی

ترتیب سے لگائی گئی تھیں۔ کھیتوں میں میکسکن کام کر رہے تھے، یہ وہ مزدور ہیں جو یہاں بہت سستے ہیں اور آسانی سے دستیاب ہیں۔ اور سستے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ غیر قانونی طور پر یہاں رہتے ہیں۔ وہ امریکا جو ہمیں اپنی سرحد بند کرنے کے لیے کہتا ہے، جو چاہتا ہے کہ ہم اُسامہ بن لادن کو پکڑ کر اس کے حوالے کر دیں وہ خود اپنی سرحد پر قابو نہیں پا سکتا۔ ہر روز نہ جانے کتنے میکسکن سرحد پار کر کے یہاں داخل ہوتے رہتے ہیں۔

اوہائے ایک بہت چھوٹا سا پُرسکون گاؤں ہے جو پہاڑوں کے درمیان ایک پیالے کی صورت ہے۔ یہاں پر زیادہ تر وہ لوگ رہتے ہیں جو ریٹائر ہو چکے ہیں۔ بہت بڑے بڑے زمین کے ٹکڑوں پر دور دور گھر بنے ہیں۔ لگتا ہے آپ کسی جنگل میں رہتے ہیں۔ اکثر گھروں میں سوئمنگ پولز ہیں۔ مگر ہر امریکن شہر کی طرح یہ جگہ بھی اپنی جگہ خود کفیل ہے۔ ہمارے دوست طارق مفتی اور ڈوڈو اسی گاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کا گھر بھی بہت بڑا ہے۔ اس گھر میں کبھی کوئی جرمن رہتا تھا۔ وہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہاں آیا۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ڈائریاں ابھی تک اسی گھر کے ایک شیلف پر سجی ہیں۔ زیادہ تر ڈائریاں جرمن زبان میں ہیں مگر جو انگریزی میں ہیں وہ ہم پڑھ سکتے ہیں۔ اس کی بیوی یہاں کیسے بیمار ہوئی وہ سب کچھ ان میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کس چیز کی اس وقت کیا قیمت تھی وہ بھی آپ روزمرہ کی ڈائری میں دیکھ سکتے ہیں۔ جنگ کی بھی بہت سی یادگاریں اس ڈائری میں رقم ہیں۔ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد اس نے ڈائری لکھنی بند کر دی۔ اس گھر کی سب سے اہم چیز اس کا ڈائننگ ہال ہے جو اس گھر میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس ہال کا لکڑی کا فرش اور ڈیک پر کھلتی لمبی کھڑکیاں اس کمرے کو ہر وقت روشن رکھتی ہیں۔ آج کل اس کمرے کو اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ ایک کونے میں طارق کا کمپیوٹر ہے، ایک طرف بیٹھنے کی جگہ ہے جہاں صوفے رکھے ہیں، دو آرام کرسیاں ہیں جو بالکل ٹی وی کے سامنے ہیں۔ ایک اور لمبی کھڑکی کے سامنے ڈائننگ ٹیبل ہے۔ آپ اس کمرے میں جس جگہ بھی بیٹھیں آپ کو ہر جگہ سے لمبے لمبے درخت اور پس منظر میں پہاڑ نظر آتے ہیں۔ بدلتے موسموں کے ساتھ باہر کا منظر بھی بدلتا رہتا ہے۔ اسی لیول پر

باورچی خانہ ہے جہاں کی باورچن ڈوڈو ہیں جو اتنی بہترین کک ہیں کہ انھوں نے یہاں کے رہنے والوں کو پاکستانی کھانوں سے روشناس کروایا بلکہ اب کوکنگ کلاسز بھی لیتی ہیں۔ چند سالوں کی بات ہے یہاں کے لوگ صرف پاکستانی کھانے کھایا کریں گے۔ اسی لیول پر ان کا بیڈ روم بھی ہے۔ کچن کے دائیں طرف سیڑھیاں اترتی ہیں، اس کمرے میں طارق کا آفس ہے جس کے چاروں طرف ایک چھوٹا سا باغ ہے۔ گھر میں داخل ہوں تو داخلی دروازے پر ارچن آپ کا استقبال کرتی ہے۔ ارچن ایک براؤن رنگ کی کتیا ہے جو ڈوڈو پاکستان سے لائی تھی۔ کتے تو کتے ہیں خود انسان اس کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ اس کی کہانی بھی ایک ایسی کہانی ہے کہ جس سے انسان کو قسمت پر یقین ہونے لگتا ہے۔ ڈوڈو کو کتوں سے بہت پیار ہے (یہ نہیں کہ انسانوں سے نہیں ہے مگر فی الحال ذکر کتوں کا ہے) ایک صبح کراچی میں ڈوڈو اپنے ایک اصلی اور نسلی کتے کو سیر کرانے کے لیے نکلی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک کوڑے کے ڈھیر پر ایک کتا پڑا تھا جسے آتے جاتے بچے پتھر مار رہے تھے۔ ڈوڈو نے ان بچوں سے اس کو بچایا۔ جب گھر پہنچی تو دیکھا کہ وہ کتے کا پلا بھی ساتھ کھڑا ہے۔ اس کو نہلایا، دھلایا گیا، دودھ پلایا گیا، اس کا نام ارچن رکھا گیا اور اس کے بعد وہ ان کا فیملی ممبر بن گیا۔ اب خدا جانے یہ ارچن کی قسمت تھی یا طارق کی کہ طارق جو پچھلے تین چار برس سے بے کار تھے ان کو نوکری مل گئی اور وہ بھی امریکا میں۔ اور طارق کے ساتھ ارچن بھی اوہائے پہنچ گئیں۔ اب پچھلے سات سالوں سے یہ امریکا میں ہیں اور اوہائے میں بڑی مقبولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ لوگ اکثر اس کے شجرے کے بارے پوچھتے ہیں اور فرمائش کرتے ہیں کہ انھیں بھی ایک ایسی کتیا منگوادی جائے۔

ڈوڈو کو پاکستان اتنا یاد نہیں آتا مگر طارق پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ گھر میں پاکستانی چینل جیو اور اے آر وائی لگا ہوا ہے اور ڈوڈو کو بہت شکایت ہے کہ طارق دن رات یہی چینلز دیکھتے ہیں۔ تقریر کرنے کا ان کو بہت شوق ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب کا ذکر کیا تو بہت جذباتی ہو گئے۔ حالاں کہ ان کا اور ان کی بیگم کا پاکستان سے تعلق تھا وہ یہاں بھی اپنی زبان نہیں بولتے تھے۔ خاص طور پر ان کی بیگم جن کا

تعلق آغا خانی گھرانے سے ہے۔ پہلے تو وہ اس بات پر ناراض ہوئے جب میں نے کہا کہ یہاں رہنے والی پاکستانی قوم زیادہ تر اپنے ہونے پر شرمندہ ہے۔ ان کا کہنا تھا، ''یہ بتائیے کہ آخر پچھلے سالوں میں ہم نے ایسا کون سا کام کیا ہے جس پر آپ فخر کرسکتی ہیں؟ کیا ہم نے کوئی ایسی قابلِ فخر کتاب لکھی؟ کیا دنیا میں کسی اور شعبے جیسے سائنس میں کوئی کام کیا؟''

میں نے کہا، ''ایٹم بم تو بنایا ہے۔''

''مگر پوری قوم کو تو جاہل رکھا ہے۔ یہ تو آپ مانیں گی؟...آپ ایل اے جائیے آپ کو ایسے کتب خانے ملیں گے جس میں فارسی کی کتابیں ہیں اور یہ کتابیں پڑھتا کون نظر آتا ہے۔ یہودی اور آرمینین جن کا اگرچہ کوئی کلچرل تعلق نہیں رہا مگر ان کا سیاسی تعلق برقرار ہے۔

مگر ایک بات میں کہوں گا کہ اگر آپ انیس سو سینتالیس میں واپس چلے جائیں تو اس وقت انڈیا دنیا کی پانچ ویں بڑی معاشی طاقت تھی۔ اس کے پاس فیکٹریز، ملز، کارخانے اور کئی یونی ورسٹیاں تھیں اور ہمارے حصے میں کیا آیا محض ایک شوگر مل۔ ہم نے اس صفر سے ترقی کی اور آج دیکھیے ہم کہاں کھڑے ہیں۔''

''ہاں ہمارا لٹریسی ریٹ کم تھا، اس وقت ہندوستان کا لٹریسی ریٹ تریسٹھ فی صد ہے اور پاکستان کا اٹھاون فیصد ہم اس لحاظ سے کچھ اتنے برے نہیں رہے۔ مگر پھر بھی ہمارے یہاں ایوریج آدمی کی لیاقت میں فرق ہے۔ ایسا لگتا ہے ہمارے نوجوان پوری طرح مچیور نہیں ہوئے۔ آپ انڈس کی سائٹ پر جائیے اور دیکھیے کہ اس پر پچانوے فی صد انڈین ہیں اور صرف پانچ فی صد پاکستانی۔ ہندوستان کے پاس جو کچھ نہیں ہے وہ اس کا بھی شور کرتا ہے۔ آپ نے مون سون ویڈنگ دیکھی ہے؟ اس میں دکھاتے ہیں کہ ایک نوکرانی اپنے مالک کے ساتھ ناچ رہی ہے۔ آپ کے خیال سے ایسا ہوتا ہے وہاں؟ قطعاً نہیں۔ یہ تو انڈیا کا کلچر ہی نہیں ہے، مگر دکھاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر فیاض کے ماموں آفتاب احمد انڈیا کی طرف سے اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ انھوں نے کہا کہ تمھارے کلچر کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگ آپس میں گلے ملتے ہیں خاص طور پر عید کے دن نوکر اور مالک سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ ہندوستان میں دو قسم کے مسلمان ہیں،

اگر وہ کانگریسی ہے تو سخت اگریسو (agressive) ہوگا اور بقیہ مسلمان بہت ہی اپولوجیٹک (appologetic)۔ ہمارے یہاں کم ازکم سب ایک ہی جیسے ہیں غریب ہو یا امیر، سب کی عزتِ نفس موجود ہے۔ مشکل یہ ہے کہ طارق کو بولنے کی عادت ہے اور ساتھ میں بے حد ذہین بھی ہیں اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ آپ ان کی بات سنتے رہیں۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

مجھے طارق کی اس بات سے اتفاق نہیں تھا۔ میں نے کہا، ''میرے خیال میں تمام پاکستانی ایک جیسے نہیں۔ پاکستان میں نہ صرف وڈیرے بستے ہیں بلکہ جو وڈیرے نہیں بھی ہیں ان کا رویہ ایسا ہی ہے، جس کے تحت وہ عام لوگوں کو منہ نہیں لگاتے۔'' اور جب میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو طارق کہنے لگے، ''اب آپ راحت سعید کی طرح سرخوں جیسی بات نہ کریں۔'' یہ بات بہت عجیب ہے کہ جیسے ہی آپ غریبوں کے حق میں کوئی بات کریں آپ پر سرخا ہونے کا لیبل لگ جاتا ہے۔

◇

میں پچھلے چار دن سے دوبارہ ٹورونٹو میں تھی۔ کئی بار سوچا کہ ناصر کے پڑوسیوں سے ملا جائے جن کا تعلق یونان سے ہے۔ یونان بھی کیا جگہ ہے کہ ایک سے ایک فلاسفر پیدا کیے ہیں۔ اس نام کے ساتھ ہی اسکندر اعظم کا نام یاد آتا ہے، ارسطو کا خیال آتا ہے اور پھر وہاں کا کلچر اور قدیم روایات۔ شام کے تین بجے تھے۔ باہر سڑک پر ہر طرف خاموشی تھی، لوگ چھٹی منا رہے تھے۔ پوری سڑک پر ہر طرف ہریالی تھی، صرف اس سڑک کا واحد سُرخ درخت دھوپ میں کچھ ایسا چمک رہا تھا جیسے اس پر پتے نہیں یاقوت جڑے ہوں۔ ساتھ کے گھر میں گریک جوڑا اپنے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ میں اور شعیب باہر نکلے تو انھوں نے اپنی عادت کے مطابق ہمیں ہیلو کیا۔ ہم نے پوچھا، ''کیا ہم آپ کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ سکتے ہیں؟'' انھوں نے بہت خوش اخلاقی سے ہمیں دعوت دی۔ ڈینس نے ہم سے ہاتھ ملایا اور جلدی سے اپنے پاس پڑی قمیص پہن لی۔ قطرینہ نے میز سے برتن

اٹھائے اور ہم سے پوچھا کہ ہم کیا پئیں گے۔ گریک لوگ بھی اپنے خوب صورت ہونے کے لیے بہت مشہور ہیں اور اس کی سند ہمارے سامنے ڈینس کی صورت میں موجود تھی۔ سب سے پہلے تو اس نے تصحیح کی کہ اس کا نام ڈینس نہیں بلکہ Dionusos ہے جو کہ ان کے ایک خدا کا نام ہے۔ اس نے بہت ہنس کر کہا، ''تمھیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے خدا کتنے خوب صورت اور مشہور ہیں۔'' میں نے اس کو اپنی کتاب کے بارے میں بتایا تو فوراً بولنا شروع کردیا۔ کہنے لگا، ''میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کا سب سے احمقانہ فیصلہ کیا کہ یہاں آگیا۔ اپنی زمین سے اچھی جگہ کوئی نہیں۔ اور پھر میری زمین جہاں چار ہزار سال پُرانا کلچر ہے، ہسٹری ہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے بتیس سال ہوچکے ہیں۔ میرا بیٹا اب اکتیس سال کا ہے اور تمھیں حیرت ہوگی کہ میرا بیٹا مجھ سے پہلے واپس گریس جانا چاہتا ہے۔ اتنے میں قطرینہ آگئی، اس کی ٹرے میں کولڈ کافی کے ساتھ تین چھوٹی چھوٹی کرسٹل کی طشتریاں تھیں جن میں کھٹی چیریز تھیں جن کو شاید کسی شہد نما چیز سے اتنا میٹھا کیا گیا تھا کہ ہمارے لیے کھانا مشکل تھا۔ اپنے شوہر کی طرح قطرینہ بھی بہت زندہ دل خاتون تھی۔ سب سے پہلے اس نے کہا کہ میرا شوہر مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی خوش ہو کر الحمدللہ کہتا اس نے کہا، ''صرف اس لیے کہ یہ بھی چار بیویاں رکھ سکے— ہم گرمی میں ٹھنڈی کافی پیتے ہیں جو کہ فرانسیسی نیس کافی ہوتی ہے۔ اور سردیوں میں ہم ٹرکش کافی پیتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں دی جاتی ہے۔ اور یہ میٹھا جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہماری روایتی ڈش ہے۔ ہم کتنا بھی یہاں رہ لیں مگر ہمیں اپنا کھانا ہی پسند ہے۔ میرے خیال میں ہمارا کھانا دنیا کا بہترین کھانا ہے۔ تم نے تو ضرور ہمارے کباب وغیرہ یہاں کے ریسٹورنٹ میں کھائے ہوں گے؟ ہمارا کھانا، ہمارے پھل، تمھارے یہاں کون کون سے پھل ہوتے ہیں؟

قطرینہ اور ڈینس کی شادی بہت ہی چھوٹی عمر میں ہوئی تھی۔ قطرینہ پندرہ سال کی تھی اور ڈینس بیس سال کا تھا اور ظاہر ہے اپنی پسند کی شادی تھی زندگی کا سودا اگر اپنی پسند کا ہو تو اس سے اچھا اور کیا ہوسکتا ہے۔ بقول ڈینس کے دو سال ڈیٹنگ کے بعد یہ شادی

الہام پائی تھی۔ ہم دونوں تو رومیو اور جولیٹ تھے۔ میں نے ڈینس کو دیکھا بالکل یونانی دیوتاؤں کی سی کھڑی ناک، چوڑی پیشانی، بیضوی چہرہ، ابھری ہوئی بھوؤں کے نیچے گہری آنکھیں، بہت کِھلتا ہوا گندمی رنگ اور پھر اس پر اس کی زندہ دلی یقیناً وہ اب بھی مردانہ وجاہت کا ایک نمونہ تھا۔ قطرینہ گریک ہونے سے زیادہ کینیڈین لگتی تھی۔ شاید اپنے بے انتہا گورے رنگ کی وجہ سے؟ اس نے اس وقت ایک لال بلاؤز اور چھوٹی سی اسکرٹ پہنی تھی۔ جس انداز سے وہ کافی اور میٹھا لے کر آئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک اچھی ہاؤس وائف اور ایک بہت اچھی میزبان ہے۔ دونوں ہماری آمد سے اتنے خوش تھے کہ ایک وقت میں دونوں بولنا چاہتے تھے۔ ڈینس نے اپنی بات جاری رکھی، ''ہم انیس سو چھپتر میں یہاں آئے۔ اس وقت ہمارے یہاں سیاسی منظر بہت خراب تھا۔ تمھیں پتا ہوگا کہ ترکی اور سائپرس سے ہماری جنگ چل رہی تھی۔ بس ان حالات سے گھبرا کر یہ احمقانہ فیصلہ کیا۔ میرا ملک بہت اچھا ملک ہے۔ اپنے ملک سے زندگی بھر دور کون رہنا چاہتا ہے۔ اپنے بیٹے سے پوچھو کیا وہ زندگی بھر یہاں رہنا چاہتا ہے...کبھی نہیں۔ میں نے اور شعیب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں نے کہا، ''پتا نہیں ہمارے یہاں تو یہ ہے کہ جو یہاں آتا ہے یہاں سے واپس نہیں جانا چاہتا۔'' ہماری بات سن کر وہ کچھ دیر چپ رہا اور پھر بولا، ''ہوسکتا ہے تمھارے یہاں رہنے سہنے کا معیار اچھا نہ ہو، اس لیے لوگ یہاں رہ جاتے ہیں۔'' میں نے اسے بتایا کہ ہمارا تعلق جس طبقے سے ہے میں نہیں سمجھتی کہ وہاں ان کے رہنے کے معیار میں کچھ کمی ہے بلکہ وہاں تو نوکر چاکر ہیں، پیسا ہے۔ مگر پتا نہیں کیوں؟''... اس نے بات آگے بڑھائی اور کہا، ''یہ ایسا ملک ہے جہاں کسی چیز کا اعتبار نہیں۔ آپ بیس سال کسی کے ساتھ کام کریں مگر وہ کسی بھی وقت چودہ دن کے نوٹس پر آپ کو نکال دیتا ہے۔ یہاں انسان گدھے کی طرح صبح سے شام تک کام کرتا ہے۔ اپنے لیے کوئی وقت نہیں جب کہ اپنے ملک میں ہم ہر شام ساتھ بیٹھتے ہیں۔ پھر چھٹی، دیکھیں پورے سال میں بڑی سے بڑی کمپنی صرف چودہ دن کی چھٹی دیتی ہے۔ میرا بیٹا بی ایم ڈبلیو کے لیے کام کرتا ہے۔ اتنی بڑی کمپنی اور... اپنے بہن بھائیوں میں سب سے جاہل میں ہوں۔

میری بہنیں اور بھائی کوئی چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہے، کوئی انجینئر ہے، کوئی ڈاکٹر ہے اور وہ سب یونان میں بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں جب یہاں آیا تو کسی اسکول نہیں گیا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے چاروں طرف رہنے والوں سے انگریزی سیکھی۔ چھ مہینے کہیں نوکری کی اور اس کے بعد اپنا بزنس شروع کردیا۔ میں الومنیم کی کھڑکیوں کا کام کرتا ہوں۔ دو سال کے اندر ہم نے اپنا گھر لے لیا اور اب میرے پاس اتنا کام ہے۔ میں اب گھروں کا نہیں بلکہ ہائی رائز بلڈنگز کا کام کرتا ہوں۔ لیکن یہ ملک بڑا ظالم ہے، بہت سخت ہے۔ دیتا بہت کچھ ہے مگر سب کچھ واپس لے لیتا ہے۔ اگر دو سال میں ٹیکس نہ دے سکوں تو میرا گھر ضبط ہوجائے گا۔ ایسا لگتا ہے یہاں کوئی چیز اپنی نہیں۔ جب کہ ہمارے اپنے ملک میں اتنی اپنائیت ہے۔'' میرے بغیر پوچھے ہی اس نے اپنے ملک سے محبت کا اظہار شروع کردیا۔ ''اوہ میرا ملک... میں نے بیس سال اپنے ملک میں گزارے ہیں اور بتیس سال کینیڈا میں گزارے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کینیڈا میں کوئی خرابی ہے مگر میرا ملک— اوہ...'' اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''میرا دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ بس نہیں چلتا کہ کیا کرلوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں دو حصّوں میں بٹ چکا ہوں۔ اسی لیے اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہاں رہوں گا جہاں میرا دل ہے، جہاں کی مٹی میں میری جان، جسے میں اپنی ماں کی طرح چاہتا ہوں۔ کیا تم بھی یہ کہتے ہو کہ زمین کی محبت ماں کی طرح ہے؟'' میں اسے کیسے بتاتی کہ یہ الفاظ وہ نہیں کہہ رہا بلکہ یہ سب میرے دل کی آواز ہے۔ شعیب نے اس کی بیوی سے پوچھا، ''اور آپ— آپ کیا کہتی ہیں؟'' قطرینہ اپنی باری کی منتظر تھی، جلدی سے بولی، ''میں! میں تو یہاں ایک منٹ نہیں رہنا چاہتی۔ میں تو جب بھی اپنے ملک جاتی ہوں تو کبھی واپس نہیں آنا چاہتی۔ شاید میں اگر کبھی ڈینس کو چھوڑوں گی تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ میں اپنے ملک میں رہنا چاہوں گی اور اگر اس نے نہ مانا تو مجھے سوچنا پڑے گا کہ کون مجھے زیادہ پیارا ہے۔ ڈینس یا یونان۔'' میں نے پوچھا یہ بتائیے کہ آپ کے اور ہمارے یہاں کے پہناوے میں کیا فرق ہے؟ زیادہ تر تو پہناوا ایک ہی جیسا ہے مگر یہاں کے لوگوں کو پہننا اوڑھنا نہیں آتا۔ ہمارے یہاں لوگوں کو بننے

سنورنے کا شوق ہے۔ بڑے طریقے اور اپنی روایات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیار ہوتے ہیں۔ یہاں تو نہ لوگ کپڑے استری کرتے نہ ٹھیک طرح بال بناتے ہیں، ظاہر ہے جن کی کوئی ہسٹری ہی نہ ہو وہ کیا کریں گے۔ ہم اس لحاظ سے ان سے بہت آگے ہیں۔

سامنے کے گھر میں ایک گاڑی آکر رکی اور گاڑی سے اترنے والا بجائے اپنے گھر میں جانے کے ہماری طرف آیا۔ یہ شخص کینیڈین ہے، بہت لمبا اور جسمانی طور پر بھاری شخص، جو بہت اونچی آواز میں بات کرتا ہے۔ ہمارا اس سے تعارف کروایا گیا کہ یہ ان دو چھوٹے بچوں کے دادا اور دادی ہیں جن کا نام ہم لوگوں نے مالی رکھا ہوا ہے۔ اس شخص نے کہا، ''آپ کے بچے بڑے اچھے گارڈنر ہیں، وہ گھنٹوں اپنی ماں کے ساتھ باغ میں کام کرتے ہیں۔'' اس شخص کو بیٹھنے کی دعوت دی گئی مگر اس نے کہا، ''میں ایک پارٹی سے آرہا ہوں اور یہ پارٹی اڑتالیس گھنٹے سے چل رہی تھی۔ میں بہت تھک چکا ہوں اور اب جا کر شاور لے کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں چوبیس گھنٹے تک سوتا رہوں گا۔'' قطرینہ نے کہا، ''تم نے تو یقیناً شراب پی ہوگی؟'' کہنے لگا، ''نہیں میں تو سب کا ڈرائیور تھا، میں تب کیسے پی سکتا تھا! تمھیں تو معلوم ہے کہ اگر یہاں ڈرائیو کرتے ہوئے کوئی حادثہ ہوجائے تو اس کی سزا ساڑھے سات ہزار ڈالر جرمانہ اور پندرہ سال کی قید ہے۔ کیا تمھارے یہاں بھی قوانین اتنے ہی سخت ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ ہم سب نے اسے خدا حافظ کہا اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوئی۔ میں نے پوچھا، ''کیا آپ لوگوں کے بہت سے دوست ہیں؟ یعنی ہر قومیت کے؟'' جواب ملا، ''بالکل بالکل— انڈین، پاکستانی، فرانسیسی، جاپانی، عربی، اسپینش اور ظاہر ہے یونانی۔ مگر اصل دوست صرف یونانی ہی ہو سکتے ہیں۔ کہنے کو سب سے دوستی ہے مگر دل ملتا ہے تو صرف اپنے لوگوں سے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دوسرے لوگ اچھے نہیں ہیں۔ نہیں نہیں، سب اچھے ہیں مگر صحیح معنوں میں جو دل کی بات سمجھ سکتے ہیں وہ گریکس ہی ہیں۔ ویسے زندگی میں دوست، اور اچھے دوست ایک نعمت ہیں۔ بڑا خوش قسمت ہوتا ہے وہ شخص جسے زندگی میں اچھے دوست مل جاتے ہیں۔''

''جب آپ کینیڈا آئے تو کیا آپ انگریزی جانتے تھے؟''

"نہیں، بالکل نہیں مگر مجھے افسوس ہے کہ یہاں آکر میں کسی اسکول نہیں گیا، بس یہاں کے لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے زبان سیکھ لی۔ میری بیوی کو تو اور بھی مشکل ہوئی۔ یہ شروع میں ایک جوتوں کی دکان میں کام کرتی تھی، وہ لوگ کہتے تھے کہ جب تم اپنا کام ختم کرلو تو آکر کہو فنشڈ مگر اس کو یہ لفظ یاد ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہاں میرے بچے کیوں کہ یہاں پیدا ہوئے، اسکول گئے اس لیے انھیں زبان کی کوئی مشکل نہیں ہوئی۔"

"اور اپنی زبان؟ کیا آپ کے بچے اپنی زبان بولتے ہیں؟"

"اوہ— اپنی زبان، بالکل۔ وہ کیا میرے گرینڈ چلڈرن۔ وہ بھی گریک بولتے ہیں۔ ہم نے اپنی زبان، اپنا لٹریچر اور اپنی موسیقی نہیں چھوڑی۔ میرے بیٹے اپنی زبان کا لٹریچر پڑھتے ہیں۔ یہ دیکھو یہ کتاب پڑی ہے، یہ ہماری زبان میں ہے۔ ابھی میرے بیٹے کی شادی ہوئی تھی گانا بجانا سب اپنی زبان میں تھا۔ اپنے روایتی فوک ڈانسز تھے۔ یہاں کے ڈانس مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"ویسے کینیڈا تمھیں رہنے کے لیے کیسا لگتا ہے؟" اب قطرینہ کی باری تھی کہنے لگی، "سچ بتاؤں— مجھے کینیڈا کا موسم بالکل پسند نہیں۔ یہاں صرف دو موسم ہوتے ہیں، آٹھ مہینے سردی اور چار مہینے گرمی۔ جب کہ ہمارے ملک میں ہم چار موسموں کا لطف اٹھاتے ہیں۔ یہاں کی سردی سے میرے جوڑوں میں درد ہوجاتا ہے۔ یہ جگہ بہت ہیومڈ ہے ہر وقت بارش بھی ہوتی رہتی ہے جو آتھرائیٹسٹ کے لیے اور بری ہے۔

پتا نہیں ہم کیسے لوگ ہیں، یہاں رہتے ہیں اور یہاں کی برائی بھی کرتے ہیں۔ یہاں ہم کتنے سال بھی رہیں اپنائیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بالکل یہاں کی چیزوں کی طرح ہر چیز مورٹ گیج ہے نہ گاڑی پوری طرح اپنی ہے نہ گھر۔ ایسا لگتا ہے ہم نے اپنی زندگیاں یہاں پر مورٹ گیج کردی ہیں۔ میری ماں جو ابھی زندہ ہے، میں اس کی خدمت نہیں کرسکتی۔ یہاں کی زمین دیکھو کتنی سخت ہے، اوہ میرے گاؤں کی زمین، ہاتھ لگاؤ تو کتنی نرم ہے اور نرم زمین میں کتنے رنگین اور خوش بو والے پھول کھلتے ہیں۔ مگر ہماری زمین ایک ایسی بیلٹ میں ہے جہاں بہت زلزلے آتے ہیں جیسے ترکی، ایران— کیا تمھارے یہاں

بھی زلزلے آتے ہیں؟ ہاں ہاں مجھے یاد ہے! دو سال ہوئے تمھارے یہاں بہت شدید زلزلہ آیا تھا۔ تم یہ سوالات میرے بیٹے سے کرو وہ ابھی ایک مہینہ ایتھنز میں رہ کر آیا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس سے خوب صورت ملک کوئی نہیں۔ تمھارا کیا ایک ہی بیٹا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرا ایک بیٹا بوسٹن میں ہے۔

"اوہ— بوسٹن میں؟ امریکا میں۔ وہ جگہ زیادہ اچھی ہے کہ آپ وہاں زیادہ پیسا بناسکتے ہیں۔"

ضرورت بھی کیا چیز ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر آپ پوری زندگی کسی اور جگہ گزار دیتے ہیں۔ میں نے یہ سب باتیں پہلے بھی سنی تھیں، بہت سے پاکستانی ہر سال یہی کہتے ہیں کہ ہم واپس اپنے ملک جائیں گے مگر کبھی واپس نہیں جاتے۔ یہاں کی زمین میں کچھ ایسی تاثیر ہے، ایسی قوت ہے کہ وہ سب کو روک کر رکھتی ہے اور وہ چیز سوائے دولت کے اور کیا ہے؟

"یہاں کے لوگ اپنے بوڑھوں کا بہت خیال کرتے ہیں۔ کیا تمھارے یہاں بھی ایسا ہی ہے؟"

قطرینہ نے جواب دیا، "تم نے کیا کہا، یہاں کے لوگ اپنے بوڑھوں کا خیال کرتے ہیں؟ یہاں تو لوگوں کے پاس وقت ہی نہیں ہے، یہاں کے لوگ تو مشین ہیں، یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اولڈ ہومز بنا کر انھوں نے اپنے بزرگوں پر احسان کیا ہے۔ انھیں ان کی تنہائی کا احساس نہیں ہے۔ ہم اپنے بزرگوں کو کبھی اپنے سے الگ نہیں رکھتے۔ ہمارے یہاں بزرگوں کے لیے الگ گھر نہیں ہیں۔ ہم اپنے گھر میں ان کے لیے نرس رکھ لیتے ہیں اور پھر ہر شام ان کے ساتھ کچھ وقت گزارتے ہیں۔"

میں نے کہا، "مگر اس کے بارے میں کیا خیال ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کو چھوڑ کر ہزاروں میل دور آجاتے ہیں۔"

قطرینہ نے کچھ سوچا اور پھر کہا، "یہ ہماری مجبوری ہے۔"

"مذہب کے بارے میں تمھارا خیال ہے؟"

ڈینس کے خیال سے مذہب ایک ذاتی چیز ہے۔ آپ کی مرضی ہے کہ کسی بھی خدا

کی عبادت کریں۔ اس کے خیال سے تین مذاہب ایک دوسرے سے بہت نزدیک ہیں بلکہ یہ فرسٹ کزنز ہیں، یہودیت، عیسائیت اور اسلام — اور عجیب بات ہے کہ تینوں کزنز میں آپس میں کتنے اختلافات ہیں۔ مذہب اس لیے آئے کہ دنیا میں کسی نہ کسی قانون کی ضرورت تھی۔ مگر اب؟... اب تو ہر چیز کے لیے قوانین موجود ہیں۔ کیا ہمیں اب بھی کسی مذہب کی ضرورت ہے؟ لیکن جب آپ کا شناختی کارڈ بنتا ہے تو اس میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا، "مگر کینیڈا میں تو ایسا نہیں ہے کسی بھی کارڈ یا پاسپورٹ پر آپ کے مذہب کا کہیں ذکر نہیں ہوتا۔"

ڈینس نے کہا، "ہاں نہیں ہوتا مگر بعض مرتبہ نام ہی آپ کی شناخت ہوتا ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ مذہب ضروری چیز ہے۔ اس کے علاوہ کہ یہ کم زوروں کے لیے سہارا ہے، یہ آپ کو اخلاقیات بھی سکھاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں بزرگوں سے بات کرنے کا کوئی طریقہ ہوتا تھا۔ کیا تم نے کبھی سنا تھا کہ کوئی شخص اپنے بڑوں کو کہے کہ بکواس نہ کرو۔ مگر آج کل یہ کوئی بات نہیں رہی۔ اس میں کلچر کے ساتھ ساتھ مذہب کا بھی دخل ہے۔ ہمارے ملک میں اس لحاظ سے بہت لاقانونیت ہے۔ جو شخص جو چاہے پہنتا ہے جو چاہے کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی حال ہے مگر ہمارے یہاں یہ چیز کچھ زیادہ ہی ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو پوری دنیا میں کوئی اقدار نہیں رہیں نہ کسی کے مذہب کا احترام کرتے ہیں اور نہ بزرگوں کا۔ اس ملک میں تو ہر جگہ کے لوگ جمع ہو گئے ہیں خاص طور پر اتنے چائنیز ہیں کہ لگتا ہے ہم کینیڈا نہیں آئے بلکہ چائنا آ گئے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو ہم چائنا ہی چلے جاتے۔ ہر طرف چینی کھانا ہے، چینی لوگ ہیں، چینی کلچر ہے۔

کسی بھی ہماری عمر کے انسان کی طرح انھیں بھی نئی نسل سے شکایت تھی۔ شاید یہ ہر جگہ کے لوگوں کا مسئلہ ہے۔ اس بات کا نوٹس لینا بھی بے کار ہے کہ ہم نے بھی اپنے بزرگوں سے ہمیشہ یہی سنا کہ "ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔" شام زیادہ ہوچکی تھی، ہم نے انھیں خدا حافظ کہا اور طے یہ ہوا کہ ہم اگلی ملاقات پر ان کے لیے

پاکستان سے آم لائیں گے۔

◇

ٹورونٹو کی ایک چمکتی دوپہر تھی، ایسی چمکتی دوپہریں یہاں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ میں اور میرے پی ٹی وی کے زمانے کے ساتھی ایک کروز پر جا رہے تھے۔ سعید احمد نسیم، ان کی بیگم راحیلہ، زبیر الدین اور ان کی بیگم، شعیب اور میں۔ نسیم، زبیر اور میں اس وقت کے ساتھی ہیں جب ان کی بیگمات کا ہمارے گروپ میں وجود نہیں تھا۔ نسیم اور زبیر دونوں چھڑے تھے۔ زبیر اس زمانے میں کچھ ریز رو شاید اس کا اردو ترجمہ ہوگا آپے میں رہنے والے شخص تھے، اب لگتا ہے انھیں کینیڈا کی ہوا لگ گئی ہے۔ اور نسیم جیسے اب ہیں ویسے ہی پہلے بھی تھے۔ مگر اس وقت میں ان کی شخصیت کے حسّاس ہونے والے حصّے سے واقف نہیں تھی۔ اس وقت وہ بظاہر ایک لاپروا سے شخص نظر آتے تھے جو زندگی کے صرف ایک رُخ سے واقف تھے جس کا نام تھا انجوائے منٹ۔ ٹیلی وژن میں نے ۱۹۸۳ء میں چھوڑ دیا، نسیم سعودی عرب چلے گئے اور اس کے بعد میری ان سے ملاقات سالوں بعد ایک موسیقی کی محفل میں ہوئی۔ دوریاں انسانوں کو دوبارہ سے اجنبی بنا دیتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی میرے اور نسیم کے ساتھ ہوا۔ مگر نہ جانے کیسے ان کی بیگم راحیلہ سے میری دوستی ہوگئی۔ اگرچہ عمر میں راحیلہ مجھ سے کہیں چھوٹی ہے مگر شاید دوستی کا عمر سے کوئی تعلق نہیں۔ نسیم آج بھی اتنی ہی سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں کہ جس پر ان کی جوانی میں لڑکیاں مرتی تھیں۔ بالوں کی سفید سٹریک سے وہ مزید پرکشش ہوگئے ہیں۔ سلور سٹریک جو بالکل درمیان سے ہوتی ہوئی پیچھے تک جاتی ہے۔ پھر سائڈ برنز جن میں چاندی جھلکتی ہے۔ بات کرنے کے بارے میں تو ہم سب جانتے ہی ہیں اور بقیہ اسٹائل کا کیا کہنا۔ ہوسکتا ہے آج بھی چند حسینائیں جگہ جگہ، چوری چوری ان کو دیکھتی نظر آئیں۔ بہرحال اس دوپہر ٹورونٹو میں ہم سب ڈاؤن ٹاؤن جا رہے تھے جہاں سے ہمیں ایک فیری میں تین گھنٹے تک ٹورونٹو بائے سی دیکھنا تھا۔ پکنک کا آدھا مزہ وہ ہے جو ساتھیوں کی وجہ سے آتا ہے۔ بالکل زندگی کی

طرح کہ اگر ایسے لوگ ملتے رہیں جن کی سنگت آپ کو خوش رکھے تو زندگی بہار ہی بہار ہے ورنہ دنیا کی تمام آسائشوں کے باوجود زندگی کا ادھورا پن برقرار رہتا ہے اور آپ تنہائی کے ایندھن میں جلتے رہتے ہیں۔

تو اس دوپہر ادھورے پن اور تنہائی کا احساس دور تک نہیں تھا۔ یہ دعوت زبیر کی طرف سے تھی۔ آپ کو یہ بتاتی چلوں کہ زبیر پر شادی کا اثر کچھ زیادہ ہی اچھا ہوا ہے کہ اب وہ بولتے بھی زیادہ ہیں، چٹکلے بھی زیادہ کرتے ہیں اور یہاں تک کہ اب انھیں یہ بھی پتا نہیں کہ کہاں پر سنجیدہ ہوجانا ہے اور کہاں پر خاموش رہنا ہے۔ یہ اثر کینیڈا کا ہے یا شادی کا اس کے بارے میں، میں کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتی۔ راحیلہ اور زیب بہت اسمارٹ لگ رہی تھیں۔ کروز پر جانے والے مختلف قومیت سے تعلق رکھتے تھے جیسا کہ کینیڈا میں ہر شعبۂ زندگی میں اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ سخت گرمی تھی اس لیے خواتین اور مرد حضرات سب ہی کم سے کم لباس پہنے تھے۔ ہوا تیز تھی اور اس میں آپ ہر رنگ کے بال اڑتے دیکھ سکتے تھے۔ جہاز میں سوار ہونے کی قطار کافی لمبی تھی جو لوگ اپنے لیے دھوپ سے بچنے کے لیے ٹوپی نہیں لائے تھے وہ سخت پچھتا رہے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں کیمرے تھے۔ آج کرکٹ کے فائنل میں پاکستان اور سری لنکا کھیل رہے تھے۔ ہم سب کا دھیان اس طرف بھی تھا۔ دو بجے ٹیلی فون بجا اور ہمیں خبر ملی کہ پاکستان جیت گیا ہے، ایسا لگا جیسے پکنک کا مزہ دوبالا ہوگیا۔ زبیر اور نسیم جو دو دہائیوں سے ملک سے باہر ہیں آج بھی اپنے پاکستانی پن کو پس منظر میں نہیں ڈال سکے۔ شاید اسی کا نام ہے زمین سے محبت یا روٹس۔ نہ کینیڈا میں بجلی جاتی ہے نہ پانی کا کوئی مسئلہ، نہ سیکیورٹی کا کوئی ڈر مگر پھر بھی اس بے کار ملک پاکستان کی محبت ہے کہ دل سے نکلتی ہی نہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے، کسی کو معلوم ہے تو بتائے۔ یہ کیسا عشق ہے کہ عاشق کتنا بھی ذلیل و خوار ہوں مگر دل ہے کہ اس محبوب کا چہرہ بھولنا ہی نہیں چاہتا۔

چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

او میرے وطن او میرے وطن
میرے سر پہ وہ ٹوپی نہ رہی جو تیرے دیس سے لایا تھا
پاؤں میں وہ اب جوتے بھی نہیں
واقف تھے جو تیری راہوں سے
میرا آخری کُرتہ چاک ہوا تیرے شہر میں جو سلوایا تھا
اب تیری جھلک
بس اڑتی ہوئی رنگت ہے میرے بالوں کی
یا جھریاں میرے ماتھے پر
یا میرا ٹوٹا ہوا دل ہے
او میرے وطن او میرے وطن

جہاز کے اندر پہنچے تو گرمی سے نجات ملی۔ سب لوگ ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے صرف ایک شخص وہاں اکیلا تھا کچھ ایسا کہ اس کے چہرے کو دیکھ کر کچھ خوف کا سا احساس ہوتا تھا۔ لمبے بال، موٹے نقش، رنگ سیاہی مائل، آنکھوں میں کچھ وحشت۔ میں نے اپنی نظریں اس سے ہٹالیں اور آگے بڑھ گئی۔ جب بھی پلٹ کر دیکھا وہ اسی ایک کونے میں بیٹھا نظر آیا۔ فلور پر ڈانس ہورہا تھا۔ سامعین اور ناظرین میں سے بھی کچھ لوگ اس رقص میں شامل ہوگئے جن میں نسیم اور راحیلہ پیش پیش تھے۔ ہر طرف مختلف مشروبات تھے، آپ حسبِ شوق اور حسبِ ذوق ان سے لطف اندوز ہوسکتے تھے۔ کھانے کا بھی انتظام تھا۔ اس شخص نے نہ کچھ کھایا اور نہ کسی تفریح میں حصّہ لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کو بھول چکی تھی کہ اچانک وہ مائک کے نزدیک آیا اور کہنے لگا، ''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت جو کچھ پاکستان میں ہورہا ہے آپ ان حالات کے بہتر ہونے کے لیے دعا کریں۔'' اس کے بعد بولا، ''انسان کے لیے اپنی زمین سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔ میں اپنے ملک کو جنون کی حد تک چاہتا ہوں اور اس کے لیے ایک گانا گانا چاہتا ہوں۔

Country roads take me home to the place I belong

Country roads take me home. Almost heaven...

اے گاؤں کی سڑک مجھے اس راستے پر لے جا جہاں میرا گھر ہے۔ گھر جو میرے لیے جنت ہے۔ جہاں پہاڑوں کی نیلی چمکتی چوٹیاں ہیں۔ جہاں وہ دریا بہتا ہے۔ جہاں وہ پرانے درخت ہیں کہ جن سے نہ جانے کتنی پرانی کہانیاں وابستہ ہیں اور وہ کہانیاں آج بھی اتنی ہی جوان ہیں کہ ان پر کسی تازہ ہوا کے جھونکے کا گمان ہوتا ہے۔ اے سڑک مجھے اس زمین پر لے چل— جس میں میری جڑیں ہیں، جس سے میرا رشتہ اور میری سانسیں جڑی ہیں، اس جگہ جہاں کے لوگ سمندر سے نا آشنا ہیں۔ جہاں کے آسمان کا رنگ گہرا ہے۔ جہاں کا آسمان خاک آلود ہے اور جہاں کی چاندنی کا مزہ میری پور پور میں بسا ہے، جس کی یاد میں میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتی ہیں۔ اے سڑک— ہر صبح میں اس کی آواز سنتا ہوں، میری زمین مجھے پکارتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ شاید مجھے اس سے بہت پہلے گزرے ہوئے کل میں اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کنٹری روڈ ٹیک می ہوم۔

◇

ہم ڈیٹرائٹ میں شیرین کو چھوڑنے کے لیے ایئرپورٹ جا رہے تھے۔ شیرین ایک ایرانی لڑکی ہے۔ پچھلے سات سال سے یہ امریکا میں رہتی ہے۔ چار سال اس نے پاکستان میں بھی گزارے ہیں۔ یہ بھی اپنے ملک میں حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے آج امریکا میں ہے۔ ہم کچھ بھی کہیں امریکا ہی وہ پناہ گاہ ہے جو دنیا بھر کے لوگوں کو اپنے وجود میں سمیٹ لیتی ہے۔ شیرین کا تعلق شاہ آف ایران کے خاندان سے ہے۔ اس کے دو چچا حکومت کی تحویل میں مارے گئے۔ شیرین کا کہنا ہے کہ وہ ٹارچر کی وجہ سے مرے یا پھر ان کو قتل کیا گیا اور ان کی لاش بھی ان کے ورثا کو نہیں دی گئی۔ شیرین کے والد کا ایران سے نکلنا مشکل ہوگیا بلکہ وہ سمجھتی ہے کہ یہ ایک معجزہ ہے کہ وہ زندہ سلامت اپنے ملک سے نکل سکے۔ یہ لوگ تہران میں رہتے تھے۔ شیرین کی عمر اس وقت بارہ سال تھی جب وہ ایران سے پاکستان پہنچی۔ اسے تہران اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ

''سب سے زیادہ تمھیں اپنے ایران کی کون سی بات یاد ہے؟'' تو کہنے لگی، ''وہاں کے بے حد سخت استاد۔ خاص طور پر اسلامیات پڑھانے میں وہ اتنی سختی کرتے تھے کہ اس مضمون سے نفرت ہونے لگتی تھی۔ ان کی سختی کو یاد کرتی ہوں تو آج بھی جب میں یاد کرتی ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں انگریزی، عربی اور بقیہ تمام مضامین میں بہت اچھی تھی۔ میرا کم زور مضمون صرف اسلامیات تھا۔ یہی وہ مضمون تھا جس کے لیے مجھ پر تمام تر سختی کی جاتی تھی۔ شاید اسی لیے میں اس مضمون سے دور ہوتی چلی گئی اور اس کے نتیجے میں مجھے بہت مشکل اٹھانی پڑی۔'' میں نے اس سے پوچھا، ''وہاں تم سخت پردہ کرتی تھیں؟'' کہنے لگی، ''نہیں— تہران بقیہ ایران کی نسبت ایک ماڈرن شہر تھا۔ ہم وہاں صرف اسکارف پہنتے تھے، چہرہ نہیں چھپاتے تھے۔ اس کے علاوہ میک اپ وغیرہ پر بھی بہت پابندی نہیں تھی۔ عورتوں کے ساتھ زیادہ مظالم اندرونی حصے میں تھے۔

ہمارا خاندان ایران کے ان خاندانوں میں سے تھا جو بہت دولت مند تھے۔ شاہ کے دور کے رشتے دار ہونے کی وجہ سے ہم پر بہت مظالم ہوئے، ہمارا وہاں سے نکلنا مشکل ہوگیا پھر یہ بھی ضروری تھا کہ ہم کسی ایسے ملک میں جائیں جہاں پر امریکی سفارت خانہ ہو۔ بہت سے ایسے ملک تھے جہاں پر ہمیں اتنی مشکل نہ ہوتی مگر وہاں پر امریکی سفارت خانے جلا دیے گئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح ہم پاکستان پہنچے۔ ہم لوگ پاکستان میں اسلام آباد میں رہے، وہیں پر میں نے اردو سیکھی۔ ہم اپنا بہت کم پیسا ایران سے نکال پائے تھے۔ امریکی ایمبیسی نے بار بار ہمیں انٹرویو کے لیے بلایا اور خدا خدا کر کے ہمیں امریکی ویزا ملا اور ہم شکاگو پہنچے۔ یہاں پہنچ کر میرے والد کو دو ہارٹ اٹیکس ہوئے اور پھر اوپن ہارٹ سرجری ہوئی۔ ہمارا یہ زمانہ بڑا مشکل زمانہ تھا۔ میرے والد اس کے بعد کبھی اتنے صحت مند نہیں ہو سکے۔ ویسے بھی ان کے دل میں اپنی زمین سے جدائی کے غم ہیں۔''

''کیا تم دوبارہ ایران جانا چاہتی ہو؟''

''شاید کبھی ویسے ہی کچھ عرصے کے لیے جاؤں مگر مستقل رہنے کے لیے کبھی نہیں جاؤں گی۔ یہ سوالات تو آپ میری ماں سے کریں وہ آپ کو بہت جواب دے سکیں گی۔

مجھے اپنی زبان، اپنا لٹریچر اور اپنے ملک کی موسیقی بہت پسند ہیں۔ میرے زیادہ تر دوست ایرانی اور پاکستانی ہیں۔ میں بہت اچھا ایرانی کھانا بناتی ہوں۔ اگر میں نے کبھی شادی کی تو اپنی زبان بولنے والے سے کروں گی۔ ایسے شخص سے کروں گی جو میری طرح ایرانی فوک ڈانس کر سکے۔ میں نے ابھی پوری تعلیم حاصل نہیں کی۔ میرا ارادہ ہے کہ میں میڈیکل کروں۔ فی الحال تو میں پیسے جمع کر رہی ہوں۔ آج کل میں ایک جگہ نینی کا کام کر رہی ہوں۔ کیوں کہ کھانا بھی بہت اچھا بناتی ہوں اس لیے ان کا کھانا بھی بنا دیتی ہوں۔ جن تین بچوں کو میں سنبھالتی ہوں، وہ بڑے پیارے بچے ہیں۔ ابھی کل ہی ان کی سالگرہ تھی میں نے ان کے لیے تمام انتظامات کیے تھے۔ بعض مرتبہ میں کیٹرنگ بھی کرتی ہوں۔ میرے ایرانی کھانے سب کو بہت پسند آتے ہیں۔'' شیرین ذرا سے بھرے ہوئے جسم کی مالک ہے، آنکھیں کچھ چھوٹی ہیں مگر ان میں امید کی چمک ہے۔ ہم اسے کسی طرح ایران کی حسین عورتوں میں شمار نہیں کر سکتے مگر پھر بھی اس میں کشش ہے۔ ویسے تو وہ بہت زیادہ باتیں کرتی ہے مگر جیسے ہی اسے پتا چلا کہ میں کتاب کے سلسلے میں اس کا انٹرویو لے رہی ہوں تو وہ بہت محتاط ہوگئی۔ شاید ایسے حادثوں سے گزرنے والے زندگی کا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی مشکلات اٹھانے کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اسے کیا پتا تھا کہ تقدیر اسے شاہی خاندان سے اٹھا کر ایسی جگہ لا پھینکے گی کہ وہ دوسروں کے گھر میں آیا کے طور پر کام کرے گی مگر اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے زندگی تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ وہ زندگی کے ہر چیلنج کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اگرچہ اسے ایران سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہے مگر اس کے کلچر سے اسے بے پناہ پیار ہے۔ اس کے خیال میں کلچر کی جڑیں مذہب سے زیادہ گہری ہوتی ہیں۔ اس کے خیال میں مذہب تو سکھایا جا سکتا ہے مگر کلچر سکھایا نہیں جا سکتا۔ کلچر تو آپ کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ میں بھی اس کے اس خیال سے اتفاق کرتی ہوں۔ کلچر سیکھنے کے لیے تو نسلوں کو وقت کی بھٹی کی تپش سے گزرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر کلچر کی چمکتی چادر بن جاتی ہے اور پھر اس میں کسی اور کلچر کا تانا بانا بننے اور کسی اور کلچر کے گل بوٹے بنانے کے لیے بھی ایک وقت درکار ہوتا ہے۔

ایک ہی زندگی میں دو تین تہذیبوں کی ملاوٹ، ایک ہی شخص کا بیک وقت دو تین ملکوں سے تعلق رکھنا پاسپورٹ کی حد تک تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ وہ لبنانی ہونے کے باوجود خود کو اتنا ہی فرانسیسی بھی سمجھتا ہے تو یہ بات ذرا غور طلب ہے۔ زبانی باتیں کرنا بہت آسان ہے کیوں کہ اس کے لیے سائنس نے ابھی تک کوئی ایسا ٹیسٹ نہیں تیار کیا جو آپ کے دل کی بات بتا سکے اور آپ کی اصلیت کو آپ کے سامنے ثبوت کے طور پر پیش کر سکے۔ شاید کچھ ایسی ہی بات تھی کہ اس کتاب کے لیے میں نے اس موضوع کو منتخب کیا اور مختلف قومیت کے عام لوگوں سے مل کر ان کے خیالات کو رقم کیا۔ کیوں کہ صرف میرے اپنے خیالات کا اظہار یہ جاننے کے لیے کافی نہیں کہ اکثریت کے لیے اپنی پہچان کیا معنی رکھتی ہے۔

لوگوں کی آرا کے علاوہ اس کے لیے تاریخ کے اوراق بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس بات کو اگر پچھلی صدی کے اوائل سے شروع کیا جائے تو ہمیں ایک بہت قابلِ ذکر مثال جاپانیوں کی نظر آتی ہے۔ بہت سے جاپانی برسوں سے امریکا میں آباد تھے مگر جب امریکا، یورپ اور امریکا اور جاپان دو الگ الگ محاذ کھول لیتے ہیں تو اچانک جاپانی امریکی شہریت کے مالک ہوتے ہوئے بھی ایک الگ کیمپ میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ ان کی نسل، ان کا کلچر کیوں کہ امریکا میں رہنے والوں سے بالکل جدا تھا اس لیے ان سے ایک امتیازی سلوک ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ لڑائی اٹلی اور جرمنی سے بھی تھی مگر پھر بھی ان کے لیے اس طرح کے کیمپس نہیں بنائے جاتے۔ اور وجوہات کے علاوہ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جاپانی نہ صرف ایک مختلف نسل سے تعلق رکھتے تھے بلکہ وہ پوری طرح اپنی شکل اور کلچر کے لحاظ سے امریکی تہذیب میں ضم نہ ہو سکے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی وہ الگ پہچانے جاتے تھے۔ ان مثالوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ لاکھ کسی زمین پر کئی نسلیں گزار دیں مگر کیا وہ زمین آپ کو قبول کرتی ہے؟ یہی کچھ کینیڈا میں چینیوں کے ساتھ ہوا۔ ان کو کینیڈین ریلوے بنانے کے لیے کینیڈا لایا گیا۔ ان کے آنے کی وجہ وہ قحط تھا جو ہر دوسرے سال ان کو اپنی زمین چھوڑنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اٹھارویں صدی کی آخری دہائی

میں وہ یہاں آئے۔ یہاں کا سخت موسم ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ نہ جانے کتنی جانیں کینیڈا کی ریلوے بنانے میں ضائع بھی ہوئیں۔ یہ ریلوے لائن پہلی جنگِ عظیم سے پہلے مکمل ہوگئی مگر تیس سال بعد بھی ان کو کینیڈا کی قومیت نہیں دی گئی۔ اس وقت کینیڈا اور اس وقت کے حاکم برطانیہ کو ضرورت تھی کہ ان کے لوگ فوج میں جائیں نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی تعداد میں چینی فوج میں شامل ہوگئے۔ اس جنگ کے بعد کینیڈین حکومت نے فیصلہ کیا کہ ان تمام چینیوں کو کینیڈین شہریت دے دی جائے۔ جب یہ پیش کش کی گئی تو تمام چینیوں نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ جب تک ان کے تمام ان خاندانوں کو قومیت نہیں دی جائے گی جو صدیوں سے یہاں مقیم ہیں وہ بھی قومیت نہیں لیں گے۔ آخرکار کینیڈین حکومت کو ان کے اس مطالبے کو ماننا پڑا۔ (اس کے باوجود ان پر ٹول ٹیکس لگایا گیا۔)

اسی زمانے میں سکھ بھی سیکڑوں کی تعداد میں کینیڈا میں داخل ہوئے کسی نہ کسی طرح وہ ہانگ کانگ یا یورپ پہنچ جاتے اور وینکوور میں داخل ہوجاتے۔ کینیڈین حکومت نے ان کو روکنے کے لیے یہ پابندی لگائی کہ جو شخص بھی ہمارے ملک میں داخل ہوگا ضروری ہے کہ وہ اس جگہ سے سیدھا آئے جو اس کا آبائی ملک ہو۔ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے سکھوں نے پورے پورے بحری جہاز چارٹر کیے اور کینیڈا میں داخل ہوئے۔ سکھوں نے یہاں زیادہ تر کھیتی باڑی کا کام کیا۔ زیادہ تر سکھوں کی آبادی برٹش کولمبیا میں ہے۔ یہ لوگ اپنا کلچر اپنے ساتھ لائے اور آج تک اسے سنبھال کر رکھا۔ ان کے بچے آج بھی اپنی زبان بولتے نظر آتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے میں بھی یہ پیچھے نہیں رہے۔ آپ کو اکثر اسپتالوں میں یہ لوگ بڑی بڑی اسپشلسٹس کی سیٹوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ پوری طرح کینیڈین کلچر میں رچنے بسنے کے باوجود ہر جگہ یہ اپنے سکھ ہونے کی انفرادیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

ایک اور مثال افریقی نسل کی ہے۔ سولھویں صدی میں یہ ایک عام بات تھی کہ امریکن انھیں بحری جہازوں میں بھر کر اپنی زمین پر لے آتے تھے۔ ان جہازوں میں وہ انسان کی طرح نہیں بلکہ پنجروں میں بند کر کے جانوروں کی طرح لائے جاتے تھے اور ان سے پلانٹیشن پر کام کروایا جاتا تھا۔ جب وہ امریکن بندرگاہ پر اتارے جاتے تھے تو ان کی

باقاعدہ نیلامی کی جاتی تھی۔ اور انھیں زنجیروں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا۔ یہ وہ امریکا تھا جو اس وقت بھی جمہوریت کی بات کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جارج واشنگٹن جو امریکا کا پہلا صدر تھا اور جس نے آزادی کا نعرہ لگایا تھا وہ بھی غلاموں کی ایک فوج رکھتا تھا۔ افریقا سے لائی گئی غلاموں کی اس فوج کو اگرچہ دو سو سال بعد امریکا کے شہری ہونے کا درجہ دیا گیا مگر اس وقت بھی ان کے لیے الگ اسکول تھے، الگ چرچ تھے اور ان کو ہر ریسٹورنٹ میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان سے ایک امتیازی سلوک روا رکھا گیا اور آج اتنے طویل عرصے کے بعد بھی اگر امریکا کی غربت دیکھنی ہو تو کالوں کے علاقوں کا رُخ کرنا ہوگا۔ کیترینا میں آنے والا طوفان بہت سے ایسے مناظر دکھاتا ہے جو آج بھی ان لوگوں کی غربت کو آشکار کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں جانوروں اور پودوں پر بھی کافی تجربات کیے گئے ہیں، مثلاً افریقا سے کسی بحری جہاز میں ایک کریٹ میں شہد کی مکھیاں امریکا جا پہنچیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت کے ساتھ وہ مکھیاں خود بخود وہاں پنپنے لگیں۔ یہ مکھیاں مقامی مکھیوں سے قطعاً مختلف تھیں، یہ مکھیاں سائز میں امریکن مکھیوں سے زیادہ بڑی تھیں اور زیادہ aggressive تھیں اور کچھ ہی عرصے میں یہ مکھیاں وہاں کے رہنے والوں کے لیے ایک عذاب بن گئیں۔

اسی طرح چند خرگوش یورپ سے آسٹریلیا لے جائے گئے۔ ایک بات عجیب ہے کہ آسٹریلیا میں گوشت کھانے والے جانور نہیں پائے جاتے۔ یہ خرگوش جو پالتو جانوروں کی طرح لے جائے گئے تھے دیکھتے ہی دیکھتے تعداد میں اتنے زیادہ ہوگئے کہ لوگوں کو ان سے بچنے کے لیے fences لگانی پڑیں۔ قدرت نے جو چیز جس علاقے میں پیدا کی ہے وہ اس ہی جگہ میں زیادہ بہتر طور پر پنپ سکتی ہے اور دوسرے رہنے والوں کے لیے مصیبت کا باعث نہیں بنتی۔ پودوں یا فصل کی ایک اور مثال چاول کی ہے۔ امریکنوں نے ایرانی چاول کیرولینا میں لگایا۔ مگر اس پر باقاعدہ سائنسی تجربے کیے گئے اور پھر اسے پلانٹ کیا گیا۔ کیوں کہ اس پر خوب سوچ بچار کی گئی تھی اور اس جگہ کے مکینوں کے لیے یہ فائدہ مند چیز تھی اس لیے یہ وہاں پر خوب پنپی اور آج یہ چاول امریکا میں کھایا جاتا ہے۔ گویا اگر زمین

کسی چیز کو قبول کرتی ہے تو اسی صورت میں وہ اس زمین کا حصّہ بنتی ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اس نے جہاں بھی اپنی زمین چھوڑی اس کی وجہ مجبوری تھی۔ امریکا میں دو سو سال پہلے آئرلینڈ کے لوگ داخل ہوئے اس لیے نہیں کہ ان کو اپنا ملک پسند نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ ان کا ملک قحط کا شکار تھا۔ ان کی یہ نقل مکانی ان کے لیے کوئی آسان بات نہیں تھی۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد وہ اس قابل ہوئے کہ امریکا کی زمین نے انھیں قبول کیا۔

جانور پھر بھی شاید آسانی سے کسی دوسری زمین میں ایڈجسٹ ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے صرف صحیح آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کیوں کہ ان کے دل کا حال نہیں جانتے اس لیے ایسا سمجھتے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کے بارے میں ایک اور مثال اونٹوں کی ہے۔ کسی زمانے میں تقریباً دو ہزار اونٹ آسٹریلیا بھیجے گئے تھے۔ ان اونٹوں کے ساتھ ان کے ساربان بھی گئے۔ اونٹوں کو تو وہاں کی آب و ہوا راس آگئی مگر ساربان آج تک وہاں کے معاشرے میں رچ بس نہیں سکے۔

◇

کلچر کے علاوہ ایک اور چیز ہے جو قابلِ غور ہے اور وہ ہے وطن کی محبت یعنی patriotism۔ اس سلسلے میں، میں ایک مشہور خاتون کا حوالہ دوں گی جنھوں نے پولیٹیکل فلاسفی میں anarchist کے طور پر اپنی بہت سی تقریروں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایما گولڈمین (1869-1940) وہ کہتی ہیں، patriotism کیا ہے؟ کیا یہ اپنی جائے پیدائش سے پیار کا نام ہے؟ اپنے بچپن کی یادیں، امیدیں، خوابوں اور خواہشات کا تصوّر ہے؟ کیا یہ اس زمانے کے خواب ہیں جب آپ آسمان پر بادلوں کو دیکھ کر سوچتے تھے کہ آپ بھی اسی طرح ہواؤں پر ڈول سکیں؟ کیا یہ ماں کی آغوش ہے جب وہ آپ کو دنیا کی ہر پریشانی سے دور رکھ کر میٹھی لوریاں سناتی تھی غرض وطنیت شاید اتنی بڑی دنیا میں وہ چھوٹا سا حصّہ ہے جس سے آپ کی قیمتی اور خوش گوار یادیں وابستہ ہیں۔ کیا صرف یہی وطنیت ہے۔ آج جب امریکا میں ان تمام جگہوں پر فیکٹریاں بن چکی ہیں

اور وہ درخت اور جھرنے اب وہاں نہیں ہیں جن کے آپ خواب دیکھتے تھے تو اب ان جگہوں سے لگاؤ ختم ہو چکا ہے؟

پھر وطنیت کیا ہے؟ جیسا کہ ڈاکٹر سیموئیل جانسن کہتے ہیں کہ وطنیت آوارہ اور اوباش لوگوں کی آماج گاہ ہے۔ لیو ٹالسٹائی ہمارے زمانے کا اینٹی پیٹریوٹ کہتا ہے کہ وطنیت کے نام پر یہ وہ جذبہ ہے جس کے تحت تھوک کے حساب سے قاتلوں کی ٹریننگ کی جاتی ہے۔ (شاید سیموئیل جانسن اور لیو ٹالسٹائی سچ ہی کہتے ہیں۔ کیا ہر ملک کی اپنی فوج ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ اپنی دفاع کے علاوہ ہم لوگوں کو باقاعدہ دوسروں کو مارنے کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی ایک شخص کو قتل کرتا ہے تو اس کو سزا دی جاتی ہے اور جب لوگوں کو بموں کے ذریعے ختم کیا جاتا ہے تو مارنے والوں کو اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ ایک عام شخص ان باتوں کو اتنی گہرائی سے نہیں دیکھ پاتا مگر سیموئیل جانسن اور لیو ٹالسٹائی جیسے لوگ اس سوچ کو ایک شفاف آئینے کی طرح ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔)

وطنیت کے فلسفے کے تحت ہم دنیا کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیتے ہیں اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ ٹکڑا سب سے اچھا ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں اس ٹکڑے کی خاطر لوگوں کو قتل کروں کیوں کہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں۔ بچپن سے ہی ہمیں ایسی کہانیاں سنائی جاتی ہیں جس میں غیر لوگوں کو مارنے والے ہیروز ہوتے ہیں۔ بچپن ہی سے آپ کو جرمن، فرنچ، اٹیلین اور رشین کے خلاف کر دیا جاتا ہے۔ اور عمرِ بلوغت تک پہنچتے پہنچتے آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی لیے چنا ہے کہ آپ باقی دنیا کو ٹھیک کریں کیوں کہ عقیدے کے لحاظ سے آپ سے بہتر کوئی نہیں۔

یہ اس عورت کی سوچ ہے جو پچھلی سے پچھلی دہائی کے اوائل میں پیدا ہوئی تھی۔ دیکھا جائے تو دنیا آج بھی ویسی ہی ہے۔

اس وقت جب کہ موضوع وطنیت ہے تو میں ضروری سمجھتی ہوں کہ میں اپنے یہاں کے ایک صاحب کا ذکر کروں جن کا نام لطف اللہ خان ہے۔ میوزک سے اور آوازوں سے

بہت دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں اتنا کام کیا ہے کہ کراچی میں ان کے پاس ایک بہت بڑی لائبریری ہے جس میں آوازوں کا ایک خزانہ ہے۔ ان کے پاس ایسی ایسی ریکارڈنگس ہیں جو شاید بلکہ یقیناً ریڈیو پاکستان کے پاس بھی نہیں ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے ایک اور بات بتانی ضروری ہے کہ ان کی عمر ماشاء اللہ ترانوے سال ہے اور کسی جگہ بھی ان کی موجودگی محفل میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ انھوں نے میری کتاب کا کچھ حصّہ سنا تو ایک بڑی اچھی بات کہی۔ کہنے لگے کہ وقت کے دھندلکے میں ہر چیز کھو جاتی ہے۔ یاد صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جنھوں نے کچھ ایسا کام کیا ہو جو نہ مٹنے والا ہو۔ مذہب بھی وقت کے ساتھ آتے جاتے رہے مگر ہومر آج بھی زندہ ہے کالی داس کی ''شکنتلا'' آج بھی زندہ ہے۔ اسی طرح انھوں نے بہت سے لکھنے والوں کے نام لیے۔ یہ سب نام اور تصانیف اپنی جگہ مگر معذرت کے ساتھ میں ایک اور بات کہنا چاہوں گی کہ چند ایسے بھی نام ہیں جنھوں نے تاریخ کے اوراق پر خون ہی خون بکھیر دیا، وہ بھی زندہ رہیں گے۔ کیا کبھی ہٹلر اور چنگیز خان جیسے نام تاریخ سے مٹائے جاسکتے ہیں؟ سوال یہ نہیں کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ مگر جہاں تک تاریخ میں زندہ رہ جانے کا تعلق ہے تو زندہ تو وہ بھی ہیں جو انسانیت کے دشمن تھے۔ ہاں جہاں تک عالمی شہرت کا تعلق ہے وہ انھیں لوگوں کے لیے ہے جن کے لیے سرحدیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مگر اس کے باوجود ایک عام شخص اپنی پہچان کسی نہ کسی سرحد کی وجہ سے رکھتا ہے۔

آج کی ایک ناول نگار ایمتان اپنے بارے میں لکھتی ہے کہ اسے جب بھی ایوارڈز دیے گئے تو اسے یا تو چینی امریکن کہا گیا یا پھر صرف چینی ناول نگار کہا گیا۔ یعنی ہر صورت میں اس کی پہچان چینی تھی حالاں کہ اسے امریکا میں رہتے ہوئے ساٹھ سال سے اوپر کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اپنی کتاب The Joy Luck Club میں وہ لکھتی ہے کہ اس کی ماں امریکا اور ایمتان کے بارے میں کیا کہتی ہے؟

میں چاہتی تھی کہ میرے بچے امریکا اور چین کا بہترین امتزاج ہوں۔ ان کو امریکا کا ماحول ملے اور چینی قوم کی روایات اور کردار۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ دو چیزیں اکٹھی

نہیں کی جاسکتیں۔ میں نے اپنی بیٹی کو امریکن ماحول کے بارے میں بتایا کہ اگر آپ امریکا میں غریب ہوں تو اس میں شرم یا فکر کی کوئی بات نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہوگی کہ حکومت آپ کو وظیفہ دے گی اور یہ قطعاً نہیں ہوگا کہ آپ کو کسی درخت کے نیچے بے یارو مددگار بدھا بن کر بیٹھنا پڑے گا اور پرندے آپ پر بیٹ کرتے رہیں گے۔ امریکا وہ جگہ ہے جہاں آپ کو چھتری مل جائے گی۔

میری بیٹی نے یہ تمام باتیں سیکھ لیں لیکن میں اسے چین کی اخلاقیات کے بارے میں کچھ نہیں سکھا سکی، جیسے یہ کہ والدین کا ادب کرنا چاہیے، کیسے اپنی سوچوں کو دوسروں پر آشکار نہ کرو، اپنے آپ کو پہچانو اور پھر اپنی صلاحیتوں کو نکھارو، دکھاوا نہ کرو، اپنے آپ کو ارزاں یا سطحی نہ کرو، Never flashing it like a cheap ring اور یہ کہ اس بات پر فخر کرو کہ چینی تہذیب اور چین باعثِ عزت ہیں۔

ایک طرف ماں کو شکایت ہے کہ ایمتان چینی نہیں رہی اور دوسری طرف ایمتان کو شکایت ہے کہ اسے امریکنوں نے امریکی نہیں سمجھا۔ یہ ایک ایسی شکایت ہے جو شاید امریکا میں بسنے والے بیش تر خاندانوں کو ہے۔

◇

میں ناصر کے گھر کے پچھلے حصّے میں بہت اطمینان سے بیٹھی تھی۔ ساتھ کے گھر میں ایک چینی خاندان رہتا ہے۔ جب بھی میں اپنے بائیں طرف دیکھتی ہوں تو ان کے کمرے میں مجھے ایک بوڑھی خاتون بیٹھی نظر آتی ہیں۔ یہ خاتون اس زمانے کے چین سے تعلق رکھتی ہیں جب وہاں چھوٹی سی عمر میں بچیوں کے پیر باندھ دیے جاتے تھے۔ یہ خاتون ان ہی میں سے ایک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بہت کم چلتی ہیں اور اگر چلتی بھی ہیں تو بہت آہستہ آہستہ۔ اس کی ایک وجہ ان کی عمر ہے مگر دوسری وجہ ان کے پاؤں ہیں۔ مگر اس کے باوجود کبھی کبھی کھڑی ہوکر گھر میں جھاڑو دیتی ہیں اور کبھی کبھی ہاتھ میں ایک کپڑا لیے گرد جھاڑتی نظر آتی ہیں۔ اس گھر میں ان کے ساتھ ان کا بیٹا اور بہو رہتے ہیں۔ بیٹے کی

عمر کم از کم اسّی سال ہوگی۔ گویا یہ ایک سینئرز ہوم ہے۔ ہر روز ان کے کپڑے بڑے سلیقے سے ہینگرز میں لگا کر دھوپ میں سوکھتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اچھی طرح انگریزی نہیں بول پاتا۔ ہر ویک اینڈ پر ان کے یہاں ان کی بیٹی آتی ہے جو ان کے بہت سے کام کردیتی ہے۔ اس گھر میں اتنی خاموشی رہتی ہے کہ مجھے اس خاموشی سے خوف آتا ہے۔ ویک اینڈ پر ان کی بیٹی سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ اس کی دادی آج بھی چین جانے کے خواب دیکھتی ہے، بلکہ بعض مرتبہ تو خود کو چین ہی میں تصوّر کرتی ہے۔ کینیڈا کتنا بھی اس کے اپنے ملک سے بہتر ہو مگر اس کا اپنا ملک اپنا ملک ہے، چاہے اس ملک نے اس کے پاؤں باندھ کر ہی کیوں نہ رکھے ہوں۔

ابھی پرسوں ہی یعنی بارہ اگست کو میرے پاس زبیرالدین کا فون آیا کہ کیوں نہیں آپ اور حریم میرے اسٹوڈیو میں آتیں۔ ریڈیو کے چینل پر ہم اور آپ گفتگو کریں گے اور سامعین بھی ٹیلی فون کے ذریعے اس میں شامل ہو جائیں گے۔ موقع بھی اچھا ہے کہ چودہ اگست نزدیک ہے۔ وہ چودہ اگست جس سے نہ جانے کتنے لوگوں کے کتنے غم اور کتنی خوشیاں منسوب ہیں۔ شعیب جو صاف گوئی میں کچھ اتنا بڑھ کر ہیں کہ بات کہتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے کہ اس بات سے کسی کا دل ٹوٹے گا، انھوں نے کہا چودہ اگست تو خواب دیکھنے کا دن ہے۔ پوری قوم چودہ اگست کو خواب دیکھتی ہے، ناچتی ہے، گاتی ہے اور اگلے دن پھر اپنے کاموں میں مصروف ہوجاتی ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ اگلی سال گرہ تک خوابِ خرگوش کے مزے لوٹتی ہے۔ (بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی) میں نے کہا کم از کم ہمارے خوابوں پر تو پابندی نہ لگائیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سردار جعفری کا ایک جملہ یاد آگیا جو انھوں نے ''ایک خواب اور'' کے دیباچے میں لکھا ہے۔ ''خواب اور شکستِ خواب اس دور کا مقدر ہے اور نئے خواب دیکھنا انسان کا حق ہے، جس سے کوئی طاقت کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کرسکتا۔ مگر یقیناً وہ ان خوابوں کی بات کررہے ہیں جو سنجیدگی سے دیکھے جاتے ہیں اور جن کو پورا کرنے کے لیے ان پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ بہرحال ہم زبیر کے پاس پہنچے اور پی ٹی وی کے خبرنامے کے پچیس سال پُرانے قصّے دُہرائے۔ لوگوں کے بھی بہت

ٹیلی فون آئے۔ ایک صاحب کا فون تھا کہ وہ چالیس سال سے پاکستان سے باہر ہیں مگر آج بھی وہ پاکستان کو نہیں بھولے۔ خیر، اس سے پاکستان کی صحت پر کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اسے بھولے یا نہیں بھولے، یہ تو آپ کے ذاتی جذبات ہیں مگر خدا کرے آپ یہاں بیٹھ کر بھی ملک کے لیے کچھ کرتے رہے ہوں۔ ایسے ایسے لوگوں کے بھی فون آئے جنھوں نے کہا کہ آپ نے جب ٹی وی پر فلاں غلطی کی تھی تو میں نے ہی آپ کی تصویر کے ساتھ فلاں سرخی لگائی تھی۔ غرض اس ملاقات نے بڑی بڑی پُرانی یادوں کو زندہ کردیا۔

زبیرالدین پاکستان ٹیلی وژن کی ان شخصیات میں سے ہیں جن کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ زبیر، حریم اور میں اس زمانے کے لوگ ہیں جب میڈیا آزاد نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانے میں جب کراچی کے حالات بہت خراب تھے اور خبریں پڑھنے کے لیے ٹی وی اسٹیشن تک پہنچنا ایک جان جوکھوں کا کام ہوتا تھا اور پھر وہاں پہنچ کر یہ پڑھنا بھی کچھ آسان نہیں ہوتا تھا کہ کراچی میں حالات معمول کے مطابق تھے۔ اکثر لوگ ہم سے کہتے تھے تمھیں شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔ مگر جس طرح زبیر سے یہ سوال پوچھا گیا وہ ذرا خطرناک تھا۔ یہ بات غالبًا دس بارہ سال پہلے کی ہے۔ کراچی میں لسانی فسادات ہورہے تھے۔ ایک دن زبیر خبریں پڑھ کر نیوز روم میں پہنچے تو ایک فون آیا۔ فون کرنے والے نے زبیر سے کہا، ''یار تمھیں شرم نہیں آتی ایسی خبریں پڑھتے ہوئے۔'' زبیر نے کہا، ''بھئی میرا کام پڑھنا ہے جو مجھے دیتے ہیں میں پڑھ دیتا ہوں، نہ میں یہ خبریں بناتا ہوں نہ کچھ اور میرا ان سے تعلق ہے۔ میں تو پیٹ کی خاطر یہ کام کرتا ہوں۔'' دوسری طرف سے جواب آیا، ''کیا خیال ہے اگر اس پیٹ کو پھاڑ دیا جائے؟ نہ پیٹ رہے گا نہ خبریں پڑھوگے۔'' بات ختم ہوگئی۔ ٹیلی فون کرنے والے نے فون بند کردیا۔ دو دن بعد دن کے تین بجے کے قریب جب زبیر کسی کام سے نکلے تو چند لوگ انھیں گن پوائنٹ پر کہیں لے گئے۔ ٹی وی اسٹیشن سے فون آئے کہ بھئی زبیر کہاں ہیں؟ ان کی بیگم زیب نے کہا، وہ تو گھر سے جاچکے ہیں۔ فون آتے رہے، رات کے نو بج گئے زیب نے دیکھا کہ خبریں کسی اور نے پڑھیں۔ وہ پریشان ہوکر گھر سے نکلیں کہ کہیں کوئی ایکسیڈنٹ تو نہیں

ہوگیا۔ رات کے گیارہ بج گئے۔ بارہ بجے زبیر صاحب گھر واپس آئے، پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے انھیں بارہ بجے گھر چھوڑا اس وعدے پر کہ آئندہ وہ خبریں نہیں پڑھیں گے ورنہ ہر مرتبہ اٹھالیے جائیں گے۔ یہی وہ وقت تھا کہ زبیر نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

زبیر کی کہانی سننے کے بعد میں نے سوچا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں آپ ملک چھوڑنے کا الزام نہیں دے سکتے۔ ان لوگوں کے دل میں اب بھی وطن کی محبت ہے مگر زندہ رہنا تو ہر ایک کا حق ہے اور جب آپ کے اپنے لوگ آپ سے یہ حق چھین لیں تو پھر اس جگہ کو چھوڑنا ہی اچھا ہے۔ اگرچہ اتنی بڑی آبادی میں اگر ایک اور شخص ملک چھوڑ دے تو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر یقیناً اس ایک شخص کو ضرور فرق پڑتا ہے کہ اس کی اپنے ملک میں ایک پہچان تھی۔

زبیر بھی ان لوگوں میں سے ہے جو چودہ اگست انیس سو سینتالیس میں اپنے آباؤ اجداد کا گھر چھوڑ کر پاکستان آئے۔ دیکھا جائے تو یہ ان کی دوسری ہجرت ہے۔ بہت خوش قسمت ہوتی ہیں وہ نسلیں جو اپنے ملک کا ٹوٹنا نہیں دیکھتیں یا جنھیں کسی وجہ سے اپنی زمین کو چھوڑنا نہیں پڑتا۔ ملک ملک پھرنا، مختلف جگہوں پر رہنا اگر آپ کا شوق ہے تو ایک الگ بات ہے، اسے ایک ایڈونچر کہا جاسکتا ہے لیکن اگر ملک کے حالات ایسے ہوجائیں کہ آپ وہاں رہ نہ سکیں تو یہ ایک تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ جو لوگ اس عمل سے گزرتے ہیں ان کی شخصیات ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں، کچھ ایسی دراڑیں پڑجاتی ہیں جو کبھی نہیں بھرتیں۔ ایسے لوگ آپس کے برتاؤ میں اتنے نارمل نہیں رہتے۔ ایک شخص جو سینتالیس کے حادثوں سے گزرا تھا اس طرح کہ اس نے اپنے گھر اور باپ کو اس حادثے میں کھو دیا تھا، اس نے دس سال کی عمر میں کٹی ہوئی ٹرینز کو دیکھا تھا، دس سال کی عمر میں وہ ایک مرد بن گیا تھا جسے زندگی بھر اپنے خاندان کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس نے محنت کر کے ملک میں اپنا مقام بنایا۔ وہ ملک کے حالات سے دل برداشتہ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر آپ پاکستان سے اتنے ہی ناامید ہیں تو یہاں سے باہر جانے کا کیوں نہیں سوچتے۔ جواب ملا، ''میں اس ملک کو چھوڑوں گا نہیں۔ میں تو اپنے گھر میں بندوق میں

بارود بھر کر بیٹھوں گا تاکہ ہر اس شخص کو ختم کرسکوں جو مجھ سے پاکستان چھوڑنے کی بات کرے۔'' اس ایک جملے میں محبت کی انتہا بھی ہے اور نفرت اور غصّہ بھی ہے۔ وہ تمام لوگ جو اس ملک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں کاش وہ اتنا تو ٹھہر جائیں کہ کم از کم وہ آنکھیں بند ہوجائیں جنھوں نے بذاتِ خود اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھائی ہیں۔

◇

ٹورونٹو کی ایک عام سی شام تھی۔ اس وقت ساڑھے چھ بجے تھے۔ شہر کے ہمنگ برڈ ہال میں آج استاد ذاکر حسین کا پروگرام تھا۔ میں اور ملیحہ موسیقی کے شوقین تھے اور ہم دونوں وہاں جانے کے لیے تیار تھے۔ ہم فنچ اسٹیشن سے ٹرین میں بیٹھے اور یونین اسٹیشن پر اتر گئے۔ ہماری ہی طرح کی شکلوں کے بہت سے لوگ جگ مگ کپڑے پہنے ہمنگ برڈ کی طرف جا رہے تھے۔ پچھلے سال اسی ہال میں ہم جگجیت کو سننے گئے تھے۔ آج کے پروگرام میں زیادہ تر لوگ انڈین تھے جب کہ پچھلی مرتبہ کافی پاکستانی بھی تھے۔ آج کا پروگرام انڈین سیلیبریشن کے سلسلے میں تھا۔ پروگرام کا آغاز وقت پر ہوا اور یہ آغاز کینیڈین ترانے اور پھر انڈین قومی ترانے سے ہوا۔ کینیڈا کا ترانہ بھی کافی جذباتی تھا جس میں بڑی سادگی سے اپنی زمین کے لیے دعا تھی اور محبت کا اظہار تھا۔ کینیڈین ترانے کے ساتھ بھی گانے میں لوگ شامل تھے مگر جب انڈین ترانہ گایا گیا تو پورا ہال گونج اٹھا۔ اپنے ملک سے باہر ایسے موقعوں پر لوگوں کی محبت کچھ زیادہ ہی اُمڈ آتی ہے۔ ترانے کے بعد انڈینز کے علاوہ خود کینیڈا کے شہریوں نے بھی تقاریر کیں۔ انڈینز نے اپنے کلچر کی بات کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت یہاں آبادی کے لحاظ سے ایک تہائی ہندوستانی ہیں۔ ہماری تہذیب ہمارا کلچر اتنا rich ہے کہ ہم جہاں بھی جاتے ہیں ہمارا کلچر ہمارے ساتھ جاتا ہے۔ آج ہم جو پروگرام پیش کرنے جا رہے ہیں اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارا کلچر کتنا خوب صورت اور رنگین ہے۔ ہمارا راجستھانی کٹھ پتلیوں کا تماشا اتنا پُراثر ہے کہ اسے آپ بھول نہیں سکے۔ ہمارے کلچر میں موسیقی سرِفہرست ہے، موسیقی جو روح کی غذا ہے۔ ٹورونٹو میں جگہ

جگہ ہمارے خوب صورت اور سحر انگیز مندر سب کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

کینیڈینز نے بھی اپنی تقاریر میں ہندو کلچر کی تعریف کی اور کہا کہ جس دن شیو مندر میں گاندھی جی کے مجسمے کی نقاب کشائی ہوئی اس دن میں نے دیکھا کہ گاندھی جی کا منہ ہماری سب سے مصروف شاہراہ کی طرف تھا۔ اور مجھے خوشی ہوئی کہ گاندھی جیسا جمہوریت کا حامی ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ان تمام رسمی تقاریر کے بعد اصل پروگرام شروع ہوا جس میں راجستھان کی کٹھ پتلیاں تھیں جو زرق برق لباس پہنے ناچ رہی تھیں۔ میں کہ خود راجستھان جاچکی ہوں اور وہاں کی غربت سے آشنا ہوں۔ جے پور میں، میں نے رنگین لباس تو ضرور دیکھے مگر کہیں وہ خوشی نہیں دیکھی جس کا اظہار اس پروگرام میں تھا۔

جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جمنا اور گنگا کی تہذیب بہت قدیم اور مضبوط ہے اور یقیناً یہ دوسری تہذیبوں کو نگل لیتی ہے۔ ہندو مذہب تقریباً پانچ ہزار سال پرانا ہے۔ ان ہزاروں سال میں نہ جانے کتنے مذاہب ہندوستان میں آئے مگر اس نے ان کو نگل لیا۔ آج بہت کم جین یا بدھ مت سے تعلق رکھنے والے لوگ وہاں نظر آتے ہیں۔ صرف اسلام وہ مذہب ہے جسے ہندو ازم ختم نہیں کرسکا۔ کسی بھی دوسری تہذیب میں ضم ہونے کے لیے بہت سی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ آیا آپ کا ورثہ اس تہذیب سے زیادہ پرانا اور مضبوط ہے جس میں آپ ضم ہونے جارہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو آپ کو ان جیسا ہونے میں زیادہ وقت درکار ہوگا۔ میں نے اپنی اس کتاب میں جگہ جگہ چینی قوم کا ذکر کیا ہے جو تین نسلیں کینیڈا اور امریکا میں گزارنے کے باوجود اپنی پہچان برقرار رکھے ہوئے ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس قوم کی تہذیب بہت پرانی ہے۔

اس کے لیے میں شاعر کمال الدین رستمی بیجاپوری کی ایک تحریر کا حوالہ دوں گی جو انھوں نے زبان کے بارے میں لکھی ہے۔ ایشیا کے شمال مشرق میں واقع چینی قوم نے نہ صرف نطق کو صیقل کیا بلکہ اشکال کے ذریعے فکرِ انسانی کو باقاعدہ تحریری زبان دے کر انسانیت کو مالا مال کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کو اپنے ہونے اور اپنے آباؤ

اجداد پر فخر ہو اور آپ کو اعتماد ہو کہ آج کے دور میں آپ کی کوئی حیثیت ہے۔ یہ فخر اور یہ اعتماد آپ میں belonging کا احساس پیدا کرتا ہے۔

ایک اور وجہ انفرادی بھی ہوسکتی ہے، جیسا یہ کہ آپ اپنے ملک میں کن تجربات سے گزرے ہیں، آپ اپنے ملک میں کس حیثیت کے حامل تھے، آپ کا اپنے ملک میں معاشرے کے کس طبقے سے تعلق تھا۔ اس کے علاوہ جب آپ اپنے ملک سے نئے ملک میں آئے تو کیا آپ اچانک معاشی اور رہنے سہنے کے لحاظ سے بہت بہتر ہوگئے؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً آپ اس نئی تہذیب میں زیادہ آسانی سے گھل مل جائیں گے۔ نئے ماحول میں آپ کے اپنے تجربوں کے علاوہ یہ بھی اہم ہے کہ نئے لوگ نیا ماحول کس طرح آپ کو اپناتا ہے۔

ان تمام چیزوں کو جب میں مدِنظر رکھتی ہوں تو ایک بہت دلچسپ مگر تکلیف دہ کہانی مجھے ڈاکٹر احتشام کی نظر آتی ہے۔ احتشام کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب وہ بارہ سال کا تھا۔ یہ زمانہ انیس سو اناسی کا تھا۔ میں کراچی کے ڈیفنس اسکول میں پڑھاتی تھی۔ احتشام مانچسٹر سے آیا تھا اور وہ صرف دو زبانیں جانتا تھا۔ انگریزی اور پنجابی۔ اور دونوں زبانیں کچھ اس طرح سے بولتا تھا کہ سب لڑکے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ مانچسٹر میں پیدا ہوا تھا، اس کی پیدائش کے بعد زندگی کے اگلے دس گیارہ سال اس کے خاندان نے مانچسٹر میں گزارے مگر پھر مارگریٹ تھیچر کے زمانے میں نسلی تعصبات اتنے بڑھے کہ وہاں رہنا مشکل ہوگیا۔ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگائی جانے لگی، سڑک پر چلنا مشکل ہوگیا۔ خاص طور پر بچوں کی زندگی مشکل ہوگئی۔

آج جب اٹھائیس سال بعد میں احتشام سے ملتی ہوں تو احتشام ڈاکٹر بن چکا ہے۔ اونچے قد والا یہ چاکلیٹ ہیرو اس احتشام سے قطعاً مختلف ہے جو کلاس کے ایک کونے میں ڈرا ڈرا خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ مگر اس کے چہرے اور لہجے میں ایک چیز جو بہت نمایاں ہے وہ ہیں اس کی حساس آنکھیں اور نرم لہجہ۔ وہ مجھ سے اردو میں بات کرتا ہے اور اردو بولنے میں جو جھجک ہے وہ آج بھی اس کی زبان میں ایک لکنت پیدا کرتی ہے۔ آج جب میں اس سے اس کی زندگی کے بارے میں بات کرتی ہوں تو اس کے لہجے میں ایک

شکایت ہے، ایک دُکھ ہے جو اس کی زندگی کے کینوس پر پس منظر میں ایک درد بھری موسیقی کی طرح ابھرتا ہے۔ مجھے اسے دیکھ کر سلمان کا جملہ یاد آتا ہے، سلمان جو کہ سان فرانسسکو میں رہتا ہے، اپنی گفتگو میں وہ بار بار ایک جملہ دُہراتا ہے ''آنٹی لائف از ٹف۔'' مگر احتشام صاف صاف یہ جملہ نہیں کہتا، اس کی باتیں سمبولک ہیں اور میں سوچتی ہوں کہ اگر یہ شخص شاعر ہوتا تو نہ جانے اس کی شاعری کتنے لوگوں کو رُلا دیتی۔ کیا لوگ اتنے بہادر بھی ہوتے ہیں؟ احتشام زندگی کے جس حصے میں بھی داخل ہوتا ہے اسے کوئی نہ کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جو اس کی زندگی کو مشکل میں ڈال دیتا ہے۔ آج اپنی کہانی بتاتے ہوئے وہ بہت جذباتی ہوجاتا ہے۔ آنٹی جب میں یاد کرتا ہوں تو مجھے وہ مانچسٹر یاد آتا ہے جب باہر جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ میں جس اسکول میں پڑھتا تھا وہاں مجھے میرے رنگ کی وجہ سے کم تر اور عجیب سمجھا جاتا تھا۔ اسکول کے بچے مجھ سے پوچھتے تھے کہ تم یہاں کیا کررہے ہو؟ تم تو ہمارے جیسے نہیں ہو۔ اگر میں بازار کچھ لینے کے لیے جاتا تھا تو ایک لڑکا مسلسل میرا پیچھا کرتا تھا اور مجھے پاکی کے نام سے پکار کر مزید گالیاں بھی دیتا تھا۔ میں اس لڑکے سے اس حد تک خوف زدہ تھا کہ جب میری امی مجھے بازار سے کچھ لانے کو کہتیں تو میں ڈر جاتا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ لڑکا جیسے ہی مجھے سڑک پر دیکھے گا میرا پیچھا کرے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتا ہوں جس کا نام پاکستان ہے، اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میرے والد نے واپس پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو میرے دل میں ایک محبت کی چنگاری جاگی۔ میں اس جگہ جانے والا تھا جہاں سب لوگ میرے جیسے تھے، جہاں پاکی کوئی گالی نہیں تھی، جہاں وہ لڑکا نہیں تھا جو میرے انتظار میں رہتا تھا کہ کب میں گھر سے نکلوں اور وہ میرا پیچھا کرے، جہاں وہ سکن ہیڈز نہیں تھے جن کو دیکھ کر ہم سڑک چھوڑ دیتے تھے۔

میرے والد مانچسٹر میں اکاؤنٹس میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت struggle کی۔ میرے والد حیدرآباد میں رہتے تھے۔ انھوں نے اردو اور عربی میں ماسٹرز کیا تھا۔ اسی زمانے میں انھیں مانچسٹر میں ایک نوکری کی آفر ملی۔ یہ نوکری ایک

چھوٹی سی یونی ورسٹی میں پڑھانے کی آفر تھی۔ وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ ان کے لیے نوکری نہیں ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ایک فیکٹری میں نوکری کرنی پڑی یہ ایک اسٹیل کیبلز بنانے کی فیکٹری تھی جس کا نام Frankastine تھا۔ کئی برس وہ کیبلز کا کام کرتے رہے۔ اس وقت صرف میری بڑی بہن سمینہ تھی۔ میرے والد نے پرائیویٹ طور پر چارٹرڈ اکاؤنٹس کی تیاری کی، امتحان پاس کیا اور ان کو مانچسٹر اسٹیل میں ایک اچھی جگہ نوکری مل گئی۔ جب آئرلینڈ میں حالات خراب ہوئے تو پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کراچی میں نوکری ملی اور ہم سب کشتیاں جلاکر پاکستان چلے آئے۔ اب میں سوچتا ہوں تو جو پندرہ سال میں نے پاکستان میں گزارے وہ میری زندگی کے بہترین سال تھے۔ اگرچہ اس میں بھی مجھے اپنی identity کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی پڑی۔ جب میں پاکستان میں ڈیفنس اسکول پہنچا تو وہاں ایک بار پھر میں اجنبی تھا۔ میں یا تو پنجابی جانتا تھا یا پھر انگریزی۔ اور انگریزی بھی ایک ایسے ایکسنٹ میں جس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ گویا ایک بار پھر اپنے ملک پاکستان میں، میں مس فٹ تھا۔ وہاں بھی مجھے ایک ایسا لڑکا مل گیا جو مجھے دن رات تنگ کرتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ کچھ غنڈے یا bulleys پائے جاتے ہیں۔ میری کلاس میں بھی ایک ایسا لڑکا تھا جو سب کو تنگ کرتا تھا اور پھر میں تو اس کے لیے ایک بہت اچھا ٹارگٹ تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اسکول جانا میرے لیے ایک عذاب ہوگیا۔ شکر ہے کہ میری کلاس میں آپ کا بیٹا عامر تھا جس نے مجھے اس لڑکے سے بچایا۔ عامر نے میری خاطر اس سے کئی لڑائیاں مول لیں۔ اور آخرکار میں نے اپنی جگہ بنالی۔ پڑھائی میں، میں بہت اچھا تھا اس لیے جلد ہی میں نے اسکول میں ایک نمایاں جگہ حاصل کرلی۔ اب میں نے تھوڑی تھوڑی اردو بھی سیکھ لی تھی، اگرچہ اب بھی میرے لیے سب سے مشکل مضمون اردو ہی تھا۔

زندگی کتنی اچھی گزر رہی تھی مگر کیا معلوم تھا کہ ابھی زندگی کے ترکش میں ہمارے لیے بہت سے تیر باقی تھے۔ میرے والد کی نوکری بہت اچھی تھی۔ وہ ایک فائننس کمپنی میں کام کرتے تھے۔ میرا میڈیکل کا وہ آخری سال تھا۔ یوں کہیے کہ صرف آنکھوں کی

سوئیاں باقی تھیں کہ ایک دن اچانک آفس میں میرے والد کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اسی وقت ختم ہوگئے۔ راتوں رات، میں بہت بڑا ہوگیا۔ میں اچانک بیٹے سے باپ بن گیا۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں اور مجھ سے چھوٹے ٹرپلیٹس دو بھائی اور ایک بہن میری ذمّے داری بن گئے۔ میرا میڈیکل کا آخری سال بڑا مشکل ہوگیا۔ مجھے ٹیوشن کرنی پڑی تب کہیں جاکر میرا وہ سال پورا ہوا۔ شاید یہ میرے والد کی موت ہی تھی جس کے باعث میرے دونوں بھائی غلط صحبت میں پڑگئے۔ یا یوں کہہ لیں کہ ان کے ایسے دوست بن گئے جن کے باعث وہ پاکستان کی پولیس کی نظر میں آگئے۔ انھوں نے اسکول سے بھاگنا شروع کردیا جس کے بارے میں بہت عرصے بعد میری امی کو اور مجھے معلوم ہوا۔ شاید امی اپنے غم میں اتنی مبتلا تھیں کہ انھیں خیال ہی نہیں آیا کہ ان کے چھوٹے بیٹے کچھ ناشائستہ کاموں میں مصروف ہیں۔ اور پھر ایک دن میرا بھائی کسی کام سے نیچے گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ کافی دیر انتظار کے بعد میری امی نے مجھے فون کیا اور ہم نے اس کی تلاش شروع کی۔ نیچے کے دُکان داروں سے پتا چلا کہ اسے پولیس اٹھا کر لے گئی ہے۔ پولیس سے پوچھا تو انھوں نے کچھ بتانے سے انکار کردیا۔ تین دن کے بعد ہمیں اس تھانے کا پتا چلا جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ اس کے گرفتار ہونے کی وجہ وہ دوست تھا جو گاڑیاں چوری کرتا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک بڑے آدمی کا بیٹا تھا اس لیے اسے گرفتار نہیں کیا جاسکتا تھا اور میرے بھائی کو گرفتار کرنا آسان تھا اس لیے پولیس خانہ پُری کے لیے اسے اٹھا کر لے گئی۔ پھر وہی سفارشوں کا چکر شروع ہوا۔ ایک وکیل کیا گیا اور ہم اپنے چوٹوں سے لہولہان بھائی کو گھر لے آئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کہیں بھی سکن ہیڈز اور اس غنڈے سے نہیں بچ سکتا جو مانچسٹر میں میرا پیچھا کرتا تھا۔ میں نے اپنے بھائی سے سوال کیا کہ کوئی کسی کو اتنی بے دردی سے کیسے مارسکتا ہے تو اس نے بتایا کہ پولیس والے جب رات کو پی پلا کر واپس آتے تھے تب تھانے میں موجود لوگوں کی پٹائی کرتے تھے۔ مگر میں پولیس والوں کی حسِ مزاح کی داد دیتا ہوں کہ ان کے تھانے میں ایک بڑا سا جوتا رکھا تھا جس کے تلے پر لکھا تھا ''آجا میرے بالما تیرا انتظار ہے۔'' میرا بھائی تو رہا ہوگیا مگر اس کے بعد ہر روز کوئی نہ کوئی پولیس والا

ہمارے گھر پر موجود ہوتا تھا۔ ہمارے وکیل نے اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کی مگر ہم ان پولیس والوں کے روز روز ڈرانے سے چھٹکارا نہیں پاسکے۔ آخرکار یہی فیصلہ کیا گیا کہ اپنے بھائی کو انگلینڈ بھیج دیا جائے۔ اس کا وہاں جانا مشکل بھی نہیں تھا کہ وہ وہاں کا شہری تھا۔ گویا اپنوں سے نکل کر ہم پھر غیروں کی دنیا میں جارہے تھے۔ میرا میڈیکل مکمل ہوچکا تھا۔ مجھے جو نوکریاں مل رہی تھیں وہ چار پانچ ہزار سے زیادہ کی نہیں تھیں۔ بہت ہوتا تو تین سال بعد میں آٹھ ہزار تک کمارہا ہوتا۔ ان پیسوں میں ہمارا گزارا ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے بھی لندن کی راہ لی۔ یہاں پر میں نے ایک دیسی کی دُکان میں کام کیا۔ اس عرصے میں، میں نے بڑے بڑے کریٹ اٹھائے اور اپنی جسمانی طاقت سے بڑھ کر کام کیا۔ اور ظاہر ہے میں (وہ مجھے اسّی پاؤنڈ مہینہ دے رہا تھا) ان اسّی پاؤنڈ میں سے میں اپنی امی کو بھی کچھ نہ کچھ بھیجتا رہا۔ اپنے مالک کی تمام زیادتیاں برداشت کیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی میڈیکل کی کوششوں کو جاری نہ رکھوں۔ وہ مجھے اپنی دُکان کا منیجر بنانا چاہتا تھا۔ اسی عرصے میں، میں نے آئرلینڈ میں نوکری کے لیے بھی درخواست دے دی۔

آنٹی کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ لوگ اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں؟ میرا مالک مجھ سے اتنا کام لیتا تھا کہ میں تھک کر چور ہو جاتا تھا۔ میرے ذمے بڑے بڑے کریٹ اٹھانے بھی تھے، اسٹور میں چیزوں کو ترتیب سے رکھنا بھی تھا اور پھر اکاؤنٹس سنبھالنا بھی تھا۔ میں صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک کام کرتا، میرے لیے کسی قسم کا اوور ٹائم نہیں تھا اور پھر رات کے گیارہ کے بعد بھی وہ مجھے خوشی سے گھر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چھ مہینے بعد مجھے آئرلینڈ والوں نے بلالیا، شرط یہ تھی کہ مجھے کام کرنے کی اجازت ہوگی مگر مجھے پیسے صرف اس صورت میں ملیں گے کہ مجھے کال پر بلایا جائے۔ میں جب آئرلینڈ پہنچا تو میرے پاس صرف آٹھ سو پاؤنڈ تھے۔ دو مہینے کے بعد گھر کا کرایہ دینے کے بعد میرے پاس کچھ نہیں بچا اور دو مہینے میں مجھے ایک مرتبہ بھی کسی کال پر نہیں بلایا گیا۔ میں اپنے سپروائزر کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ یا تو مجھے کال پر بھیجو یا مجھے کچھ پیسے ادھار دے دو ورنہ میں تو بھوکا مرجاؤں گا۔ رحم دل انسان تھا،

اس نے مجھے اکاؤنٹس سے کچھ پیسے دلوائے تب کہیں جاکر میرا وقت گزرا۔ مگر میں نے دیکھا کہ دوسرے ملک میں رہنا بہت مشکل کام ہے، میں چاہے اپنے کام میں کتنا بھی اچھا تھا مگر ہر جگہ میری راہ میں روڑے اٹکائے گئے اور بالکل صاف صاف کہہ دیا گیا کہ جہاں تک پروموشنز کا تعلق ہے وہ تمھیں ہم نہیں دیں گے کیوں کہ اس کے زیادہ حق دار ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے کینیڈا میں اپنی قسمت آزمانے کا سوچا۔ یہاں پر مزید پڑھائی کرنی پڑی مگر کم از کم یہاں پر کوئی آپ کی راہ نہیں روکتا۔ یہاں پر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ تین سال رہا۔ میری امی، میری بہنیں اور بھائی سب لندن میں ہیں، اس لیے سوچا ایک بار پھر وہاں رہنے کی کوشش کی جائے۔ مگر نائن الیون کے بعد وہاں کے حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔ انھیں ہم جیسے پڑھے لکھوں پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ خاص طور پر بچوں کے لیے بہت مشکل ہے۔ خاص طور پر آئرلینڈ میں میرا بیٹا واحد بچہ تھا جو اپنی کلاس میں ایک مختلف رنگ کا تھا۔ وہ اسکول جاتے ہوئے خوف کھاتا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا تھا۔ آخر ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ ہم کینیڈا واپس چلے جائیں۔ کینیڈا ایسی جگہ ہے جو ہر قومیت کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ یہاں پر ان کے اپنے لوگ تو کم ہی نظر آتے ہیں۔

یہاں پر مجھے تنخواہ بھی بہت اچھی مل رہی ہے۔ میری سب بہنوں کی شادی ہو چکی ہے، بھائی بھی اپنی اپنی نوکری کرتے ہیں۔ مشکل وقت گزر چکا ہے۔ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو زندگی کے سب سے اچھے سال وہ تھے جو میں نے پاکستان میں گزارے۔ اگر آج مجھے پاکستان میں اس سے آدھے پیسے بھی ملیں تو میں وہاں جانے کو تیار ہوں۔

احتشام کے چہرے پر ایک سوچ تھی جیسے وہ تصوّر میں پاکستان جا پہنچا ہو اور ساتھ ہی چہرے پر اپنی زمین سے جدا ہونے کا ایک دُکھ تھا۔ کیا سچ تھا اور کیا جھوٹ؟ یہ اسے خود بھی پتا نہیں تھا۔ اپنے ملک جانا بھی چاہتا تھا اور اس کے لیے شرائط بھی بہت تھیں۔ بے چارہ پاکستان سب کی امیدوں پر کیسے پورا اتر سکتا ہے۔ وہ تو محض ایک زمین ہے، جب اس کی آبیاری کرنے والے مزدور ہی ملک میں نہ رہیں تو وہ خود بخود کیسے ترقی کر سکتا

ہے۔ اگر تمام انجینئر، تمام ڈاکٹر خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنی زمین چھوڑ دیں کبھی واپس نہ پلٹنے کے لیے تو اس زمین کا کون رکھوالا ہوگا؟

آج احتشام ایک مینشن نما گھر میں رہتا ہے۔ اس کے تین بیٹے ہیں۔ ڈاکٹر احتشام جو اب ڈیلٹنز کے اس اپارٹ منٹ میں نہیں رہتا جہاں سے اس کے بھائی کو بغیر کسی وجہ یا وضاحت کے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ اس کے گھر میں ایک ملازمہ ہے جو اسے اور ریما کو ہر آرام فراہم کرتی ہے۔ اس کے بچے اچھے اسکول میں جاتے ہیں جہاں کسی خودکش حملہ آور بم بار کے گھسنے کا خطرہ نہیں، اس کا اور اس کے بچوں کا مستقبل محفوظ ہے۔ میں اسے کیسے یہ مشورہ دے سکتی تھی کہ وہ واپس پاکستان آجائے؟

◇

یہ ذکر تو ان لوگوں کا ہے جو ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ ان لوگوں میں جوان بھی شامل ہیں اور عمر والے بھی۔ لیکن جب میں روٹس کا ذکر کرتی ہوں تو جی چاہتا ہے کہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ آج کا نوجوان اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ بہت عرصے بعد مجھے موقع ملا کہ میں کوئی تقریری مقابلہ سننے گئی یہ مقابلہ بیچ لگژری میں تھا جس میں کراچی کے علاوہ پنجاب اور سرحد کے طلبہ بھی حصّہ لے رہے تھے۔ Vision of Pakistan —My Home Land (تصوّرِ پاکستان— میرا پاکستان)۔ اگر میں اپنے پُرانے معیار سے دیکھتی ہوں تو یقیناً یہ تقاریر اتنی اچھی نہیں تھیں۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھی کہ نہ جانے کتنے عرصے بعد طلبہ کسی تقریری مقابلے میں حصّہ لے رہے تھے۔ کسی نے موضوع کا تعارف نہیں کرایا۔ تقاریر میں جوش زیادہ اور ہوش کم تھا۔ اچھا ہوتا کہ یہ تقاریر کی جگہ مباحثہ ہوتا تاکہ طلبہ ایک تصویر کے دو رُخ دکھا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقاریر صرف منفیت کا رنگ لیے ہوئے تھیں۔ کسی نے بھی ایک جملہ پاکستان کی تعریف میں نہیں کہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے تقاریر کا موضوع صرف پاکستان کی برائی کرنا تھا۔ کسی نے یہ نہیں بتایا کہ وہ پاکستان کو کیسا دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے شاید اب لوگوں نے خواب دیکھنے بھی چھوڑ دیے ہیں۔

اس محفل کے ایک مہمان تھے جناب مظفر علی شاہ، اسپیکر صوبائی اسمبلی سندھ۔ ان کی تقریر بھی بہت تعمیری تھی۔ مگر مہمانِ خصوصی مہدی مسعود کی تقریر سب سے مختلف تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا تعلق لکھنؤ سے تھا اور وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے پاکستان کو بنتے دیکھا۔ میری جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ پاکستان کسی بھی دور سے گزرا، میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا کہ یہ ختم ہوجائے گا۔ میں ہمیشہ پُرامید رہا اور آج بھی پُرامید ہوں۔ قومیں مشکلوں سے ضرور دوچار ہوتی ہیں مگر ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔ جب پاکستان بنا تو پاکستان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ کیا ہمارے پاس انڈیا کی طرح یونی ورسٹیاں تھیں یا کارخانے اور فیکٹریز تھیں؟ کیا ہمارے پاس کوئی آئین تھا؟ لوگ سمجھتے تھے کہ ہم تین مہینے سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتے مگر ہم نے کوشش کی اور یہاں تک پہنچے۔ یہ کہنا کہ ہمارے پاس فخر کرنے کے لیے کچھ نہیں، یہ غلط ہوگا۔ شاہراہِ ریشم کو دیکھیں جہاں ہر کلومیٹر پر ایک شخص نے جان قربان کی، کیا انھوں نے اپنے آج کو ہمارے کل کے لیے قربان نہیں کیا۔ میں آج کے نوجوان سے کہوں گا کہ مایوسی کفر ہے۔ اپنے رویوں میں امید اور کوشش کی شمعیں جلائیں، اپنے ملک کی بقا پر شک نہ کریں اور دُنیا کا مقابلہ کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے میں برداشت اور صبر پیدا کریں۔ دوسروں کو بُرا نہ سمجھیں، یہ نہ سمجھیں کہ جو آپ کہتے ہیں صرف وہی صحیح ہے۔ ہوسکتا ہے اور لوگوں کی آرا بھی قابلِ غور ہوں۔

جہاں میں کوئی ہمارے سوا بھی ہو شاید
ہم اپنے آپ سے باہر نکل کے دیکھیں تو

◇

ہجرت ایک ایسی چیز ہے جس کا تاریخ میں جگہ جگہ ذکر ملتا ہے۔ ایک مسلمان جب ایک بڑی ہجرت کی بات کرتا ہے تو وہ ہجرت حضرت محمدﷺ کی ہجرت تھی۔ اس ہجرت کی وجہ بھی غیر محفوظ ہونا تھا۔ مگر وہ ہجرت اس لحاظ سے مختلف تھی کہ وہ فیصلہ ایک پورے گروہ کا فیصلہ تھا۔ جس جگہ وہ ہجرت کرنے والے تھے اس جگہ انھیں آنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس ہجرت میں زبان اور کلچر کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ وہ ہجرت نہیں تھی جس میں آپ اکیلے اپنا ملک چھوڑتے ہیں۔ آج جب ہم پُرانی تہذیبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اپنے ملک میں موہنجودڑو کے کھنڈرات نظر آتے ہیں جہاں سے لوگوں کی منتقلی کی وجہ دریا کا رُخ بدلنا تھا۔ میں جن لوگوں کے بارے میں بات کررہی ہوں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنا ملک اس لیے چھوڑتے ہیں تاکہ ان کی اگلی نسل ایک بہتر مستقبل گزار سکے۔ مگر کیا یہ ہجرت اتنی ہی دل فریب اور دل کش ہے جتنا اس کا تصوّر کیا جاتا ہے؟ اس ہجرت کے لیے انسان ایک نئی زبان سیکھتا ہے۔ اس ملک کے کلچر اور اخلاقیات سے واقفیت پیدا کرتا ہے اور پھر ایسا بھی محسوس کرتا ہے جیسے اس کا اپنا ماضی خطرے میں ہے، اس کی اپنی identity خطرے میں ہے۔ ہجرت کرنے والا اپنی شخصیت کو ٹکڑوں میں ہوتا محسوس کرتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ یا تو اس ملک کے ساتھ بے وفائی کررہا ہے جس کا وہ باشندہ تھا یا پھر وہ اس ملک کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کر پارہا جہاں اس نے ہجرت کی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے اندر ایک تلخی اور بدمزگی کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کا بچپن، اس کے پیارے اس کا آبائی ماحول ان سب کا چھوڑنا اس میں ایک یاسیت کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ وہ یادیں جو زبان، مذہب، ادب اور موسیقی سے متعلق ہوتی ہیں وہ ان سے کبھی الگ نہیں ہوسکتا۔

دوسری طرف وہ ملک جہاں آپ ہجرت کرتے ہیں، اس کے بارے میں آپ کے احساسات اتنے واضح نہیں ہوتے۔ آپ دوسری زمین پر ایک بہتری کی امید لے کر داخل ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں بھی آپ میں ایک جھجک اور ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو آپ کو reject کردیا جائے، ایسا نہ ہو کہ معاشرہ آپ کو حقیر سمجھے۔ دل کی گہرائیوں سے وہ چاہتے ہیں کہ راتوں رات اس ماحول میں ضم ہوجائیں۔ مگر ان کا لہجہ، ان کے نقوش، ان کی رنگت ان کی کوششوں کے باوجود ان کے لیے رُکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔ اپنی پہچان کی لیے اتنی آسان بات نہیں۔ مگر ان ہی لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی اقدار کو کچھ اس طرح مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں کہ وہ انتہا پسندی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو مہاجرین کی دو قسمیں ہوجاتی ہیں اور دونوں قسمیں انتہا پسند ہوتی ہیں۔

ایک انتہا پسند وہ ہیں جو دوسرے ملک کو ایک سادے کاغذ کی طرح سمجھتے ہیں جس پر کوئی بھی جو تحریر چاہے لکھ سکتا ہے اور اس کے خیال سے اس کے لیے اسے اپنے میں کوئی تبدیلی نہیں کرنی ہوتی، نہ اپنی عادتوں میں اور نہ اپنے عمل اور فعل میں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ میزبان ملک کے کچھ قوانین، اقدار اور ثقافتی قوانین ہیں جن پر اسے عمل کرنا ہے۔ وہ اس سوچ پر اس درجہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنی آبائی اقدار کی مکمل نفی کرتے ہیں۔ اور اپنی اس پہچان کو مکمل طور پر مٹا دینا چاہتے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ یقیناً بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو ان دونوں رویوں کے درمیان کی راہ نکالتے ہوں گے۔ اور درمیانی راہ یہ ہوگی کہ آپ ذہنی طور پر خود کو تیار کریں کہ اپنے آبائی ملک سے کم سے کم ذہنی سامان کلچر کی صورت میں لے کر چلیں اور میزبان ملک کے کلچر کو نہ صرف خوش آمدید کہیں بلکہ کوشش کریں کہ کم سے کم اس کی نفی کی جائے۔

لیکن اگر یہ سب کچھ اتنا ہی آسان ہوتا جتنا لکھنے میں آسان ہے تو کسی بھی کلچر کو بننے کے لیے صدیاں نہ درکار ہوتیں۔ کلچر تو پھولوں کی وہ لڑی ہے جو دھیمے دھیمے اور رفتہ رفتہ پروئی جاتی ہے۔ اس جملے پر مجھے حفیظ الرحمان صاحب کا ''ڈان'' میں لکھا ہوا ایک مضمون یاد آ گیا۔ وہ کہتے ہیں، ''بے چارہ کلچر!— پاکستان میں یہ بہت سے تجربوں اور مشکلات سے گزرا ہے۔ ضیاء الحق صاحب کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے، سوائے اس کے کہ انھوں نے پاکستان نیشنل کاؤنسل آف آرٹس کا نام بدل کر ادارۂ ثقافتِ اردو رکھ دیا۔ ہر حکومت کلچرل پالیسی بنانے کے لیے پریشان رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے امپورٹ ایکسپورٹ پالیسی کی طرح یہ بھی ایک ضروری کام ہے۔ دراصل کلچر انسانی نفسیات اور سوچ کا ایک ضروری حصّہ ہے۔ کلچر تو ہماری رگوں میں، ہڈیوں میں بستا ہے، کلچر تو طرزِ زندگی کا نام ہے۔ اگر آپ پالیسی بنائیں گے تو وہ ہمیں حکم دے گی کہ ہم یہ کریں اور یہ نہ کریں۔ ہمارا موروثی کلچر ہمارے belliefs ہیں اور یا پھر وہ ہے جو مغل اور دوسرے بادشاہ ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ یا پھر کلچر موہنجوداڑو اور گندھارا کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم جو کچھ بھی کلچر کے نام پر کرتے ہیں وہ بے خبری میں کرتے

ہیں۔ ہم یہ سوچ کر زندگی نہیں گزارتے کہ ہمیں ہر روز کلچر کے تحت کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے معلوم ہے کہ ہم بعض چیزوں کے بارے میں schizophrenic ہیں مثلاً میوزک اور آرٹس۔ جب کہ بہت سے اور اسلامی ملک مثلاً ترکی اور بنگلہ دیش وغیرہ کو ایسا کوئی کومپلیکس نہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے اس بارے میں اپنے آپ سے سمجھوتا کرلیا ہے، کچھ اس طرح سے کہ ہمیں موسیقی سننا بہت پسند ہے مگر ہم اپنے بچوں کو موسیقی سیکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ انسانی اعضا کی ڈرائنگ کرنا ایک غیر مذہبی عمل ہے مگر فوٹوگرافی محض ایک عکسی تصویر کہہ کر قابلِ قبول ہے۔

اپنے اس موضوع کے سلسلے میں بہت سے اور لوگ تھے جن سے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ ان میں سے ایک صاحب اقبال حیدر تھے۔ آج کل ان کا قیام کیلگری میں ہے۔ کسی زمانے میں، میں نے بھی تین سال کا عرصہ کیلگری میں گزارا ہے۔ اقبال حیدر کیلگری میں ایک انشورنس کمپنی کے مالک ہیں۔ ان کے تمام نزدیکی رشتے دار کیلگری ہی میں ہیں۔ جہاں تک ہوسکتا ہے یہ وہاں کے لوگوں کو مختلف پروگرامز میں پاکستان کے حوالے سے اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ ابھی پچھلے سال ان کی شاعری کا مجموعہ ''آسماں بھی ہے'' منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے کی تقریبِ رونمائی کراچی ہی میں ہوئی تھی۔ آرٹسٹ انسان ہیں اس لیے کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار بڑے جذباتی انداز میں کرتے ہیں۔ میں نے ٹیلی فون پر ان سے اپنی کتاب کے بارے میں ذکر کیا تو بہت جذباتی ہوگئے۔ پاکستان سے ان کی محبت اتنی زیادہ ہے کہ لگتا تھا کبھی ان کی بات ختم ہی نہیں ہوگی۔ کہنے لگے، ہم یہاں آئے ضرور ہیں مگر ہم اپنے آپ کو پاکستان کا مجرم سمجھتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر ہم پاکستان کے لیے صرف باتیں کر سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم پاکستان کے حالات دیکھتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہورہا ہے۔ بعض مرتبہ لگتا ہے کہ چودہ اگست انیس سو سینتالیس کو دو لوگ بے وطن ہوئے۔ ایک وہ مسلمان جو ہندوستان میں رہ گئے اور ایک وہ مسلمان جو پاکستان آ گئے۔ میں نے ہنس کر کہا کہ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ان سے درخواست کی کہ میں اس سلسلے میں ان کو ایک سوال

نامہ بھیجوں گی اگر وہ ان سوالات کے جوابات بھیج دیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ پہلے سوچا تھا کہ ان کے جوابات کو اپنے رنگ میں لکھوں گی مگر ان کی خوب صورت زبان اور تحریر کو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ من وعن اسی طرح آپ تک پہنچاؤں۔

میرا پہلا سوال تھا کہ آپ اپنے خاندان کی مختصر تاریخ بتائیے۔

ہمارے خاندان کا تعلق الٰہ آباد یوپی سے ہے۔ ہمارے والدین انیس سو سینتالیس میں کراچی آ گئے۔ ہمارے والد دو بھائی دو بہن تھے۔ ایک بھائی بہن کراچی آ گئے اور ایک بھائی بہن وہیں رہ گئے۔ ہمارے والد کے آباو اجداد عراق سے چار سو سال پہلے ہندوستان آئے تھے۔ ہماری والدہ اکلوتی اولاد تھیں، ان کی تعلیم گھریلو تھی اور اردو اور عربی پڑھ لیتی ہیں۔ انگریزی میں حرف شناسی کی شدھ بدھ رکھتی ہیں۔ ہمارے نانا کے انتقال کے وقت ہماری والدہ صرف دو یا تین برس کی تھیں۔ ہماری والدہ اب ہمارے ساتھ کینیڈا میں مقیم ہیں۔

ہمارے والد اور ان کے بڑے بھائی دونوں وکیل تھے۔ یوں بھی ہمارے خاندان میں زیادہ تر وکیل یا کچہری سے متعلق لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ہمارے دادا کا تعلق بھی الٰہ آباد کے ایک قصبے سے تھا اور وہ کسی صاحبِ حیثیت زمین دار کی اکلوتی اور بگڑی ہوئی اولاد تھے۔ ہماری دادی بڑی انقلابی خاتون تھیں اور انھوں نے جوانی ہی میں شوہر سے علیٰحدگی اختیار کر لی تھی اور بچوں کی پرورش تنِ تنہا کی۔ والد صاحب نے انیس سو سینتالیس میں حساب میں ماسٹرز کیا تھا اور انیس سو پینتالیس میں الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ہی وکالت پاس کی تھی۔ ان کی شادی غالباً اکتالیس میں ہوئی تھی۔ انھوں نے انیس سو تریسٹھ تک گورنمنٹ کی ملازمت کی اور پھر قبل از وقت پنشن لے کر وکالت شروع کر دی۔ والد صاحب قدیم طرز کے بہت اچھے شاعر اور مذہبی اسکالر بھی تھے مگر بہت مذہبی نہیں تھے۔

اپنی پہچان کے بارے میں اقبال حیدر کہتے ہیں کہ ہماری پہچان ایک تہذیبی آدمی کی ہے۔ اوّل اور آخر ہم ایک تہذیبی آدمی ہیں۔ ہم تہذیب کو وسیع تر سمتوں میں اور ابدی اقدار کے تناظر میں دیکھتے ہیں اس لیے ہمارا تہذیبی نظام جامد نہیں متحرک ہے شاید اسی لیے ہمارے لیے تہذیبیں اپنی میراث نہیں ہوتیں اور مستقل evolution کا عمل جاری رہتا ہے۔

آپ کے تیسرے سوال کے جواب سے پہلے کچھ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں آپ کے سوال نمبر ۳، ۶، ۷، ۸ اور نو کے جوابات میں ایک قدر مشترک ہے۔ وہ ہے انسانی جبلت کی خواہشِ دوام۔ انسان بقائے ابدی کا اس قدر مشتاق ہے کہ اس چیز کو اپنی ذات کی توسیع کے حوالے سے ہی دیکھتا ہے۔ اس میں اولاد سے لے کر وطنیت، مذہب، کارہائے نمایاں، تخلیقات اور خدا تک شامل ہے۔

کتنے لاتعداد رُخ ہیں ایک حبِ ذات کے اس جبلی خواہش کا لامحالہ اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان معدوم ہونے سے بہت خائف رہتا ہے۔ اب اپنی زمین، اپنا وطن، اپنی اولاد، اپنی تہذیب اور اپنا شجرۂ نسب سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔ جو لوگ اپنی اس جبلی خواہش اور نفسیاتی عصبیت پر جتنا قابو پا لیتے ہیں اتنے ہی لامحدود اور secure ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جوشؔ صاحب نے ایک رباعی میں کہا تھا:

انسان کی توحید کا مشتاق ہوں میں
شمعِ حبِ عمیم کا طاق ہوں میں
مشرق کا نہ پابند نہ مغرب کا اسیر
انسان ہوں باشندۂ آفاق ہوں میں

جی ہاں عام آدمی کے لیے کیا ہر آدمی کے لیے ایک جغرافیائی شناخت ضروری ہوتی ہے مگر اس محدودیت کی مستقلاً توسیع کرتے رہنا عقلی انسان کا تہذیبی فریضہ ہے۔

دنیا کی ابتدا سے لے کر آج تک کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ تاریخِ انسانی ہجرت سے منسلک ہے۔ مگر ان ہجرتوں کے عوامل اور خصائل مختلف ہیں۔ شروع شروع میں نظریاتی فروغ کے لیے ہجرتیں ہوئیں۔ پھر اس کی دوسری اور زیادہ شدید شکل جنگوں اور جہادوں کی صورت میں وقوع پذیر ہوئی۔ اسی سے پھر استعماریت اور سلطنت سازی کی مجرمانہ روش چلی اور اب معاشی اور سماجی تسلط، New World Order اور Global Village کے نام سے انسانی اقدار کو پامال اور کھوکھلا کر رہا ہے۔ ہمارے تہذیبی ورثے میں تین قسم کی ہجرتیں ملتی ہیں، ایک تو انسانی

ارفع و اعلیٰ ہجرت جو کہ ہمارے صوفیائے کرام نے کی تھی جس کو آپ اخلاقی اور نظریاتی ہجرت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ دوسری قسم ان مجاہدوں اور حملہ آوروں کی ہے جو تسلط، مال و متاع اور ریاستوں کے اشتیاق میں ہوتی رہی ہیں۔ اس میں بڑی بڑی فوجیں آتی تھیں اور اپنے نسلی اور مذہبی نشانات چھوڑ جاتی تھیں اور بسااوقات اپنی فوج کا ایک بڑا حصّہ بھی نئی سرزمین پر چھوڑ جاتی تھیں۔ ماضیِ قریب میں تقسیمِ ہند کے ساتھ ایک بہت بڑی ہجرت مذہبی بنیادوں پر ہوئی جس میں ہجرت کرنے والے وہ لوگ تھے جو ایک ایسی مملکت میں آبسے جو جغرافیائی اور ثقافتی اعتبار سے اجنبی تھی مگر تخلیقی اور فکری لحاظ سے ان کی اپنی تھی۔ مگر جب وہ اس کی مہم چلا رہے تھے تو اچھی طرح واقف تھے کہ اس کا محلِ وقوع کہیں اور ہوگا۔ یہ شاید تاریخ کی سب سے زیادہ self secrificing ہجرت تھی۔ اس تحریک اور تقسیم کی زیادہ سربرآوردہ اور فعال اکائی سرحد کے دونوں طرف بے وطنی کے کرب سے دوچار رہی اور اپنی تہذیبی شناخت کے لیے اکثر مضطرب پائی گئی۔ سب سے آخر میں وہ ہجرت جو پچھلی دہائیوں سے بہت عام ہے اور جس کا مواد نہ اخلاقی ہے نہ نظریاتی۔ یہ محض بہتر معاشرت اور مادّی ترقی اور آسودگی اور آسائش کے لیے کی جاتی ہے۔ یہ ہجرت سب سے زیادہ غیر فطری ہے کیوں کہ اس میں تہذیبی adaptibility کے لیے جو وقت درکار ہوتا ہے وہ نہیں ملتا اور چیزیں سرعت اور سیمابیت کے ساتھ مدغم ہوجاتی ہیں، دوسرے وہ احساسِ وابستگی (sense of belonging) بھی نہیں پنپ پاتا۔ اسی قسم کی ہجرت ہم نے کی تھی اور آج تک زمانۂ سفر میں ہیں۔ انسان کی خواہشِ بقا کو دیکھتے ہوئے یہ کہتے ہوئے ہمیں کوئی عار نہیں ہے کہ یہ یقیناً گھاٹے کا سودا ہے۔

Roots پر یقین رکھنا یا نہ رکھنا ایک ایسا سوال ہے جیسے کوئی کہے کہ آپ سورج، چاند، زمین یا زندگی پر یقین رکھتے ہیں؟ یہ تو کائناتی حقیقتیں ہیں۔ اب تو genetic science نے بھی ثابت کردیا ہے کوئی بھی انسان محض اکیلا نہیں۔ کوئی انسان صرف وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ جس طرح لمحۂ موجود، غیر متعین اور لامتناہی وقت میں ایک نقطہ ہے اسی طرح انسانی زندگی ایک ازلی اور اَن مٹ زندگی کے سفر کا جزو ہے۔

کسی جگہ کا باسی ہونا اور سمجھنا شاید اختیاری عمل نہ ہو۔ میرے خیال سے ایک لاشعوری تیقن ہے تو دوسرا شعوری کاوش۔ مگر میرا یہ جواب وضاحت چاہتا ہے۔ آپ لاکھ کسی جگہ بس جائیں اور اپنے آپ کو وہاں کا باشندہ بھی سمجھنے لگیں اور دیگر اکائیاں بھی آپ کو حق دینے پر رضا مند ہوجائیں مگر جو اطمینانِ قلب اور روحانی طمانیت آپ کو واقعتاً اس ملک کا باشندہ بنانے کے لیے درکار ہوتا ہے اس میں جس باطنیت کی ضرورت ہے اس کو ایک طویل مہلت چاہیے ہوتی ہے۔ یہ مہلت انتہائی قلیل صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے کہ آپ کی نسل اس خطے، ملک یا علاقے کی فارمیشن میں شامل ہو یعنی آپ اس کے بنیاد گزاروں میں ہوں۔ اس کی سب سے صریح اور زندہ مثال پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا عمل اور اس کے نتیجے میں ہونے والی exodus ہے۔ دیکھیے کس طرح راتوں رات مہاجرین نے پاکستان کو اپنا ملک بلکہ اپنے ملک سے بھی زیادہ بڑھ کر مان دیا۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ ہجرت کرنے والی نسل بنے بنائے ملک میں وارد نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک وطن کی تشکیل کرکے اپنے خوابوں کی تعبیر پارہی تھی۔ وہ ہجرت تھی ہمارے جواں سال والدین کی۔ ہر قسم کی قربانیوں سے آراستہ اور ایک ہجرت وہ ہے جو ہم نے کی— سراسر معاشی، نری مادّی۔ اس قسم کی ہجرت نے دنیا میں ایک بہت ہی عمیق مسئلہ کھڑا کردیا ہے کہ ترقی پذیر یا غیر ترقی یافتہ ملکوں کی سب سے بڑی resource یعنی ان کا brain مسلسل ترقی یافتہ ملکوں کی طرف رواں ہے۔ اس brain drain کی وجہ سے غریب اور کم ترقی یافتہ ممالک مزید مجبور اور بے بس ہوتے جارہے ہیں۔ یوں امیر اور غریب کا فاصلہ اور خلیج بڑھتی جارہی ہے۔ ایک دن تو لاوا پھٹے گا، دیکھیں کب۔ ہم اپنی ہجرت کی بات کررہے تھے اور ہمیں آج تک یاد ہے کہ اس دن ہمیں کینیڈین امیگریشن کے پیپرز ملے تھے تو ہمارے والد حیات تھے اور اسی وقت کچہری سے گھر پہنچے تھے۔ ڈاکیے نے لفافہ ان کے ہاتھ میں دے کر بخشش کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ہمارے والد نے اسے کچھ روپے دے کر لفافہ ہماری طرف بڑھا دیا۔ ہم بہت خوش تھے مگر اپنے والد کی طرف دیکھا تو وہ رونا ضبط کرنے کی کوشش کرتے نظر آئے۔ ہم نے کہا، ہم پڑھنے جارہے ہیں اور جلد

آجائیں گے۔ کہنے لگے، بھلے کہیں بھی جاؤ اس زمین کو مت چھوڑنا۔ پاکستان کو مت چھوڑنا۔ یہ کہا اور رک کر ہمیں دیکھا۔ پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ یہ تھا دونسلوں کا فرق۔ مگر حالات کی تبدیلی، مستقبل کا منظرنامہ بدل دیتی ہے۔ ہم ایک طرف پاکستان سے شرمسار ہیں کہ اس نے ہمیں زندگی دی اور جوان کیا۔ مگر ہم نے اس کو تج دیا تو دوسری طرف اپنے والد سے کہ انھوں نے ایک ہی تو خواہش کی تھی اور وہ بھی کتنی سچی اور کھری مگر ہم وہ بھی پوری نہ کر پائے۔ اب جیسے تیسے کسی نہ کسی طور کفارہ ادا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں پھر بھی یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کے لوگ بلا کسی پشیمانی کے کس قدر مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔

سبھی کو راس آجاتی ہیں خوشیاں
خدا جانے ہمیں کیا عارضہ ہے

آپ کے دسویں سوال کا جواب ہے۔ یہ مذہب والوں کی دھاندلی اور بدنیتی ہے کہ وہ کلچر کو مذہب کا پارٹ بناتے یا سمجھتے ہیں۔ تہذیب evolve ہوئی ہے اور ہوتی ہے۔ مذہب بنایا جاتا یا نازل ہوتا ہے۔ ایک ہے۔ دوسرا بنایا جاتا ہے۔ ایک کا سلسلہ مطلق سے ملتا ہے دوسرے کا اضافی سے۔

سوال نمبر گیارہ کا جواب یہ ہے کہ یقینی طور پر تلاشِ رزق، تلاشِ معاش آسائش اور آسودگی کے لیے۔ تلاشِ ذات کا سفر باہر کی طرف نہیں اندر کی طرف ہوتا ہے۔ تلاشِ ذات کے سفر کے لیے کہا جاسکتا ہے۔

یہاں سر دے کے پیشانی بچی ہے
ہر اک منزل یہاں دشوار سی ہے

جس ملک میں آپ رہتے ہیں اور معاشرت کرتے ہیں یقیناً اخلاقی اور شخصی اعتبار سے آپ وہیں کے باشندے ہیں اور ہونا بھی چاہیے مگر یہ روح کی کرید جاتے جاتے جاتی ہے۔ اس کے لیے کم ازکم تین نسلیں قربان کرنی پڑ جاتی ہیں۔ حالات اگر منصفانہ اور فطری ڈگر پر رہیں تو تین سے چار نسلیں، اور اگر جبر ہو تو زمانے بھی کم پڑ سکتے ہیں۔

ہمارے بچے ہم سے زیادہ اچھے انسان ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ ان کا جبلی سفر ہم سے زیادہ آسودہ ہوگا۔ وہی کہی ہوئی بات، اگر جبر نہ کیا گیا خصوصاً مذہب کا تو ان کے یہاں زیادہ توانا اکائی ہوگی۔

اب وجود و عدم اور بقا و فنا سے متعلق تین نادر اشعار سن لیجیے:

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
(غالبؔ)

میں کثرتِ ظہور سے نادیدنی ہوں جوشؔ
میں شدتِ وجود سے ناآفریدہ ہوں

دہر کو جن قوتوں پر ناز ہے
سب ہیں گونگی آدمی آواز ہے

ایک اور بات، زبان سوچ کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ زبانوں میں سوچا نہیں جاتا۔ سوچ کو زبانوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

اقبال حیدر جو ایک شاعر ہیں مگر ساتھ ہی زندگی کے عملی حصے سے وابستہ ہیں، ان کا شمار ان شاعروں میں نہیں جو بعض مرتبہ خالی پیٹ شاعری کرتے ہیں۔

◇

خیر، کچھ لوگ ایسے ہیں جو زندگی میں ہر چیز کو سائنسی نظر سے دیکھتے ہیں، خواب ان کے بھی ہوتے ہیں مگر ذرا مختلف۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ زندگی کا ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ زندگی کی ہر تبدیلی کو وہ ایک سائنٹسٹ کی طرح پرکھتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک شخص عامر ہے۔ جی ہاں میرا بیٹا عامر — عامر جو سترہ سال کی عمر میں پاکستان سے نکلے، پانچ سال ترکی میں گزارے، ماسٹرز امریکا سے کیا پھر نوکری وہیں کی اور آج جب ان کی عمر

چالیس سال ہے تو وہ اپنی زندگی اور فیصلوں کا تجزیہ مجھے ایک ای میل میں بھیجتے ہیں، اگرچہ وہ ای میل اس لیے نہیں لکھا گیا کہ میں اسے اپنی کتاب میں شامل کروں مگر کیوں کہ اس کا موضوع وہی ہے اس لیے اس خط کا ترجمہ کر کے میں اپنی کتاب میں شامل کر رہی ہوں۔

تو اب ہم فرانس میں ہیں۔ اگرچہ ہمیں یہاں رہنے کے لیے کافی کوشش کرنی پڑی، آنے سے پہلے بھی اور آنے کے بعد بھی۔ اب تین مہینے بعد لگتا ہے کہ اس زمین پر ہم اپنے پاؤں جما سکے ہیں۔

دنیا میں بہت طرح کے لوگ ہوتے ہیں، کچھ ایسے لوگ جو چاہتے ہیں کہ زندگی میں زیادہ مدو جزر نہ ہوں، ان کی زندگی کی راہیں بہت ہموار ہوں اور وہ آرام اور سکون سے اپنی زندگی گزاریں۔ مگر کچھ لوگ ہماری طرح آوارہ گرد ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ٹھہراؤ آجائے تو ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں کہوں گا کہ ہم جیسے لوگوں کا تعلق خانہ بدوشوں کی نسل سے ہوتا ہے۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی وجہ زیادہ تر معاشی ہوتی ہے جس کا تعلق نوکری سے ہوتا ہے۔ جب کہ بعض لوگ ایڈونچر کے طور پر یا زندگی میں مختلف تجربات سے دوچار ہونے کے لیے جگہ جگہ گھومتے ہیں۔ میرا اور میرے خاندان کا تعلق دوسری قسم کے لوگوں سے ہے جو زندگی کی یکسانیت سے اُکتا جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی زمین کے ہر حصّے سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ترکی میں پانچ سال گزارنے کے بعد میں امریکا کے جنوب مغربی اور شمالی حصے میں مختلف جگہوں پر رہا۔

جب ہم کیلی فورنیا گئے تو اس کی ایک وجہ معاشی یعنی ایک اچھی نوکری کی تلاش تھی مگر دوسری کشش سیلیکون ویلی تھی۔ اس کے بعد جب ہم بوسٹن گئے تو اس کی وجہ صرف کسی مختلف جگہ پر رہنے کی خواہش تھی۔ اور اب جب ہم فرانس پہنچے ہیں تو اس کی وجہ زندگی کے ایک نئے رُخ سے آشنا ہونا ہے کہ یورپ میں لوگوں کا رہن سہن کیسا ہے۔ کیا یہاں کے لوگوں کا رہن سہن یو ایس اے سے مختلف ہے۔ کیا یہاں پر کام کرنے کا طریقہ ایک دوسرے سے ملنے جلنے کا طریقہ اور تعلیم کا طریقہ مختلف ہے؟

جب انسان جگہ بدلنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اپنے اس ارادے یا فیصلے کے بارے میں کئی مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔ میں نے اپنا یہ فیصلہ جب کیا جب آئی بی ایم کی طرف سے مجھے پریگ اور چیک ری پبلک کے آپریشنز کے لیے چنا گیا۔ یہ سب کچھ دو ہزار سات میں ہوا مگر میں کمپنی کے ساتھ بعض معاملات پر کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ لیکن دوسری طرف میرے ذہن میں کسی دوسری جگہ جانے کا بیج بویا جا چکا تھا اس لیے ہم نے سوچا کہ اگر آئی بی ایم کی طرف سے نہیں تو کسی اور طرح ہمیں یورپ جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں اور ویرا چاہتے تھے کہ ہم امریکا سے باہر اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ منتقل ہو کر زندگی کا مزہ اٹھائیں۔ امریکا وہ جگہ تھی جہاں میں طالبِ علمی سے ایک پیشہ ورانہ زندگی میں داخل ہوا تھا۔ اس زمین پر مجھے بہت اعتماد تھا، یہ وہ زمین تھی جس نے مجھے بلندیوں تک پہنچایا تھا، اس نے مجھے اعتماد دیا تھا اور میں اس زمین سے محبت بھی کرنے لگا تھا۔ یہاں سے جانے کا مطلب تھا کہ میں اس زمین کو چھوڑ رہا ہوں جس کی روزمرہ زندگی مجھ میں اس طرح رچ بس چکی تھی کہ یہاں سے ایک نئی زمین پر جانا میرے لیے ایک آزمائش تھی۔ نئی جگہ کے پروفیشنل چیلنج سے میں قطعاً خوف زدہ نہیں تھا، لیکن میں ان کے اجنبی کلچر اور ایک مختلف نسل کے طور طریقوں میں مدغم ہونے سے ڈر رہا تھا۔ اور اس کی ایک بڑی وجہ وہاں کی زبان سے ناآشنائی تھی۔ ہر معاشرے کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں اور یہ سب کچھ کہیں جا کر رہنے سے ہی آ سکتے ہیں۔

بہر حال منزل یورپ تھی، اب یہ میرا اپنا فیصلہ تھا کہ میں کس جگہ کا انتخاب کروں۔ ہمیں بہت سے فیصلے کرنے تھے، بچوں کی تعلیم کے بارے میں، جس جگہ ہم جائیں گے وہاں کا موسم کیسا ہوگا اور مستقبل میں میرا کیریئر اس جگہ پر کیسا رہے گا۔ دسمبر کی چھٹیوں میں، میں نے مختلف جگہ درخواست دی اور مجھے مختلف جگہوں پر انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ بہت جگہ انٹرویو دینے کے بعد میرے پاس چند آپشنز تھے۔ اوسلو، ناروے، لندن، یو کے، بیلجیم، سوئٹزرلینڈ اور فرانس۔

جب کوئی شخص رہنے کے لیے کسی جگہ کا انتخاب کرتا ہے تو یہ ایسا ہی فیصلہ ہوتا ہے

جیسے آپ کوئی شخص چنتے ہیں جس کے ساتھ آپ رہنا چاہتے ہیں۔ آپ کو وہاں کے رہنے والوں کی عادتیں پسند ہونی چاہییں۔ اس کے علاوہ وہ دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں، کیا وہ تمیزدار اور دلچسپ لوگ ہیں؟ کیا ان کی اور آپ کی پسند ملتی جلتی ہے۔ مجھے سکینڈینیوین، یوکے، بیلجیم، سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا اور لگتا تھا کہ تمام جگہیں کم و بیش ملتی جلتی تھیں۔ سکینڈینیویا خوب صورت جگہ تھی مگر بہت سرد اور زندگی کی حرارت سے عاری۔ بیلجیم اس سے بہتر تھا مگر مسلسل بارش اور سرد موسم سے میں گھبراتا تھا۔ اگرچہ مجھے ان کے کھانے پسند تھے۔ جیسے ہی میں نے سوئٹزرلینڈ کا سوچا تو سب سے پہلے جو خیال ذہن میں آیا وہ کام میں ان کی دلچسپی، مہارت اور accuracy تھی۔ مگر میری نظر میں وہاں کے لوگ بہت ہی بور تھے۔ اگرچہ وہاں کے لوگ اور جگہ دونوں ہی خوب صورت تھے لیکن اگر آپ ان کی کسی بات کو سراہیں یا کوئی کومپلیمنٹ دیں تو وہ بجائے شکریہ کہنے کے اپنی گھڑی دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد یوکے تھا، لندن شہر جس کی چمک اور کشش سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اس شہر میں ایک ایسا سحر ہے کہ ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مگر وہاں کا رہنا سہنا اور وہاں کی مہنگائی میرے بس سے باہر تھا۔ لندن میں رہنے کا مزہ جب ہی تھا کہ میں اس کے سینٹر میں رہتا مگر افسوس کہ میں نہ کوئی عرب تھا اور نہ رئیس کہ وہاں کی مہنگائی برداشت کرسکتا گویا انگور کھٹے تھے۔ آخر میں فرانس رہ گیا۔ رہ کیا گیا، یہ سمجھیے کہ وہ ایک خوب صورت جگہ تھی جہاں دنیا کی ایک تہذیب یافتہ قوم رہتی تھی۔ فرانس جس کے ساتھ منسلک تھا وہاں کا بہترین کھانا، لٹریچر، صدیوں پرانی نرم زبان۔ ہاں یہاں کے لوگوں کا رویہ کہ وہ خود کو دنیا کی سب سے بہتر قوم سمجھتے ہیں اور اس کا اظہار ان کے رویے سے ظاہر ہے۔ ہم نے سوچا یہ سب بھی زندگی میں کچھ چاشنی پیدا کرتا ہے اور روح کے لیے ایک اچھی غذا ہے۔ سو ہم نے فرانس کا انتخاب کرلیا۔ اور اس انتخاب میں ذرا رنگینی پیدا کرنے کے لیے ہم نے ایک ایسے گاؤں کا انتخاب کیا جو سوئٹزرلینڈ سے بیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ صرف اس لیے کہ جب فرانسیسی ہمیں بار بار اس بات کا احساس دلائیں کہ تو کیا ہے؟ تو ہم سوئٹزرلینڈ کا رخ کرلیں۔ (کتنی عجیب بات ہے کہ ایک سرحد لوگوں کے

رویے میں اتنا فرق پیدا کردیتی ہے۔ شاید اسی کو پہچان کا نام دیا جاتا ہے۔)

جب آپ کی نوکری اس بات کا انتخاب کرتی ہے کہ آپ کو کہاں رہنا ہے تو شاید یہ بات آسان ہوتی ہے مگر جب یہ کہا جائے کہ آپ خود جگہ کا انتخاب کریں تو یہ بات مشکل ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں جو لوگ خود فیصلہ نہیں کرسکتے وہ استخارہ کرتے ہیں تاکہ فیصلے کے بوجھ سے آزاد ہوجائیں۔ ہم نے استخارہ تو نہیں کیا مگر ہاں ایک لسٹ بنائی کہ ہمیں کس طرح کسی ایک جگہ کا انتخاب کرنا ہے۔

۱۔ بچوں کا اسکول (بچے امریکا میں ایک فرنچ اسکول میں جاتے تھے۔)

۲۔ جغرافیائی تعین۔ ہمیں گھومنے پھرنے کا شوق ہے، ہمیں کوئی ایسی جگہ چاہیے تھی جو ایک مرکزی مقام رکھتی ہو۔

۳۔ رہنے سہنے کا ایسا معیار جس میں ہم آسانی سے ایڈجسٹ کرسکیں۔

۴۔ لانگ ٹرم کیریئر۔

۵۔ یورپ میں سفر کرنے میں آسانی ہو۔

آخرکار ہم نے جنیوا کے نواح میں فرانس کے ایک گاؤں آرنیکس میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے چند مہینے واقعی بہت مشکل رہے۔ جب ہم لفظ رویہ کہتے ہیں تو ہم اس کی گہرائی کو محسوس نہیں کرسکتے۔ فرانسیسیوں کا رہنے سہنے اور لوگوں سے ملنے کا ایک الگ ہی طریقہ ہے۔ میں پاکستان، ترکی، یو ایس اے اور یو اے ای میں رہ چکا ہوں مگر میں کہوں گا کہ فرانس کا تو ہے کچھ اندازِ بیاں اور۔ وہ دنیا کی بہترین شراب بناتے ہیں، ان کا کھانا دنیا کا بہترین کھانا سمجھا جاتا ہے، ان کے گھر بے حد بڑے اور آرٹسٹک ہیں مگر عملی طور پر بے حد بے کار۔ وہ ابھی تک اس پرانے دور میں رہتے ہیں جہاں ٹائلٹ الگ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہاں ہاتھ دھونے کے لیے سینک تک نہیں ہوتا۔ ہمیں پرانے گھروں میں رہنے کا شوق تھا مگر سب سے مشکل بات ان کے پرانے طرز کے باتھ روم تھے۔ انھیں اپنے بہترین قوم ہونے پر کتنا ہی ناز ہو مگر ہماری نظر میں انھیں ہائیجین اور صفائی کا کوئی خاص شوق نہیں۔

جو اگلی مشکل ہمیں پیش آئی وہ وہاں کا ریذیڈینسی پرمٹ تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک ایسا جال ہے جس سے آپ نکل نہیں سکتے۔ اگر میں اس کی تفصیل میں جاؤں تو شاید سمجھانا بھی مشکل ہو۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس بارے میں یہ لوگ بہت سخت ہیں اور اپنے قوانین میں ذرا سا ردو بدل نہیں کرتے ہر بات کا ایک ہی جواب ہے، "c'est la vie en France" یعنی فرانس کی زندگی یہی ہے۔ اس جملے سے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ رہنا ہے تو رہو نہیں رہنا تو تمھاری مرضی۔

اتنا عرصہ امریکا میں رہنے کے بعد میں زندگی کی آسانیوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ آسانیوں کا مطلب یہ کہ امریکن زندگی گزارنے میں بہت پریکٹیکل ہیں۔ یہاں تک کہ اگر انھیں اندازہ ہو جائے کہ ٹیلی فون پر ان سے بات کرنے والا واقعی جینوئن ہے یعنی بزنس کے لیے فائدہ مند ہے تو وہ قوانین میں رہتے ہوئے اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس در سے کم ہی لوگ مایوس لوٹتے ہیں۔ اب چاہے وہ کوئی بینک ہو، موبائل ٹیلی فون کمپنی ہو، یا کوئی انشورنس کمپنی۔ میرے لیے فرانسیسی لوگوں کا یہ رویہ قطعی اجنبی تھا۔ ان لوگوں کے لیے سب سے اہم بات ان کا اپنا وقار ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لوگ مالی لحاظ سے بہت مضبوط ہیں۔ میرا خیال ہے، یہ ان کی خوش فہمی ہے اور اپنا کلائنٹ بنانے کے اور بزنس بڑھانے کے یہ طریقے نہیں ہوتے مثلاً امریکا میں (ہاں میں امریکا کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا ہوں) جب آپ کسٹمر سروس سے فون پر اپنے بل کی غلطی ٹھیک کرواتے ہیں تو آپ کو اس کے لیے ٹیلی فون کمپنی کو اس کال کے چارجز نہیں دینے ہوتے۔ اسی طرح فرانس میں دو گھنٹے کا لنچ بھی کسٹمرز کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ لنچ کے وقفے میں آپ کو کمپنی کے ملازموں کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور پھر یہی نہیں بلکہ وہ ملازم اپنے کام پر بھی دیر سے پہنچتے ہیں۔ امریکا میں لوگ اپائنٹمنٹ دے کر بھولتے نہیں۔ افسوس کہ اگر میں تمام شکایات کے بارے میں بتانا شروع کروں تو فہرست بہت لمبی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے فرانس میں کسی کو پیسا کمانے کی پروا نہیں اور انھیں دنیا میں اس سلسلے میں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگوں کو ناکارہ کہا جائے گا۔ میری نظر میں اگر فرانسیسی

کمپنیز کا دُنیا کی دوسری کمپنیوں سے مقابلہ کیا جائے تو یورو پین یونین کی کوئی حیثیت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مقابلے میں فرنچ ٹیلی کوم اور اورنج کسی مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتیں۔

مگر مجھے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں کہ میں ایسے ہی رویوں کا مزہ چکھنا چاہتا تھا۔ مزہ یقیناً ہے مگر کبھی کبھی یہ مزہ کچھ زیادہ تلخ ہو جاتا ہے، اور کبھی کبھی اتنا تیز کہ ہمیں رُلا دیتا ہے۔ لیکن اگر تعصب سے ہٹ کر دیکھوں تو یہ ایک الگ دنیا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا امریکا سے مقابلہ کیا جائے۔

چلیں اب فرانس کی کچھ اچھی باتیں کرتے ہیں۔ یہاں زندگی کی ایک مختلف رفتار ہے جس کا تصور امریکا میں قطعاً نہیں کیا جا سکتا۔ امریکا میں ایک افراتفری ہے اور پُرسکون زندگی کا وہاں رہ کر سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ میں نے ابھی دو گھنٹے کے لنچ کی شکایت کی ہے مگر اس کے چند اچھے پہلو بھی ہیں۔ کھانا یہاں پر بہت اچھا ہے اور ذائقے کو بہتر بنانے کے لیے بہت تفصیل میں جاتے ہیں اور اس کا ایک حصّہ نفاست بھی ہے۔ آپ چھوٹے سے چھوٹے کھوکھے پر بھی کھانا کھائیں تو آپ محسوس کریں گے کہ کھانے کی کوالٹی کو بہتر بنانے میں کتنی محنت کی گئی ہے اور ہر بنانے والے کو اس پر کتنا فخر ہے۔ ہم جینیوا کے نواح میں فرانس کے ایک چھوٹے سے گاؤں فرنے والٹئیر میں رہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی جگہ ہے جو چند تنگ گلیوں، چند گھروں اور گنتی کے اپارٹمنٹس پر مشتمل ہے۔ گاؤں میں اینٹوں کے گھر ہیں اور رنگین شٹرز اور دریچے ہیں۔ گاؤں کے چوراہے پر ایک خوب صورت فوارے کے ساتھ والٹئیر آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ گاؤں کے مرکزی حصّے میں زیادہ تر لوگ پیدل نظر آتے ہیں اور یہاں پر فرانس کے روایتی کیفے، بیکریز، گوشت کی دُکانیں اور دوسری دُکانیں ہیں۔ گاؤں یہاں پر ایک ہزار پانچ اے ڈی سے موجود ہے اور اسی زمانے میں جینیوا کا آغاز ہوا تھا۔ اگرچہ یہ جینیوا کے بالکل ساتھ ہے اس کے باوجود یہ سوئس نہیں بلکہ فرانسیسی روایات کا حامل ہے۔

امریکا سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو یہاں زندگی کی قدریں مختلف ہیں۔ طویل لنچ اور قیلولہ ہی طرزِ زندگی ہے، جلدی جلدی کھانا ٹھونس کر کام پر واپس چلا جانا بدتہذیبی ہے۔

کام میں بہترین ہونا اچھی بات ہے مگر اس طرح نہیں کہ آپ کی زندگی کی کوالٹی خراب ہو جائے۔ دنیا سے مقابلہ اچھی بات ہے مگر اس کے لیے اپنی روایات اور طرزِ زندگی کی قربانی دینا ان کی نظر میں زیادتی ہے۔ اپنے گاؤں کے مخصوص ماحول کو برقرار رکھنا جس میں ان کے گھر، کھیت اور سکون شامل ہے، ان کی روایات کا حصّہ ہے۔ ان کے گاؤں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وقت اپنی جگہ ٹھہر چکا ہے اور کوشش سے صدیوں پُرانی خوب صورتی کو قائم رکھا گیا ہے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں، پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرتے ہیں، چھوٹی گاڑیاں استعمال کرتے ہیں اور یہ سب انھوں نے خود اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ان کے لیے باعثِ فخر یہ ہے کہ ان کے پاس کتابوں کا کتنا خزانہ ہے، نہ یہ کہ اس گھر کی قیمت کتنی ہے جس میں یہ رہتے ہیں۔ اسی طرح کھانے کی مقدار کی بجائے اس کی کوالٹی پر زور ہے۔ وقت قیمتی ضرور ہے مگر اتنا نہیں کہ وہ زندگی کا لطف نہ اٹھا سکیں۔

جیسا کہ نئی گرل فرینڈ اچھی لگتی ہے اسی طرح فی الحال میں فرانس سے خوش ہوں۔ کسی بھی نئے تعلق کی طرح کسی نئی جگہ اپنانے میں تین ادوار ہوتے ہیں۔ ہنی مون پیریڈ— جس میں ہر چیز حسین نظر آتی ہے۔ پھر وہ زمانہ جب مسائل پیش آتے ہیں اور ہر چیز خراب نظر آتی ہے یعنی ایڈجسٹمنٹ پیریڈ، اور پھر حقیقی زندگی جس کے بعد فیصلہ کیا جائے کہ اس رشتے کو قائم رکھا جائے گا یا پھر الگ راہیں اپنائی جائیں گی۔ فی الحال ہم اپنے ہنی مون پیریڈ کے آخری حصّے میں ہیں دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔

عامر

تو یہ ہے ایک تجزیہ۔ عامر وہ شخص ہے جس نے امریکی ہونے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا اور اس کا کہنا ہے کہ وہ امریکا سے بہت متاثر ہے۔

◇

میں جب ان سے ملی تو وہ ایک سادہ سی سفید کاٹن کی ساری میں ملبوس تھیں۔ ہلکے سبز رنگ کا بلاؤز بالوں سے سفیدی جھانکتی تھی۔ زبان بے حد شستہ، اور کیوں نہ ہوتی کہ انھوں

نے اپنی زندگی کا زیادہ حصّہ تدریس میں گزارا تھا اور وہ بھی علی گڑھ مسلم گرلز یونی ورسٹی میں۔ وہ یونی ورسٹی میں سوشیالوجی کی پروفیسر تھیں۔ ٹورونٹو کا موسم اس دن کچھ سرد تھا، کہنے کو گرمی کا مہینہ تھا مگر بادلوں اور ہوا نے کچھ ایسا رنگ جمایا تھا کہ گرم کپڑے پہنے بنا گزارا نہ تھا۔ ہم جس جگہ بیٹھے تھے وہ ایک سادہ سا ڈرائنگ روم تھا، اسے صحیح معنوں میں بیٹھنے کا کمرہ کہا جاسکتا تھا۔ ایک ایسی جگہ جہاں کوئی تکلف نہیں ہوتا، آپ بیٹھتے ہی ایک اپنائیت محسوس کرتے ہیں۔ کمرے میں چند اور افراد بھی تھے، میزبان کامران مرزا اور ان کی بیگم کی اماں پاشا صاحبہ جن کی عمر اٹھاسی سال تھی۔ میرے شوہر شعیب عالم، ان کے بھائی شمعون عالم اور ملیحہ یعنی مسز شمعون عالم۔ اس گھر میں اپنائیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ماحول اپنے لوگوں اور اپنے کلچر کا آئینہ دار تھا۔ کمرے کی کھڑکی کے باہر وہی ٹورونٹو کے صاف ستھرے گھر تھے، باہر ہلکی پھوار پڑتی تھی جو موسم بہار کے پھولوں کو گدگداتی تھی اور وہ خوشی سے ایک دوسرے سے گلے ملتے تھے۔ جو شخص خوش رہنا نہ جانتا ہو وہ ہر خوشی میں غم کا پہلو نکال ہی لیتا ہے۔ جانے کیوں اس سہانے موسم میں مجھے کراچی کی لوڈ شیڈنگ یاد آگئی۔ جانے کیوں ریحانہ کے والد کی موت کا وہ کمرہ یاد آگیا جہاں صرف ایک پنکھا تھا جو کمرے کے حبس کو دور کرتا تھا، ہر طرف آنسو تھے، سسکیاں تھیں، لانڈھی کی غربت تھی، عورتیں کالے برقعوں میں ملبوس اس بیوہ کے گلے لگتی تھیں جو ایک کونے میں اپنا چہرہ ڈھانکے شاید سب کی نظروں سے چُھپ جانا چاہتی تھی۔ خدا جانے اسے گرمی بھی لگتی تھی یا نہیں؟ میرے جیسے تمام لوگ جن علاقوں میں رہتے ہیں وہاں بجلی چلی بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یو پی ایس فوراً آن ہو جاتا ہے اور زیادہ مشکل ہو تو جنریٹر چل جاتا ہے۔ بجلی کا جانا کیا ہوتا ہے، اس کا اندازہ مجھے اس دن ہوا۔ میّت کے اٹھنے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا کہ اچانک پنکھا چلنا بند ہوگیا۔ ایسا لگا جیسے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی ہر عورت کا جسم انگیٹھی بن گیا اور پھر ان کے جسم سے نکلتی ہوئی حرارت کے ساتھ ساتھ کمرے میں طرح طرح کے پسینوں کی بو سے وہاں بیٹھنا ناممکن ہوگیا۔ میں گھبرا کر کمرے سے نکل کر صحن کی طرف گئی، چھوٹا سا اندھیرا صحن اور اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں، سیدھے ہاتھ پر ایک اور کمرہ جو نسبتاً روشن تھا۔ میں نے

سوچا ہمیں یہاں کیوں نہیں بٹھایا؟ اندر جانے پر پتا چلا کہ وہاں صرف ایک چھوٹا سا پنکھا تھا جو صرف ایک کونے میں ہوا دے سکتا تھا۔ مگر اس وقت تو پورا گھر محض ایک اوون تھا جو گھر والوں کے رنج والم کو مزید ہوا دیتا تھا۔ ریحانہ غم سے زرد تھی۔ ایک بھائی کھڑکی کے سہارے کھڑا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنی ماں کے گلے سے لگ کر اپنے اور ماں کے غم کو ہلکا کرے مگر درمیان میں نہ جانے کتنے اجنبی لوگ تھے۔ ہم اتنے اجنبی لوگ وہاں کیوں جمع تھے جو ان کی محبتوں میں حائل ہوتے تھے۔ یہ بھی ہمارے کلچر کا ایک عجیب حصّہ ہے جو میری سمجھ سے باہر ہے۔ جنازہ چلا گیا مگر بجلی نہیں آئی۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو ہر طرف مایوس چہرے تھے، بچے ماؤں سے چپٹے روئے جاتے تھے اور بجلی تھی کہ آتی ہی نہیں تھی۔ ہوا کے ایک سرد جھونکے نے مجھے جگا دیا اور میں واپس اس آرام دہ کمرے میں آگئی جہاں ہندوستان سے آئی ہوئی ایک پروفیسر بیٹھی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ضرورت ہے جو انسان کو اپنی زمین سے کہیں اور لے جاتی ہے۔ اگر اپنے ملک میں آرام و آسائش ہو تو شاید لوگ دوسرے ملکوں کا رخ نہ کریں۔ شوق اپنی جگہ ہے، ایڈونچر اپنی جگہ ہے مگر زیادہ وجہ ضرورت ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ اب ہمارے ملک سے کم لوگ یہاں آرہے ہیں بلکہ میں کہوں گی کہ کافی لوگ واپس جارہے ہیں۔ ہمارے یہاں گڑگاؤں دیکھیے، بنگلور دیکھیے، حیدرآباد غرض ہر جگہ آئی ٹی کا گڑھ بن گئی ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہر جگہ ہندو نظر آتے ہیں، نہ جانے مسلمان کیوں پڑھائی کی طرف راغب نہیں ہوتے؟ چاہتے ہیں کہ ہر جگہ کوٹہ ہوجائے تاکہ انھیں کسی مقابلے کے امتحان میں نہ بیٹھنا پڑے۔

میں نے پوچھا، ''آپ کب سے کینیڈا میں ہیں؟''

''میں تو چند دن ہوئے آئی ہوں۔ میرا بیٹا امریکا میں ہے۔ مجھے صرف چھ مہینے کا ویزا ملا ہے۔''

''آپ کو یہاں یعنی نارتھ امریکا میں رہنا اچھا لگتا ہے؟'' کہنے لگیں، ''ہاں، کیوں کہ یہاں بچے ہیں۔ ورنہ سب سے اچھا تو یہ ہے کہ بیسٹ آف بوتھ ورلڈز ہو کہ چار مہینے یہاں گزاریں اور بقیہ اپنے ملک میں۔ میں نے اپنی زیادہ پڑھائی شادی کے بعد کی اور وہ

بھی دلّی میں۔ اس کے بعد میں اور میرے شوہر امریکا آگئے اور یہاں سے چند ڈگریاں لیں۔ مگر تمام نوکری پھر واپس انڈیا میں ہی کی۔ چند سال ہوئے میرے شوہر کا انتقال ہوگیا تو بیٹے کی غیرت نے جوش مارا کہ آپ اکیلی نہیں رہیں گی بلکہ ہمارے پاس رہیں گی۔ ایک بات ہے، بوڑھے انسان کے لیے میڈیکل کی جو آسانیاں یہاں فراہم ہیں وہ ہمارے ملکوں میں کہاں۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کے لیے ہمارا ملک صحیح ہے لیکن اگر خدا نہ کرے کوئی بڑی بیماری ہو تو ہم وہاں افورڈ بھی نہیں کرسکتے۔ مگر یہ بھی سوچتی ہوں کہ اس بڑی بیماری کے انتظار یا ڈر میں بقیہ زندگی اس قیدِ تنہائی میں گزار دوں، یہ بھی تو بے کار کی بات ہے یا تو ہم یہاں ہمیشہ سے رہ رہے ہوتے تو اپنا ایک ماحول بنالیتے جیسے اس وقت ہم چند ایک جیسے لوگ بیٹھے ہیں۔ لگتا ہے ہر سانس زندگی کی خوشیوں کو بڑھاتا ہے مجھے تو اولڈ ہوم بھی منظور ہے بشرطے کہ اپنے جیسے لوگ ہوں ورنہ گوروں میں بیٹھ کر زندگی کے آخری سانس لینا مجھے منظور نہیں۔''

اتنی دیر میں اوپر سے ایک لڑکی اتری۔ انھوں نے مجھ سے اس کا تعارف کروایا، ''یہ ہماری بھتیجی ہے، اپنی کسی دوست کے ساتھ کھانے پر ڈاؤن ٹاؤن جارہی ہے۔'' بولنے میں وہ لڑکی بالکل کینیڈین تھی مگر دیکھنے میں عرب معلوم ہوتی تھی کہ اس نے ایک لمبا سا کالا لباس پہنا تھا اور سر کو پوری طرح اسکارف سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے والد نے پوچھا، ''تم گاڑی میں نہیں جارہیں۔'' اس نے کہا، ''نہیں پٹرول ایک ڈالر پینتیس سینٹ ہے۔ میں بس پر جارہی ہوں۔'' وہ خاتون کہنے لگیں، ''کتنا فرق ہے یہاں کی مسلمان لڑکی میں اور ہمارے یہاں کی لڑکی میں۔ یہاں کتنا اعتماد ہے اور ماحول کتنا تحفظ دیتا ہے۔'' میں نے پوچھا، ''آپ کی باتوں میں کچھ تضاد نہیں ہے؟ آپ اس ملک کی باتوں کو پسند بھی کرتی ہیں اور یہاں رہنا بھی نہیں چاہتیں!''

''ارے ہمارا کیا ہے، ہم تو پچھلی صدی کے لوگ ہیں۔ یہ نئی دنیا نئے لوگوں کے لیے ہے۔''

دوہا

اس نے ہلکے براؤن رنگ کا لباس پہنا تھا۔ قمیص شلوار دوپٹہ اور ذرا سے گہرے رنگ کا اسکارف۔ اسکارف جس سے اس کے بال ڈھکے ہوئے تھے۔ اس لڑکی کے علاوہ اس کمرے میں چند اور خواتین بھی تھیں ۔ ہر عمر کی خواتین۔ پندرہ سال سے ستر سال تک کی سب کے سر پر اسکارف تھا۔ ان سب لوگوں میں، میں خود کو اجنبی محسوس کرتی تھی۔ وہ خواتین جن کی عمر پندرہ سے پینتیس برس تک تھی سب صرف انگریزی بولتی تھیں اور ان ہی خواتین کی مائیں یا ساسیں اردو میں گفتگو کرتی تھیں۔ گھر کی سجاوٹ دیکھ کر اس کے مکینوں کی امارت کا احساس ہوتا تھا۔ چاہے وہ کھڑکیوں پر لگے پردے تھے، چاہے وہ میزوں پر سجے دنیا بھر کے نوادرات تھے، چاہے وہ خاتونِ خانہ کی گفتگو تھی جن کا کہنا تھا کہ آج کل وہ سخت مشکل میں ہیں کیوں کہ ان کی maid انھیں چھوڑ کر جاچکی ہے، وہ خادمہ جو پچھلے آٹھ سال سے ان کے پاس تھی، وہ خادمہ جس نے انھیں گھر کی ہر فکر سے آزاد کردیا تھا، جو ان کے کپڑے نکالتی تھی، ان کے اس لباس سے میچنگ جوتے اور جیولری نکالتی تھی، جب وہ کسی پارٹی سے واپس آتی تھیں تو ان کے کپڑوں کو پہلے باہر تازہ ہوا میں رکھتی تھی اور پھر الماری میں ٹانگتی تھی، لان کی دیکھ بھال کرتی تھی اور گھر کی ہر پارٹی کا انتظام کرتی تھی۔ آج کل ان کے پاس صرف ایک ہیلپر لڑکا تھا جو اتنا کام نہیں جانتا تھا۔ اس محفل

میں دو خواتین ایسی بھی تھیں جنھوں نے اسکارف کے ساتھ ساتھ کالے رنگ کا عبایہ بھی پہنا تھا، دیکھنے میں اتنی سرخ سفید تھیں کہ ان پر انگریز ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ انگریزی اتنی شستہ تھی کہ لگتا تھا کسی اور زبان سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ ان سب کو دیکھ کر دنیا کے گلوبل ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ لباس اور گیٹ اپ عربی تھا، زبان انگریزی تھی، کھانا یونانی تھا اور وہ سب پاکستانی تھے۔ یہ تو تھا ان کا بیرونی منظر اب اندرونی طور پر ان کی سوچ کیا تھی اس کے لیے وقت درکار ہے۔ ڈرائنگ روم سے مردوں کی باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی اور معمول کے مطابق وہ پاکستان کے بارے میں گفتگو کررہے تھے۔ بے چارہ پاکستان جو ہر جگہ تختۂ مشق بنا رہتا ہے۔ پاکستان جو ہر ڈرائنگ روم کا حصّہ ہے۔ اگر پاکستان نہ ہوتا تو نہ جانے ہم کیا گفتگو کرتے بلکہ شاید ہمیں چپ لگ جاتی۔ اور اگر زیور اور کپڑا نہ ہوتا، یا غریب خدمت گار نہ ہوتے تو نہ جانے خواتین کیا گفتگو کرتیں۔ ڈرائنگ روم جہاں دو پی ٹی وی کے لوگ، تین ایئرفورس کے لوگ اور چند بینکرز بیٹھے تھے۔ میرا موضوع کیوں کہ کلچر ہے اس لیے ضروری ہوگا کہ میں ان کے لباس اور زبان کی بات ضرور کروں۔ ان لوگوں میں پچاس فی صد نے پینٹ شرٹ پہنی تھی اور باقی نے قمیص شلوار پہنی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی لمبے عبایہ میں ملبوس نہیں تھا۔ کیا وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے لیے عربی لباس کا انتخاب نہیں کیا؟ زبان زیادہ تر اردو تھی۔ اگرچہ اس میں کافی حد تک انگریزی کی پیوند کاری تھی۔ میں آج امریکا یا کینیڈا میں نہیں بلکہ دوہا میں بیٹھی تھی۔ مڈل ایسٹ جو نہ جانے پاکستان کے کتنے خاندانوں کے پیٹ پالتا ہے۔ امریکا اور کینیڈا جانے والے نوجوان کچھ عرصے بعد پاکستان سے بیگانہ ہوجاتے ہیں مگر مڈل ایسٹ جانے والے لوگ مسلسل اپنا پیسا پاکستان منتقل کرتے رہتے ہیں۔ مڈل ایسٹ میں رہنے والے لوگ اپنے مذہب سے بھی زیادہ نزدیک ہو جاتے ہیں اور ان کے رہن سہن میں عربی رنگ جھلکتا ہے۔ دوہا، سعودی عرب، دبئی اور ابوظہبی وغیرہ میں رہنے والے لوگ چاہے بیس برس یہاں رہیں یا تیس برس، انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمین نے انھیں اپنانے کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اس لیے یہ لوگ برسوں اس زمین پر رہنے کے باوجود اپنا رشتہ پاکستان سے

استوار رکھتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں دھاگے پاکستان سے بندھے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ یہ لوگ پاکستان واپس جانا چاہتے ہیں۔ مگر پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ میں آج تک اس محبت کو سمجھ نہیں سکی۔ میں جو محبت پر یقین ہی نہیں کرتی۔ میرے دوست سعید احمد نسیم، راحیلہ، تسنیم اور سب ہی مجھ سے اس بات پر جھگڑا کرتے ہیں، بلکہ ناراض ہوجاتے ہیں کہ میں محبت پر یقین کیوں نہیں کرتی۔ مگر جس محبت پر میرا ان سے جھگڑا ہے وہ محبت وہ ہے جو جوانی میں ایک انسان کو دوسرے سے ہوجاتی ہے۔ میں اسے محبت نہیں بلکہ ضرورت کا نام دیتی ہوں۔ مگر دیکھا جائے تو زمین کی محبت بھی ضرورت ہوگئی ہے۔ جو زمین آپ کی زیادہ ضروریات پوری کرتی ہے آپ اسی کے ہوجاتے ہیں اور یہ آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے۔ انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں جگہ جگہ کی خاک چھانتا رہا ہے۔ اس زاویے سے سوچا جائے تو نہ کلچر، نہ مذہب، نہ زمین ہر زمانے کی سب سے اہم چیز دولت ہے۔ جو زمین بھی آپ کو پیسا دے، آپ اس زمین کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی یہ کہنا نہیں چاہتا کہ مجھے دولت سے محبت ہے۔

بہرحال میں بات کررہی ہوں دوہا کی۔ کیا یہاں کے لوگوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں نے ہجرت کی ہے؟ اگرچہ اس کا جواب ہے 'نہیں'۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ اپنی پوری زندگی ایک دوسرے ملک میں گزار دیتے ہیں۔ ان کے بچے امریکا، یورپ اور آسٹریلیا جاتے ہیں اور پھر وہیں کی قومیت لے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہ تین کشتیوں کے سوار بن جاتے ہیں وطن پاکستان ہے، والدین مڈل ایسٹ میں ہیں اور یہ خود مغرب کی محبت کے اسیر ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اپنا بچپن عربوں کے ساتھ گزارا ہے اس لیے ہیئت کے لحاظ سے یہ عرب ہیں، تعلیمی ڈگریاں مغرب کی ہیں اور اندر سے خود کو پاکستانی بھی پاتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ کاش پاکستان بھی مغرب کی طرح ترقی کرلے، انھیں زندگی کی وہ تمام آسائشیں مہیا کرسکے جو انھیں دوسرے ملکوں میں میسر ہیں، مگر نہ ایسا ہوگا اور نہ یہ پاکستان جائیں گے۔ بہت پہلے یعنی آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کسی فلم میں راج کپور پر ایک گانا فلمایا گیا تھا، آج ہم سب اس کی سچی تصویر ہیں اور اسی کو دنیا کا

گلوبل ہونا کہتے ہیں۔ میرا جوتا ہے جاپانی، میرا سوٹ انگلستانی، سر پہ لال ٹوپی روسی پھر بھی دل ہے ہندوستانی (پاکستانی)۔

دوہا وہ جگہ ہے جہاں اب ہر طرف امریکن اثر نظر آتا ہے۔ امریکن ریسٹورنٹ، امریکن طرز کے مال، امریکن کمپنیز کی ڈیزائنر دکانیں اور ان مالز میں لمبے سفید لباس میں گھومتے عرب اور کالے عبایوں اور نقابوں سے منہ چھپائے ان کی بیگمات۔ ایک بہت بڑا مال ہے اس مال میں جاتے ہی حیرت سے آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ صرف ہماری ہی نہیں شاید امریکنوں کی بھی کھل جاتی ہوں۔ باہر کے لُو کے تھپیڑوں سے بچ کر آپ جیسے ہی اندر داخل ہوتے ہیں تو وہاں کی ٹھنڈک آپ کو شانت کردیتی ہے۔ آپ کو لگتا ہے جیسے آپ کسی الف لیلوی داستان کا حصّہ بن گئے ہیں۔ سامنے بہتا شفاف پانی، اس پانی کی سطح پر ڈولتا گنڈولا آپ کو وینس لے جاتا ہے۔ اوپر کی طرف دیکھیں تو روشن آسمان ہے جس پر جگہ جگہ بادل بھی نظر آتے ہیں۔ اسی مال کی الف لیلوی راہ داریوں میں آج کے جدید دور کی عالی شان دُکانیں ہیں۔ ایسے ایسے فوڈ سینٹر ہیں جو نیویارک اور شکاگو کو بھی مات کرتے ہیں۔ ان راہ داریوں کی چھت کی طرف نظر کریں تو ایسا نفیس کام ہے کہ آپ دیکھتے ہی چلے جائیں۔ دُکانوں کے اوپر ایسی سجی سجائی کھڑکیاں ہیں کہ مرد حضرات بار بار اوپر دیکھتے ہیں کہ شاید کوئی خاتونِ خانہ پردہ اٹھائے اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھ سکیں مگر افسوس کہ سب توہّم کا کارخانہ ہے۔ ایسے بہت سے مال آپ کو دُبئی میں بھی نظر آتے ہیں۔ گویا سب پیسے کا کھیل ہے۔ پیسا ہے تو بڑے سے بڑا ذہن خرید لیں۔ دنیا آپ کی ہے۔ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ پچیس سال پہلے دوہا محض ایک ویران جگہ تھی ایک سناٹا تھا، اور سفید مٹی میں اٹا ایک صحرا تھا۔ ایئرپورٹ کے بعد پہلی عمارت رماڈا ان کی تھی۔ ایک پتلی سی سڑک تھی جو ایئرپورٹ سے اس شہر کو جاتی تھی جہاں چھوٹی چھوٹی دُکانیں تھیں۔ اور پھر ایک دن اللہ تعالیٰ نے ایک نظرِ کرم کی اور تیل سے مالا مال کردیا۔ مگر یہاں کے لوگوں نے اس تیل کو بہت عقل مندی، ذمّے داری اور ایمان داری سے استعمال کیا۔ آج یہاں دُنیا کے ہر خطّے کے لوگ موجود ہیں۔ میکڈونلڈ، پیزا، ایپل بیس، یوروپین فوڈ، ٹرکش فوڈ، لبنانی

فوڈ، تھائی، عربی، انڈین، مینگولین غرض کون سا کھانا ہے جو یہاں موجود نہیں۔ اس تبدیلی کی سب سے اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ یہاں کی عورت کو تھوڑی سی آزادی مل گئی۔ یہاں کی خاتونِ اوّل اب فرانسیسی ڈریس پہنے نظر آتی ہیں اور ان کا چہرہ بھی اب دیکھا جا سکتا ہے۔ عام عورت کی زندگی میں یہ فرق آیا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ریسٹورنٹس میں جانے لگی۔ اگرچہ وہ اب بھی اپنا لمبا عبایہ پہنتی ہے، مگر کم از کم باہر کی دنیا میں سانس لے سکتی ہے۔ دُبئی کی طرح سیکیورٹی یہاں کوئی مسئلہ نہیں۔ دُکانوں پر کہیں گارڈز نظر نہیں آتے۔ ہاں بازاروں، ریسٹورنٹس اور مالز میں امریکن کبھی کبھی یونی فارم میں نظر آجاتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے، اپنی جنت بنانے کے لیے بھی ان کو امریکا کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

فرانس یا سوئٹزرلینڈ؟

میں فرانس اور سوئٹزرلینڈ پہلے بھی جاچکی ہوں مگر انھیں لوگوں کی طرح کہ جب فرانس کا نام لیتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے پیرس اور سوئٹزرلینڈ نام ہے جینیوا کا۔ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ میں جینیوا اور فرانس کے بورڈر پر ایک گاؤں میں رہ رہی ہوں۔ اس گاؤں کا نام ہے Ornex۔ اس کے برابر والے گاؤں میں ایک مشہور شاعر، مفکر اور فلاسفر والٹیئر پیدا ہوا تھا۔ والٹیئر کے بارے میں، میں نے مختلف جگہ پڑھا ضرور ہے مگر کبھی بھولے سے بھی نہ سوچا تھا کہ مجھے اس کے گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوگا۔ جگہ جگہ اس کے مجسّمے نصب ہیں، بعض جگہوں سے گزرتے ہوئے اس کا محل بھی دیکھ سکتے ہیں۔ وہاں پر جا اس لیے نہیں سکتے کہ یہ محل صرف موسمِ سرما میں کُھلتا ہے اور میں جس موسم میں یہاں آئی ہوں یہ جاتی بہار اور آتی خزاں ہے۔ جیسا کہ میں نے ٹورونٹو کی خزاں دیکھی ہے بالکل اسی طرح رنگین اور خوش رنگ، بلکہ کیوں کہ یہاں کے درخت مختلف ہیں اس لیے اور بھی زیادہ خوب صورت نظر آتے ہیں۔ لگتا ہے لال رنگ کے خوشے ہیں جو درختوں سے لٹکے ہیں۔ یا پھر کوئی سادھو ہے جو زرد لباس میں عبادت میں مصروف ہے۔ زرد اور لال دونوں رنگ اتنے تیز ہیں کہ دن میں ایسے چمکتے ہیں کہ لگتا ہے زرد اور سرخ روشنیاں آنکھوں کو چندھیاتی ہیں۔ اگر اس گاؤں کی بقیہ کیفیات کا ذکر کروں تو ایسا لگتا ہے جیسے

میں حجاب امتیاز علی کی کہانیوں میں سانس لے رہی ہوں۔ اگرچہ اب میں اس عمر میں ہوں کہ ان افسانوں کا سحر ہزار کوششیں کرنے پر بھی مجھ پر طاری نہیں ہوسکتا۔ مگر پھر بھی اس گاؤں کا ماحول مجھے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ یہاں کی پہلی صبح ہم ویرا اور عامر کے ساتھ واک پر جاتے ہیں، تو اس گاؤں کی خوب صورتی مجھ پر اور زیادہ عیاں ہوتی ہے۔ پتلی پتلی سڑکیں جن پر بہت ہی کم ٹریفک ہے۔ کوئی ہائی رائز بلڈنگ نہیں، نہ جانے کیسے یہاں کے رہنے والوں کو یہ شوق نہیں ہوا کہ وہ بھی ماڈرن ہو جائیں۔ مگر ان کے اس ماڈرن نہ ہونے ہی میں ان کا حسن ہے اور ایک پراسراریت ہے۔ چھوٹی چھوٹی دُکانیں ہیں۔ صبح صبح زیادہ تر دُکانیں بند ہیں مگر پھر بھی ہیئر ڈریسرز اور بیکریز کھلی ہیں۔ گھروں میں فرانسیسی دریچے ہیں، زیادہ تر گھر سرخ اور سبز بیلوں سے ڈھکے ہیں، گھروں کے گیٹ لکڑی کے ہیں اور لمبائی میں اتنے چھوٹے ہیں کہ بآسانی ہاتھ ڈال کر کھولے جاسکتے ہیں۔ جگہ جگہ لکڑی کے کٹے ہوئے لوگز رکھے ہیں جو گھروں کے آتش دانوں میں جلائے جاتے ہیں اور ایک ایسی گرمائش دیتے ہیں جو کہ بجلی کے ہیٹرز سے ممکن نہیں۔ بجلی سے گرم کیے جانے والے گھر بے حد گرم ہونے کے باوجود ایک انسیت کی حرارت سے بیگانہ ہوتے ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ مزاج کے اعتبار سے بہت سرد ہوتے ہیں۔

چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچتے ہیں جہاں چوک کے درمیان والٹیئر کا مجسمہ نصب ہے۔ اس گاؤں کا نام فرنی والٹیئر ہے جب کہ ہم جس گاؤں میں ٹھہرے ہیں وہ اورنیکس کہلاتا ہے۔ فرنی والٹیئر وہ جگہ ہے جہاں والٹیئر پیدا ہوا تھا۔ والٹیئر جو ایک مصنف، ایک شاعر اور ایک فلاسفر تھا۔ وہ سولہ سو چورانوے میں پیدا ہوا اور سترہ سو اٹھتّر میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی شہرت کی ایک اور وجہ اس کے اقوال ہیں جو آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔ اس نے اپنی تعلیم پیرس میں حاصل کی۔ اس کے والد اس کو وکیل بنانا چاہتے تھے مگر وہ سترہ سال کی عمر میں ایک رائٹر بن چکا تھا۔ اس کے طنز و مزاح نے اسے مقبولیت بخشی۔ سترہ سو سترہ میں اس نے فرنچ گورنمنٹ کی ایک پیروڈی بنائی جس کے نتیجے میں اسے گیارہ ماہ کی جیل بھگتنی پڑی اور یہیں اس نے اپنی پہلی کتاب Oedips مکمل کی۔ سترہ

سو چھبیس میں اس نے پھر ایک نوبیل مین کا مذاق اڑایا جس کے نتیجے میں اسے پھر سزا ہوئی اس سزا میں اسے چوائس دی گئی کہ وہ جیل کاٹے یا پھر ملک بدر ہوجائے۔ اس نے قید کی جگہ ملک بدری کو ترجیح دی اور سترہ سو چھبیس سے سترہ سو انتیس تک اس نے اپنی زندگی لندن میں بسر کی۔ والٹیئر وہ شخص ہے جس نے اپنی زندگی میں بیس ہزار خط لکھے، دو ہزار کتابیں لکھیں، اس کے علاوہ ڈرامے اور تاریخ کی کتابیں لکھیں۔ اگر آپ نیٹ پر جائیں تو اس کے اَن گنت اقوال نظر آتے ہیں۔

والٹیئر وہ فلسفی ہے جو ہر چیز کی وجوہات جاننا چاہتا ہے (Man of reasons) زیادہ تر اس نے مذہب اور ہسٹری پر ریسرچ کی اور زیادہ تر مذہب کے خلاف لکھا۔ اس کے خیال سے پوپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو بادشاہ بنا دے۔ وہ رائے کی آزادی کا قائل ہے اور اسی کے ہاں کا ایک شخص سے سارتر جو کہتا ہے کہ "میں اگرچہ تمھاری بات سے agree نہیں کرتا لیکن تمھارے حقِ رائے دہی کے لیے اپنی موت تک لڑتا رہوں گا۔ والٹیئر کا کہنا ہے کہ ہر بچہ اس دنیا میں ایک زبان، دو آنکھیں اور ایک ناک لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا دماغ ایک خالی سلیٹ کی طرح ہوتا ہے۔ یہ معاشرہ ہے جو اسے مذہب کے بارے میں سکھاتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں اس کے ان تمام اقوال میں مجھے ایک تعصب کی بو آتی ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ وہ کرسچن اس لیے ہے کہ اسے یہ مذہب سکھایا گیا اور دوسری طرف وہ مسلمانوں اور یہودیوں کو برا کہتا ہے۔ جب وہ ڈراما لکھتا ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام اور مختلف کہانیوں کو ملا کر اس کے مرکزی کردار کو محمد ﷺ کا نام دے دیتا ہے۔ اور وہ مرکزی کردار ایک ولین نظر آتا ہے۔ یہ وہ ڈراما ہے جو اس زمانے میں لکھا گیا جب اسلام اور مسلمان اپنے عروج پر تھے۔ اس کے علاوہ اس کی تحریروں میں فرانسیسی لوگ ایک اعلیٰ ترین قوم کے طور پر ابھرتے ہیں۔ اگرچہ اس لحاظ سے وہ اپنے عہد سے بہت آگے تھا کہ اس کے خیال سے بہترین طرزِ حکومت جمہوریت تھا، وہ جمہوریت جو بہت سی لاشوں پر بنائی جاتی ہے۔ غرض کتنی بھی کوشش کی جائے، آپ کتنے ہی روشن خیال ہونے کا دعویٰ کیوں نہ کریں، کہیں نہ کہیں آپ اپنی زمین اور اپنے مذہب کو سب سے اچھا گردانتے

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی زیادہ تر جنگوں کی وجہ مذہب یا زمین رہی۔

◇

ہم جس گاؤں میں ٹھہرے ہیں۔ یہ سوئٹزر لینڈ اور فرانس کے بارڈر پر واقع ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ کب ہم جینیوا سے فرانس میں داخل ہو گئے، نہ بارڈر پر کوئی روکتا ہے نہ کوئی پاسپورٹ چیک کرتا ہے۔ آپ کو ایک ایسی آزادی کا احساس ہوتا ہے جو امریکا اور کینیڈا جانے والوں کو نصیب نہیں۔ کینیڈا میں آپ کو ہر نسل اور ہر ملک کے لوگ نظر آتے ہیں جب کہ یہاں پر زیادہ تر صرف فرانسیسی ہی نظر آتے ہیں۔ فرانسیسی وہ قوم جو اپنے آپ کو دوسری قوموں سے زیادہ تہذیب یافتہ اور زیادہ اسپیریر سمجھتی ہے۔ انھوں نے ابھی تک اپنی پُرانی قدروں کو بہت احتیاط سے بچا کر رکھا ہے۔ اپنی زبان پر اتنا فخر ہے کہ انگریزی جانتے ہوئے بھی بعض مرتبہ ایسا ظاہر کرتے ہیں جیسے سمجھ نہیں پا رہے۔ یہاں کے جس گاؤں یا شہر میں جائیں ایک سحر سا طاری ہے۔ تمام دنیا جو امریکا کے سائے تلے رہتی ہے، چاہے مڈل ایسٹ ہو یا پاکستان سب جگہیں امریکا کی تہذیب اور زبان سے متاثر ہیں۔ نہ جانے کیسے یہاں کے لوگ اپنے میں گُم ہیں۔ یہاں یہ ماحول دیکھ کر ہم حسد میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ہم کے وقت کے ہاتھوں مجبور ہیں، ہم کہ خودکش حملوں میں گھرے ہیں اور یہاں اب تک لوگ فطرت سے رومینس میں مصروف ہیں۔ ایک بھیانک خواب جس سے ہم جاگنا چاہتے ہیں اور ایک یہ خواب ہے، اتنا رنگین کہ اس سے جاگنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

مگر وہ اک گونہ بے خودی ہمیں کہاں میسر ہے؟ ہم تو ہر دم خبردار ہیں۔ ہوشیار ہیں کہ نہ جانے اگلا قدم کہاں پڑ جائے اور ہم دھویں کے بادل میں گھر جائیں۔ پھر سوچتی ہوں ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ وقت کی کسوٹی ہمیں پرکھتی ہے، شاید ہم اس کسوٹی کے معیار پر پورے اتر جائیں اور ایک بار پھر دنیا کے نقشے پر ابھریں۔ یہ سلسلۂ روز و شب ہر قوم بلکہ پوری کائنات کے لیے ایک کسوٹی ہی تو ہے۔ جو اس کی صعوبتیں سہ کر نکل آیا وہی

آنے والی صدیوں میں کندن بن کر چمکے گا۔

◇

پورا جینیوا ایک دُھند میں ڈوبا ہے۔ لیک جینیوا پر تین کالی بطخیں صبح صبح اپنے شکار کو ڈھونڈتی ہیں، کبھی گہرے پانی میں ڈوب جاتی ہیں اور پھر چند لمحوں بعد کسی اور جگہ سے برآمد ہوتی ہیں۔ رویام اور پیریہان خوش ہو کر چیختی ہیں She got it... she got it...۔ دیکھو اس نے مچھلی پکڑ لی، اس کے منہ میں چھوٹی سی مچھلی ہے۔ اوپر سڑک پر کچھ لوگ جوگنگ کر رہے ہیں، کچھ سڑک کے کنارے بیٹھے گرما گرم کافی کے گھونٹ لیتے ہیں۔ ہم اس بوٹ کے منتظر ہیں جو ہمیں جینیوا کی جھیل پر مختلف جزائر کی سیر کروائے گی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اتنی دُھند ہے کہ معلوم نہیں ہم اس لیک کے گرد بکھرے ہوئے سحر سے پوری طرح لطف اندوز ہو بھی سکیں گے یا نہیں؟ اس کے گرد پھیلے ہوئے پہاڑوں کو دیکھ بھی پائیں گے یا نہیں؟ پانی پر ایک swan ابھرتی ہے بالکل سفید براق۔ پل کے نیچے سے ہوتے ہوئے جیسے وہ باہر آتی ہے اس کے پیچھے پانچ سوانز کا ایک قافلہ ہے۔ ایک کارواں جو نہ جانے کہاں کے لیے رواں ہے۔ ان کے بھی کچھ مقاصد ہوں گے۔ مگر شاید ان کے مقاصد صرف شکار کی تلاش تک محدود ہیں۔ ان کے مقاصد کسی پر قابض ہونا نہیں ہوں گے۔ یہ خصوصیات تو صرف اس اشرف المخلوقات ہی کو حاصل ہیں۔ بوٹ کے آنے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ ہم سڑک پر سوئس لوگوں کے کتوں کے ساتھ سیر کو نکل جاتے ہیں۔ کتوں کے ساتھ اس لیے کہ ہر سوئس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کتا ہے۔ سفید، براؤن، کالے، ہر رنگ کے کتے ہمارے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں بھی موجود ہیں جہاں ہم کافی اور کروسان کے لیے رُکے ہیں۔ نہ جانے کیوں یہاں کا یہ ناشتا مجھے پنجاب کے ناشتے کی یاد دلاتا ہے، جہاں صبح صبح گرم کلچے اور چائے کا ناشتا کیا جاتا تھا اور یقیناً آج بھی کیا جاتا ہوگا۔ شعیب میری ایسی تمام یادوں کو نوسٹیلجیا کا نام دیتے ہیں۔ یہاں امریکا کی طرح کی پابندی نظر نہیں آتی۔ کیوں کہ سگریٹ کا دھواں آپ کو ایک قدیم دنیا میں لے جاتا ہے

جب لوگ اتنا ہیلتھ کونشس نہیں تھے۔ اگرچہ بقیہ چیزوں میں یہ ہیلتھ کونشس ہیں جیسا کہ ان کا زیادہ تر رجحان اورگینک فوڈ کی طرف ہے۔ چھوٹی چھوٹی چڑیاں بھی ہمارے ساتھ ہماری میز پر ناشتے میں مصروف ہیں۔ یہ ایسی مہمان ہیں کہ ان سے کوئی بل نہیں مانگتا۔ ابھی تقریباً سارا جینیوا بند ہے کہ آج ہفتے کا دن ہے۔ بوٹ جس کا نام ہینری ہے، کافی بڑی ہے جس میں سات سو لوگ سما سکتے ہیں۔ آج بوٹ میں زیادہ لوگ موجود نہیں ہیں کیوں کہ یہ ٹورسٹ سیزن نہیں ہے۔ صرف چار میزوں پر مختلف قومیتوں کے لوگ بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک یوروپین لڑکی اپنے بچے کو دودھ پلانے میں مصروف ہے۔ کسی زمانے میں ہمارے یہاں بھی ریلوے اسٹیشنز پر ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے تھے جو ہمارے لیے کافی شرمندگی کا باعث ہوتے تھے۔ رویام اور پیریہان کریونز سے ڈرائنگ کرنے میں مصروف ہیں۔ اچانک پیریہان عامر سے انگریزی میں کہتی ہے، ''ابا، اب میں فرینچ سیکھ رہی ہوں اگر میں انگلش بھول گئی اور آپ نے فرنچ نہ سیکھی تو آپ مجھ سے بات کیسے کریں گے؟'' بات واقعی قابلِ غور تھی۔ پُرانے زمانے میں تو آپ صرف محبوب کے لیے ہی یہ کہتے تھے کہ ''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم'' اب تو بچوں کے لیے بھی یہی کہنا پڑے گا۔ غیرزبان بھی تو آپ کو اپنوں سے دور لے جاتی ہے۔ اگر آج ہماری اماں ہوتیں تو ان کے لیے میرے پوتے پوتیاں قطعاً اجنبی ہوتے۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ انگریزی سیکھ لیتیں۔ خیر، میں نے تو کسی نہ کسی طرح انگریزی سیکھ لی اور ان بچوں سے بات کرسکتی ہوں مگر جو لاڈ میں اپنی زبان میں کرنا چاہتی ہوں وہ ان کے لیے اجنبی ہے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے ہیں، ?What did you say اور میں ان کی طرف حسرت سے دیکھتی ہوں کہ اگر تم میرے کلچر کو سمجھتے تو تمھیں میرے اس جملے سے میری محبت کی شدت کا اندازہ ہوتا، بہرحال...

ہماری ساتھ والی میز پر غالباً پچھتّر یا اسّی سال کا ایک جوڑا بیٹھا ہے۔ عورت جرمن ہے جب کہ مرد غالباً امریکن یا انگریز ہے۔ عورت زور زور سے انگریزی میں بات کر رہی ہے۔ وہ اتنا زور سے بولتی ہے کہ شعیب کا خیال ہے کہ اس کا ساتھی بہرا ہے۔ جب کہ میرا خیال ہے کہ وہ غالباً اس عورت کے ساتھ رہ رہ کر بہرا ہوچکا ہے۔ اور یہ اس کی خوش

قسمتی ہے کہ وہ اب سننے کے عذاب سے نکل چکا ہے۔ کبھی وہ اپنے اسکارف کے رنگوں کی بات کرتی ہے، کبھی اس کی قیمت کی اور پھر ان تمام اسکارفس کی بات کرتی ہے جو وہ پچھلے ستر اسّی برس میں پہن چکی ہے۔ وہ بار بار ایک ہی بات دُہراتی ہے .I am shocked ...I am shocked, I بوڑھا مجبور ہے۔ مگر سوچتا ہے جہاں اتنی گزر گئی وہاں اور بھی گزر جائے گی۔ میں سوچتی ہوں ابھی تو یہ اس عورت کا محبت کا انداز ہے نہ جانے ناراض ہونے کے بعد یہ کتنا زور سے بولتی ہوگی؟ یہاں بھی وہی قصّہ ہے، وہ بار بار اپنے جرمنی کا فخر سے ذکر کرتی ہے۔ ہماری جرمنی میں... ہماری جرمنی میں... کتنا خوب صورت ہے ہمارا جرمنی... اسے اپنے جرمن ہونے پر بہت فخر ہے۔ اسے افسوس اس بات کا بھی ہے کہ اسے جوانی میں ایک سے ایک خوب صورت جرمن ملا مگر اس نے اس کم نسل کو ان سب پر ترجیح دی۔ بات پھر وہیں پر جا پہنچتی ہے کہ ہر شخص اس وہم میں مبتلا ہے کہ اس کے ملک سے اچھا کوئی ملک نہیں۔ اس کا کہنا تھا، اس کے ملک میں لیک جینیوا سے کہیں زیادہ خوب صورت جگہیں موجود ہیں۔ کبھی کبھی اس کی آواز دور ہوجاتی ہے تو میں باہر کے منظر سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ Versoix میرے بائیں طرف ہے۔ شہر خاموش ہے سفید سی گلز کا ایک ہجوم ہے جو اس جگہ پر گھومتا ہے۔ جب بوٹ رکتی ہے تو صرف ایک خاندان بوٹ کا منتظر ہے۔ جھیل کے کنارے وہی زرد، سرخ اور ہری بیلوں سے ڈھکے ہوئے گھر ہیں، پھولوں سے بھرے گملے ہیں جو پل کے دونوں طرف لٹک رہے ہیں۔ ساتھ کی میز پر رننگ کومینٹری جاری ہے۔ آپ کو اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی آواز آپ کو تمام چیزیں دکھا سکتی ہے۔ دیکھو وہ سوانز کیسی محبت سے ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتی ہیں۔ جرمن عورت نے ملامت انگیز نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ خدا جانے اس ملامت میں پچھلے زمانوں کا ذکر تھا یا آج کی شکایت تھی۔ حالاں کہ بوڑھا بے چارہ اب یہ خواہش بھی نہیں رکھتا تھا کہ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے۔ مگر شاید وہ ذکر کر رہی تھی بیتے ہوئے لمحات کا، بیتے ہوئے لمحات جو واپس نہیں آسکتے تھے۔ وہ لمحے جو انھوں نے جرمنی میں گزارے تھے۔ جب ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے۔ وہ بتا رہی

تھی کہ زندگی میں کون کون سی خواہشات تھیں جنھیں اس کا ساتھی پورا نہیں کرسکا۔ ان خواہشات میں اس خواہش کا بھی ذکر تھا کہ اس کے ساتھی نے اسے جی بھر کر چاہا نہیں۔ کتنا اچھا ہے کہ یہ شخص بہرا ہوچکا ہے اور ان شکایات کو نہیں سن سکتا۔ پچھلے آدھے گھنٹے میں، میں نے اسے کسی سوال کا جواب دیتے نہیں سنا۔

بوٹ ایک جگہ رکی تو ہم نے اپنی جگہ بدل لی۔ ویسے بھی اب ہم اس دھند کی سرنگ سے کچھ نکل آئے تھے اور چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑوں اور شہروں سے لطف اندوز ہوسکتے تھے۔ سنا ہے کہ اس بوٹ رائڈ میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب لیک اور آسمان کا رنگ ایک ہو جاتا ہے۔ اس وقت تو کالی جھیل چاندی کے رنگ میں تبدیل ہوچکی تھی۔

◇

Gex ایک چھوٹا سا پہاڑی شہر یا گاؤں جس کو دیکھنے سے ہی ایک ٹورسٹ شہر کے ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ فرانسیسی اور سوئس ریسٹورنٹس کے علاوہ عربی اور ٹرکش ریسٹونٹس۔ مگر ان ریسٹورنٹس سے زیادہ دلچسپ ان گلیوں میں گھومنا تھا۔ دوپہر کے دو بجے تھے اور جیسا کہ فرانس کے چھوٹے شہروں اور گاؤں کا معمول ہے سب لوگ اس وقت قیلولہ کرتے ہیں۔ لگتا تھا کسی ایسی بستی میں گھوم رہے ہیں جہاں سب کو ایک جادو کی چھڑی گھما کر سلا دیا گیا ہے۔ تنگ اور پتلی گلیاں تھیں، پتھر کی چوڑی چوڑی دیواریں تھیں۔ گلیاں اتنی اندھیری تھیں کہ شام ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ لمبے لمبے لکڑی کے مقفل دروازے تھے۔ اگرچہ میرے اگلے جملے سے نہ صرف فرانسیسی ناراض ہوں گے بلکہ وہ پاکستانی بھی ناراض ہوں گے جو خود کو اس پاکستان سے الگ ہوکر دیکھتے ہیں جہاں معمولی لوگ رہتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں پنڈی کے پرانے محلوں میں گھوم رہی ہوں، وہاں بھی دوپہر کو اسی طرح سناٹا ہوتا تھا، ایسے ہی مقفل دروازے ہوتے تھے اور ان دروازوں کے پیچھے کافی بڑے بڑے گھر تھے، بلکہ مجھے یاد ہے کہ میری ایک دوست کے گھر کے پچھلے صحن میں ان کا آبائی قبرستان بھی تھا۔ اب آج فرانس میں ان دروازوں کے پیچھے کیا تھا اس کے لیے

میرے اندر ایک تجسّس تھا۔ اور ظاہر ہے یہ تجسّس ہی رہے گا۔ چٹی ہٹیاں یا تیلی محلے کو میں فرانس سے کیسے تشبیہ دے سکتی ہوں؟ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے اس بات پر سُو کردیا جائے۔ تقریباً ہر محلے یا کہنا چاہیے کہ گلی کے شروع میں ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ ہوسکتا ہے کسی زمانے میں اس میں شرفا کی بگھیاں یا گھوڑے کھڑے ہوتے ہوں۔ گلی اندر کی طرف مڑتی ہے اور پھر وہی چھوٹے چھوٹے دروازے، دیواروں پر سرخ بیلیں اور کھڑکیوں پر سفید لیس کے پردے۔ اس پورے علاقے میں اگر آپ آٹھ نو بجے بھی نکل جائیں تو پورا شہر یا گاؤں جاگتا ہے۔ شاید اسی صبح خیزی کی وجہ سے یہ سب لوگ دوپہر کو آرام کرتے ہیں۔ یہاں کے اسکولوں کے اوقات باقی پوری دنیا سے مختلف ہے۔ پیر اور منگل کو صبح سات یا آٹھ بجے اسکول شروع ہوتا ہے، ساڑھے گیارہ بجے بچے گھر آجاتے ہیں اور دو گھنٹے بعد یعنی ڈیڑھ بجے دوبارہ اسکول جاتے ہیں اور پھر ساڑھے چار بجے چھٹی۔ بدھ کو چھٹی اور پھر جمعرات اور جمعہ کو اسی طرح اسکول۔ ہفتہ اتوار پھر چھٹی۔ کیا مزے ہیں، کاش ہمیں بھی اسکول میں ہفتے میں تین چھٹیاں ملتیں! مگر امریکا میں پڑھائی میں سختی نہیں کی جاتی جب کہ یہاں پر پڑھائی کو بہت سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔ ہر روز ہوم ورک ہوتا ہے اور ماں باپ کو اس سلسلے میں بچوں پر کافی توجہ دینی پڑتی ہے۔

جیکس تک کا راستہ پہاڑی بھی ہے اور راستے میں پہاڑ بھی ہیں۔ کہیں سرسوں کی رنگت کے زرد کھیت ہیں اور ساتھ ہی سورج مکھی کے کھیت جو اپنا وقت پورا کرچکے ہیں اور اب سورج کے نکلنے پر بھی اس کی طرف منہ نہیں کرتے۔ دھند ہونے کے باوجود کبھی کبھی پہاڑ نظر آجاتے ہیں۔

میرے بیٹے عامر کا گھر آرنیکس میں ہے۔ چھوٹا سا لکڑی کا گیٹ ہے، فرنچ ونڈوز ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ فرانسیسی دریچے ہیں۔ ان دریچوں کے باہر لکڑی کے بڑے بڑے دروازے ہیں جو رات کو بند کرلیے جاتے ہیں۔ پچھلے حصّے میں یہ دریچے ایک برآمدے میں کھلتے ہیں جہاں ایک شیشے کی ٹوپ والی کین کی ڈائننگ ٹیبل اور چھ کرسیاں ہیں۔ ایک کونے میں ایک باربے کیوگرل رکھی ہے۔ آٹھ دس سیڑھیاں نیچے اترتی ہیں جو ایک پائیں

باغ تک جاتی ہیں۔ اس باغ میں سیب، ناشپاتی اور آڑو کے درخت ہیں۔ طرح طرح کی بیلیں ہیں جس نے اس باغ پر ایک خوب صورت ماحول طاری کر دیا ہے۔ کیاریوں میں دو تین رنگ کے گلاب ہیں۔ موسم جاتی بہار ہے، اس لیے ہر جگہ پتوں کا قالین بچھا ہے وہ پتے جن کا رنگ صرف اداس خاکی نہیں بلکے ان پتوں میں کہیں زردی گھلی ہے، اور کہیں لالی، کہیں یہ گہرے نارنجی ہیں تو کہیں انگوری، لگتا ہے قندھار کے قالین ہیں جو آپ کے پاؤں تلے خاموش نہیں بلکہ ہلکی ہلکی آواز میں اپنی موجودگی کا پتا دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ فرانسیسی ماحول جو آپ کو صرف فرانس میں ہی مل سکتا ہے۔ میں پھر کہوں گی کہ یہاں حجاب امتیاز علی کے فرانسیسی دریچے، بیلیں، حریری پردے، پائیں باغ اور افسانوی ماحول ہے۔ کمی ہے تو صرف سائمیز بلیوں کی۔ جہاں تک رومانویت کا تعلق ہے تو اس کی کمی ہمارے ایک دوست پوری کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہ دوست جو چند میل کے فاصلے پر جینیوا میں رہتے ہیں۔ اس جوڑے کا نام ہے زینت اور اعظم۔ زینت اور اعظم جو پچھلے پچیس تیس سال سے یہاں رہتے ہیں۔ زینت کی رنگت میں کچھ زیتون کی ملاوٹ ہے جب کہ اعظم کی رنگت ان ہی کی طرح صاف و شفاف ہے۔ آپ زینت سے کچھ دیر بات کریں تو آپ ان کے سحر میں گم ہونے لگتے ہیں اور جن آنکھوں سے وہ خواب دیکھتی ہیں وہ آنکھیں آپ پر فٹ ہو جاتی ہیں۔ دنیا بہت رنگین اور بہت خوب صورت ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید انسان خواب دیکھنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ جب وہ اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے آپ کو اپنے سحر انگیز خوابوں کا حصہ بنا لیتی ہیں تو آپ بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید دنیا اتنی ہی رنگین اور سہانی ہے، اور شاید انسان کے اس دنیا میں آنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ سہانے خواب دیکھیں اور اس پر یقین رکھیں کہ بس دنیا یہی ہے۔ آپ بالکل بھول جاتے ہیں کہ سب توہّم کا کارخانہ ہے۔ انھوں نے جو بھی خواب دیکھے شاید اعظم کی صورت میں زینت نے ان خوابوں کی تعبیر پالی۔ دوسری طرف شاید زینت کا یہی سحر تھا جس نے اعظم کو جینیوا میں پی آئی اے سے ایک پوسٹنگ پر آنے کے بعد واپس نہیں جانے دیا اور پھر وہ بالکل بھول گئے کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ اعظم وہ شخص ہیں جو دھیرے

دھیرے باتیں کرتے ہیں مگر ان کی ہر بات میں تاریخ اور ادب کے حوالے ہوتے ہیں۔ اور اس وقت جب وہ یہ باتیں کرتے ہیں تو وہ قطعاً زینت کے سحر میں نہیں ہوتے۔ ان کی باتیں اس دنیا کی باتیں ہوتی ہیں جہاں آپ اور ہم جیتے ہیں۔ اس میں افغان وار بھی ہوتی ہے، عراق کے عوام بھی ہوتے ہیں اور پاکستان کی سسکتی ہوئی جمہوریت بھی ہوتی ہے۔ ان کی زندگی بھر کی ریاضت زینت کے علاوہ کتابیں ہیں جس نے ان کو اتنا علم دیا ہے کہ وہ اپنے اوپر پورا قابو رکھتے ہوئے، بغیر کسی جذباتی ہیجان کے کسی بھی موضوع پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک اچھے انسان ہیں۔ اچھا میں نے اس لیے کہا کہ ضروری نہیں کہ آپ اگر اچھے مسلمان ہیں تو اچھے انسان بھی ہیں۔ میرا خیال ہے اچھا مسلمان ہونا آپ کا ذاتی مسئلہ ہے مگر جب آپ اچھے انسان ہوتے ہیں تو آپ کے اچھے یا برے ہونے سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ تو اعظم وہ شخص ہیں کہ کسی محفل میں آپ ان کی موجودگی سے خائف نہیں ہوتے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو ان کی طبعِ نازک پر گراں گزرے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں کہ اگرچہ وہ آپ سے متفق نہ ہوں مگر آپ کو اظہارِ رائے کی اجازت دیتے ہیں۔ اندر کی بات تو زینت ہی جانتی ہوں گی مگر جو کچھ بظاہر نظر آتا ہے میں نے اس کا اظہار کر دیا ورنہ بعض مرتبہ تو یہ بھی ہوتا ہے کہ ''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ'' مگر مجھے کون سا کواکب پر کوئی ریسرچ کرنی ہے۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ اعظم سے مل کر آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک شائستہ اور تمیزدار انسان سے بات کر رہے ہیں جس کا تعلق ہماری پرانی تہذیب سے رہا ہے۔ فرانس میں رہنے کے باوجود انھوں نے اپنی پرانی اقدار کو بھلایا نہیں اور نہ ہی اپنے پاکستانی ہونے پر وہ شرمندہ ہیں۔ ان کے بچے جن کی عمریں تیئس اور پچیس کے درمیان ہیں شستہ اردو، فرنچ اور انگریزی بولتے ہیں۔ ہم اسی قسم کی گفتگو کر رہے تھے جب میں نے اعظم سے پوچھا، ''آپ انگریزی، اردو، فرانسیسی، عربی، رشین، ٹرکش سب زبانیں بولتے ہیں، یہ بتائیے کہ آپ خواب کس زبان میں دیکھتے ہیں؟'' ان کے لیے یہ سوال بڑا چونکا دینے والا مگر دلچسپ تھا۔ کہنے لگے، ''یہ بات واقعی قابلِ غور ہے، میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔'' عروج کہنے لگے،

''میرا خیال ہے خواب میں کوئی زبان نہیں ہوتی۔'' میں نے کہا، ''نہیں یہ غلط ہے۔ جب میں اپنی ماں کو خواب میں دیکھتی ہوں تو وہ اپنی اسی یو پی کی زبان میں مجھ سے مخاطب ہوتی ہیں۔'' عامر نے کہا، ''میرے خواب میں اردو میڈیم کا کوئی دخل نہیں۔ میں صرف انگریزی میں خواب دیکھتا ہوں۔''

خیر، بات ہو رہی تھی اعظم اور زینت کی۔ زینت کو فرانسیسی پر پورا عبور حاصل ہے اور وہ فرانسیسی سے انگریزی اور اردو میں ٹرانسلیشن کرتی ہیں۔ اکثر شام کو ان کی ڈیوٹی کورٹ میں ہوتی ہے جہاں وہ ٹرانسلیٹر کا کام انجام دیتی ہیں۔ کھانا پکانے میں اتنی ماہر ہیں کہ بڑی سے بڑی دعوتوں کو پلک جھپکتے نپٹا دیتی ہیں۔ اپنے گھر کو خوب صورت پھولوں سے سجاتی ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک انھوں نے لکھنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنی سوچوں کو کاغذ یا کینوس پر بکھیر دیں تو دوسرے لوگ بھی ان لطیف احساسات سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ ان کی آنکھوں کی سحر انگیزی میں اعظم کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک ہو سکیں گے اور جیسا کہ زندہ رہنے کے لیے خواب دیکھنے ضروری ہیں اسی طرح اعظم اور زینت لازم و ملزوم ہیں۔ کون کس کی محبت میں زیادہ گرفتار ہے، اس کا میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پائی لیکن بہرحال فرانس کے ماحول میں ان کی موجودگی حجاب امتیاز علی کے افسانوں کو مکمل کر دیتی ہے۔ زینت کی آنکھیں سب کہانیاں کہتی ہیں اور اعظم کی بردباری ان کہانیوں کو وقار کا ایک لبادہ پہناتی ہے۔

ان کا خاندان اگرچہ رُبع صدی یہاں گزار چکا ہے اس کے باوجود پاکستان کا ذکر ایسے کرتے ہیں جیسے اس سے کبھی جدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ ایک گلی میں داخل ہوں تو سب سے آخری گھر سے ایک پہلے جو گھر ہے وہ اعظم اور زینت کا گھر ہے جہاں وہ اپنے دو بچوں اسد اور عائشہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ گھر کے دروازے سے جیسے ہی اندر داخل ہوں تو الٹے ہاتھ پر ایک اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں ہے اور سیدھے ہاتھ پر کچن۔ بیٹھنے کا کمرہ بالکل سامنے ہے جہاں بائیں ہاتھ پر ایک آتش دان ہے جس کے ساتھ تین کرسیاں ہیں۔ دو بڑی دیواریں بجائے تصویروں اور ڈیکوریشن پیسز کے کتابوں سے سجی ہیں، کتابوں کی

الماریاں جو تقریباً چھت تک اوپر جاتی ہیں۔ بالکل سامنے کھڑکی سے باہر سیب کے درخت ہیں، ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول ہے جو اس وقت سوکھا پڑا ہے۔ باہر ایک بڑی سی میز پر چالیس پچاس سیب رکھے ہیں۔ جی ہاں سچ مچ کے لال سیب۔ زینت اور اعظم کا گھر ایسا گھر ہے جس میں جا کر آپ فوراً آرام سے ہو جاتے ہیں جیسے گھر آپ کو ویلکم کر رہا ہو۔ زینت اور اعظم دونوں ہمارے منتظر تھے۔ اعظم اسی وقت جمعے کی نماز سے آئے تھے۔ میں نے ان کی کتابیں دیکھ کر کہا، ''میں بہت مرتبہ سوچتی ہوں کہ میں اپنی کتابوں کو اس طرح رکھوں کہ آنکھیں بند کر کے اپنی مطلوبہ کتاب نکال سکوں۔'' زینت نے کہا، ''میں بھی چاہتی ہوں کہ ایسا کروں مگر ابھی تک میں اس میں صرف اتنی کامیاب ہوئی ہوں کہ مجھے معلوم ہے کہ سب سے اوپر کے خانے میں میری مذہبی کتابیں ہیں۔ اس کے نیچے کچھ فلسفے کی کتابیں ہیں۔ پھر اس کے بعد ہربز کی کتابیں ہیں، یہ میرا ایک اور شوق ہے میں کیمیکل دواؤں سے کہیں زیادہ نیچرل علاج اور جڑی بوٹیوں پر یقین رکھتی ہوں۔ پھر یہ لٹریچر ہے سامنے کے شیلوز پر۔'' مجھے سامنے ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آ رہی تھیں اور پھر وہ کتابیں ہر زبان میں تھیں۔ عربی، فرنچ، جرمن، انگلش اور اردو۔ شاید اردو کی کتابیں زیادہ تھیں۔ اور سب سے زیادہ اردو لغت کی جلدوں کی جلدیں تھیں۔

جیروم کے بعد میں آج ایک اور ایسے شخص سے مل رہی تھی جو محبت کا مہاجر تھا۔ زینت سالوں سے اپنے خاندان کے ساتھ جینیوا میں رہ رہی تھیں، جب ان کی ملاقات اعظم سے ہوئی۔ اور اس کے بعد سے آج تک اعظم جینیوا میں ہیں۔ مجھے پرانی نسل سے بات کرنے کا اکثر اتفاق ہوا مگر میں اس نسل سے بہت کم ملی جو اپنی عمر کے اس دور میں ہوں جب ان کو عملی طور پر زمانے کے گرم و سرد سے واسطہ نہ پڑا ہو یعنی نوعمر لوگ۔ آج زینت کے ساتھ ان کی بیٹی عائشہ بھی تھی جس کا تعلق اس نئی نسل سے ہے جس نے اپنی پوری زندگی جینیوا میں گزاری ہے۔ اس کے خیال سے ابتدائی عمر میں کسی پہچان کی ضرورت ہوتی ہے مگر جب آپ اس دور سے نکل جاتے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ identity کے چکر میں پڑیں۔ آج کی دنیا اتنی گلوبل ہے کہ کوئی آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپ کیا

ہیں۔ اگر میں اپنے بارے میں کہوں تو شاید میں اپنے آپ کو سوئس کہوں گی۔ عائشہ کی باتیں سن کر میں نے پھر وہی بات کہی کہ آپ کے پاسپورٹ کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ آپ کہاں کی ہیں۔ میں فی الحال اس پہچان کی بات کررہی ہوں جو آپ کو دیکھنے کے بعد سمجھی جاتی ہے۔ آپ فرنچ بولنے سے فرنچ نہیں بن جاتے اور انگریزی بولنے سے انگریز نہیں ہوجاتے، اگر انگریز پکوڑے کھانے لگے تو اس کا تعلق برصغیر سے نہیں ہوجاتا اور پیزا کھانے سے آپ اٹیلین نہیں ہوجاتے۔ یہ آپ کی سوچ ہے جو آپ کو کسی جگہ سے منسلک کرتی ہے۔

اعظم نے ایڈورڈ سعید کی مثال دی کہ وہ ایک جگہ اپنے بارے میں کہتا ہے کہ کیا میں امریکن ہوں یا عرب؟ اور اگر میں عرب ہوں تو کیا میرا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ایڈورڈ سعید جو ایک فلسطینی تھا اور اس نے ہمیشہ فلسطینی مہاجرین کا ساتھ دیا۔ اس کی سوچ کے مطابق زمین کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ وہاں پر رہنے والوں سے تھا۔ زبان کے سیکھنے کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ آپ اس زبان کے بولنے والوں میں زیادہ آسانی سے ایڈجسٹ ہو جاتے ہیں۔ عائشہ کو سوئس زبان پر پورا عبور حاصل ہے شاید اسی لیے وہ خود کو سوئس لوگوں سے زیادہ نزدیک محسوس کرتی ہے۔ وہ بہت اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اس زبان کے ہر لفظ کے پیچھے کیا کہانی ہے کیوں کہ زبان کی روح تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس کے مزاج کو سمجھیں۔ عائشہ نے جب چند سوالوں کے جواب دیے تو اعظم نے کہا، ''آپ یوں سمجھیے کہ آپ ایک ایسی لڑکی سے بات کررہی ہیں جس کی پرورش ایک ایسے ملک میں ہوئی جس کی آبادی سات ملین ہے، چھبیس کینٹن (ڈسٹرکٹس) ہیں اور چار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تین زبانیں اٹالین، جرمن اور فرنچ سرکاری زبانیں ہیں اور چوتھی زبان رومنچ بولی جاتی ہے۔ انگریزی زبان یہاں سیکنڈ لینگویج کی طرح پڑھائی جاتی ہے۔ اس لڑکی کا تعلق کسی بڑے ملک سے نہیں۔ اس کی کسی نے اس طرح برین واشنگ نہیں کی جس طرح بعض ممالک میں کی جاتی ہے۔''

ہر شخص زندگی میں کچھ خواب دیکھتا ہے۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ باہر کے ملکوں میں رہنے والے لوگوں کے بچے کیا ان کے خوابوں کی تعبیر ہوتے ہیں؟ اس

سوال سے ایک اور سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ کیا اپنی زمین پر رہنے والے اپنے ماں باپ کے خوابوں کی تعبیر ہوتے ہیں؟ اور پھر ایک اور سوال کہ کیا بچوں کو اپنے ماں باپ کے خوابوں کی تعبیر ہونا چاہیے؟ کیا ان کی اپنی ایک الگ آئیڈینٹٹی ضروری نہیں؟ جنریشن گیپ ہر جگہ ہے مگر پاکستان میں پلنے والے لوگ جب باہر جاتے ہیں تو ان میں اور ان کے بچوں میں یہ گیپ کچھ زیادہ ہوجاتا ہے۔ میری کتاب کے موضوع کے لحاظ سے ضروری نہیں کہ میں ہر ایک سے وہ بنیادی سوال پوچھوں، زیادہ تر ایسا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ وقت گزارنے سے ہی مجھے اپنے سوالات کے جوابات ملتے چلے جاتے ہیں۔

◇

اتوار کا دن تھا ہم جنیوا کا پرانا شہر دیکھنے نکلے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سجے سجائے شوکیس ہمارے سامنے تھے، جن میں دنیا کی ہر انواع و اقسام کی چیزیں لگی تھیں اور ان کی قیمتیں ہماری غربت کا مذاق اڑاتی تھیں۔ ہم ہر یورو اور ہر فرینک کو فوراً روپوں میں convert کرتے تھے۔ بھلا ہم ستر ہزار کا جوتا اور ایک لاکھ کا کوٹ کیسے خرید سکتے تھے۔ کچھ دیر پارک میں بیٹھے جہاں چند نوجوان جوڑے اپنے بچوں کے ساتھ جھولوں کے پاس کھڑے تھے۔ پرانے جنیوا کے ماڈل دیکھے، اس جنیوا میں بنی ہوئی وہ سرنگیں دیکھیں جن کے ذریعے یہاں کے لوگ بیرونی حملہ آوروں کو روکتے تھے۔

شام کو پانچ بجے زینت اور اعظم کے گھر پہنچے جہاں انھوں نے ہمارے لیے ایک پارٹی کا انتظام کیا ہے۔ اس پارٹی میں مختلف قومیتوں کے لوگ تھے۔ مگر ایسی قومیتوں کے لوگ جو اردو جانتے تھے۔ زبان جو لوگوں کو منسلک کرتی ہے، زبان جو رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اگر آپ ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھیں تو آپ ایک دوسرے کے لیے گونگے بہرے ہیں۔ یہاں پر ایک جوڑا تھا جن کی بیگم سوئس تھیں اور وہ خود ایرانی تھے۔ ان کی شادی کو چالیس سال ہوچکے ہیں۔ خدا جانے عزیز صاحب کی بیگم آج بھی ان کے گانے اور غزلوں کو سمجھ سکتی تھیں یا نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہندوستانی اداکار فیروز خان

کے کزن ہیں۔ عزیز صاحب بہت اچھا گاتے ہیں۔ غزلیں گاتے ہیں اور مہدی حسن کے مداحوں میں سے ہیں۔ ہر روز باقاعدہ دو گھنٹے ریاض کرتے ہیں اور یہ ریاض ان کی آواز سے ظاہر تھا۔ داغؔ، غالبؔ، اور مومنؔ کی غزلوں سے انھوں نے محفل کو بے حد رنگین کر دیا۔ زبان کے بعد میوزک تھا جو اس بات کا پتا دیتا تھا کہ زینت اور اعظم اپنے کلچر کے کتنے مداح ہیں۔ بقیہ محفل میں کچھ پاکستانی تھے اور کچھ انڈینز۔ اگرچہ ہماری اور انڈینز کی شکلیں اور پہناوا بالکل ایک جیسا تھا مگر اس کے باوجود ہم پہچان سکتے تھے کہ کون پاکستانی ہے اور کون انڈین۔

انڈین جوڑوں میں ایک صاحب اوم پرکاش اور ان کی بیگم تھیں، جو پچھلے اٹھارہ سال سے لزان میں رہتے ہیں۔ اوم پرکاش نیوکلیئر انرجی کے کسی شعبے میں کام کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک سائنٹسٹ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شعر و شاعری اور موسیقی سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ کھڑے نقش والے گورے چٹے، دراز قد اوم پرکاش جن کے لباس میں سب سے نمایاں ان کا سفید اور کالے رنگ کا کوٹ چیک تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے کے صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر عمر نے کوئی شکن نہیں ڈالی تھی۔ البتہ ان کے بال سفید تھے یہاں تک کہ ان کی بھنوؤں تک کے بال سفید تھے۔ جب ہنستے تھے تو ان کی دلکشی اور بڑھ جاتی تھی۔ چند لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مونسون ویڈنگ کے ولین کی طرح ہیں۔ اوم پرکاش کا خیال تھا کہ پاکستان ہندوستان کو اب دوستی کر لینی چاہیے۔ لڑنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔ ہم سب تو بالکل ایک ہی جیسے ہیں۔ دیکھ لیجیے—— ہم سب ایک ہی جیسے ہیں، انفرادی طور پر ہم میں کتنی دوستی ہے یہ تو سیاست دان ہیں جو ہمیں ایک دوسرے سے لڑاتے ہیں۔ ان کی بیگم نے کہا، ”جہاں تک گجرات جیسے واقعات کا تعلق ہے تو وہ تو ایسے ہی ہے جیسے آپ کے یہاں شیعہ سنی کی لڑائی ہوتی ہے۔“ ایک تیر تھا جو میرے دل پر لگا جس طرح وہ اپنے آپ کو اس مسئلے سے الگ اور اپنے ملک کا دفاع کر رہی تھیں اس میں ایک تعصب کی بو تھی۔ کئی مرتبہ لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ ہم تم سے اچھے ہیں۔ کرپشن کے بارے میں بھی ان کا خیال تھا کہ ہمارے یہاں زیادہ ہے اور ان کے یہاں کم۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ ”آپ کا اپنے الیکشن کے بارے میں کیا خیال ہے—— کیا آپ کو

اپنا صدر پسند ہے؟“ میں نے کہا کہ ”جب جمہوری صدر ہے تو آپ اور میں کیوں اعتراض کریں۔ اگر ہماری فوجی حکومت ہوتی ہے تو بھی آپ کو اعتراض ہوتا ہے۔ ہم انفرادی طور پر تو آپ کی جمہوریت پر اعتراض نہیں کرتے۔“ اوم پرکاش نے بتایا کہ ان کا تعلق ہریانہ سے ہے۔ میں نے چونک کر انھیں دیکھا کہ میرا تعلق بھی کبھی ہریانہ سے تھا۔ ان کی اور میری آنکھوں میں ایک شناسائی کی لہر دوڑی اور ساتھ ہی گزری ہوئی یادوں کی ایک تلخی بھی فضا میں بکھر گئی۔ کہنے لگے، ”میری ماں کہتی تھی کہ پارٹیشن کے وقت ہم پنجاب میں رہتے تھے، میں اس وقت دو سال کا تھا جب بلوے ہونے لگے تو میری ماں مجھے اپنے سینے پر سلاتی تھی کہ کہیں جلدی میں مجھے چھوڑ کر نہ چلی جائے۔ کیوں کہ جب مسلمان نعرے لگاتے ہوئے آتے تھے تو لوگ گھبرا کر بھاگتے تھے۔“ میں نے کہا، ”آپ مجھے میری ہی کہانی کیوں سناتے ہیں! کیا عجیب بات ہے کہ میں بھی اس وقت دو سال کی تھی اور میری ماں کی یادوں میں ہندوؤں کے نعروں کی بازگشت تھی۔“ بعض حقیقتیں ایسی ہیں جنھیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرا باپ ایک زمین دار تھا اور اپنے علاقے کا تھانے دار بھی تھا مگر میں نے اپنا بچپن بہت غربت میں گزارا، جہاں ہر چیز ناپ تول کر استعمال کی جاتی تھی، جہاں ہزار چاہنے پر بھی میں خالص تازہ دودھ نہیں پی سکتی تھی، جب میری ماں جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی، بہت سا وقت انھیں قصوں میں گزرا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے ماں باپ کے پاس اتنا پیسا تھا کہ ہر وقت صندوق بھرے رہتے تھے۔ نہ ان نعرے لگانے والے لوگوں میں میرا باپ تھا نہ تمھارا۔ مگر کوئی تو تھا جس نے خون کی ندیاں بہادیں۔ میرے دوست میں کیسے تم پر بھروسا کروں اور اگر کر بھی لوں تو تم مجھے کیسے معاف کرو گے؟ تم جو آج بھی خود کو اور مجھے مختلف سمجھتے ہو۔ تمھاری زمین تمھیں پیاری ہے اور میری زمین سے بڑھ کر میرے لیے کچھ نہیں۔ تم اور میں تو وہ غریب قومیں ہیں جو صرف تلاشِ معاش کی خاطر بستی بستی، قریہ قریہ گھومتی ہیں۔ ہم کہ ڈالر، فرینک اور یورو کے بھکاری ہیں۔ تم کہتے ہو کہ تم دنیا کے گلوبل ہونے پر یقین کرتے ہو، تمھارا خیال ہے کہ تمام زمین خدا کی ہے۔ آپ کہیں بھی رہیں آپ خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتے مگر پھر بھی

تمھاری باتوں میں، تمھاری آنکھوں میں اپنی زمین کی محبت جنیوا کی زمین سے زیادہ ہے۔ تم آج بھی اپنی زبان کے عاشق ہو، تم آج بھی میری سوچ کو جاننا چاہتے ہو، تم چاہتے ہو کہ میں اپنی کتاب ہندی میں ٹرانسلیٹ کراؤں، تمھاری بیوی آج بھی اپنا لباس پہنتی ہے۔ یہی حال زینت اور اعظم کا ہے جو آج بھی اپنی زمین سے محبت کرتے ہیں، اس کے باوجود کہ وہ پاکستان کی کرپشن کو برا جانتے ہیں۔ گھر تو آخر اپنا ہے۔

یورپ میں، میں نے محسوس کیا کہ لوگ امریکا سے دل میں کینہ رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے یوروپین ہونے پر فخر ہے۔ زمین کی محبت یہاں تک ہے کہ جنیوا اور فرانس کی سرحد پر رہنے والے لوگ، وہ جگہ جہاں ایک طرف سوئس کھیت ہے تو اس کے بالکل ساتھ فرانسیسی کھیت ہے اپنی فصل، اپنی گائے، اپنے دودھ اور اپنے پنیر کو دوسرے سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ دور سے پہچان لیتے ہیں کہ کون سی گائے سوئس ہے اور کون سی فرانسیسی۔ شاید کوئی وقت ایسا بھی آجائے کہ جانوروں کے لیے بھی سرحدی شناخت ختم ہوجائے اور جرمن شیپرڈ امریکن شیپرڈ کہلانے لگے!

Chillon

ایک ٹھہری ہوئی اداس صبح، زرد پتے درختوں کے نیچے ساکت ہیں۔ کبھی کبھی ایک زرد پتا خاموشی سے بالکل بے آواز ہوکر ان ساکت پتوں کا ساتھی بن جاتا ہے اور پھر انھیں کی طرح ساکت ہوجاتا ہے۔ یہ ایک پتا پوری کائنات کی کہانی کہتا ہے۔ اس میں افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں۔ بقول زارا کے It is a circle of life۔ زارا جس کی عمر پانچ سال ہے۔ کینیڈا میں بعض ایسے شعبے ہیں جو بچوں کے ڈیولپمنٹ پر نظر رکھتے ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں زارا سے پوچھا گیا کہ تم بڑی ہوکر کیا بننا چاہتی ہو؟ کہنے لگی، ''میں بڑے ہوکر vet بنوں گی۔ کیوں کہ مجھے جانور بہت پسند ہیں۔ اور تمھیں پتا ہے کہ میرے پاس چھوٹے چھوٹے بطخوں کے بچے (ducklings) تھے انھیں جنگلی جانوروں نے کھالیا۔'' انٹرویو لینے والی نے کہا، ''اوہو— یہ تو بہت بُرا ہوا! مجھے بہت افسوس ہوا، آئی ایم سو سوری۔'' زارا نے جواب دیا، ''یو ڈونٹ ہیو ٹو بی سوری۔ اٹ از اے سرکل آف لائف۔'' مگر زارا آج کے دور کی بچی ہے۔ میں جس زمانے کی پیداوار ہوں وہاں ہر چیز میں اُداسی گھلی تھی۔ جب ہر چیز دھندلی تھی۔ مستقبل تھا جس کی کوئی راہیں معین نہیں تھیں۔ ایک احساسِ محرومی تھا، اعتماد چکنا چور تھا، اپنے آپ کو پھر سے سمیٹنا تھا تاکہ زندگی کو نئے سرے سے شروع کیا جاسکے۔ اگرچہ یہ سب شعوری نہیں تھا مگر کہیں دور ذہن کی گہرائیوں

میں سب کو معلوم تھا کہ ایک اجنبی سرزمین ہے جہاں ہمیں بہت احتیاط سے چلنا ہے۔ ایک نازک وقت ہے، ایک نازک راہ ہے جس پر ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہے۔ پچھلے ساٹھ سال میں ہم نے اپنے آشیاں کو بنایا مگر کیا ہمارے لگائے ہوئے تنکے اتنے کم زور تھے کہ آج پاکستان میں ہر شخص خوف زدہ ہے۔ نوعمر لڑکے جو ہر چوراہے پر ٹی ٹی لیے گھومتے ہیں، کیا ہماری نسل پچھلے ساٹھ سال میں انھیں صرف یہی دے سکی؟

ہم فرنے سے کب کے نکل چکے تھے۔ والٹیر کا اسٹیچو مجھ سے کہیں دور تھا۔ ایک کے بعد ایک سرنگ سے ہماری گاڑی گزر رہی تھی۔ کچھ مناظر الفاظ میں قید نہیں کیے جاسکتے بلکہ کہنا چاہیے کہ فوٹوگراف بھی اس کی صحیح عکاسی نہیں کرسکتی۔ دائیں طرف چمکتی ہوئی جھیل تھی جو دونوں طرف سے پہاڑوں سے گھری تھی۔ لگتا تھا اس جھیل نے بڑی مشکل سے ان پہاڑوں کے درمیان اپنا راستہ بنایا تھا۔ کبھی وہ جھیل دُھند میں گم ہوجاتی اور کبھی آئینے کی مانند اس طرح چمکتی کہ اس پر نظر نہ ٹھہرتی۔ اور ان پہاڑوں اور جھیل کے اوپر بادل تھے، جو جھیل پر سایہ کرتے تھے اور پھر ان سب کے اوپر سورج جو جھیل کو اپنے حصار میں لینے کے لیے کبھی بادلوں سے لڑتا اور کبھی پہاڑوں سے۔ کیسی وی آئی پی تھی وہ جھیل جسے کائنات کی تمام چیزیں اپنے گلے لگانے کو بے چین تھیں۔ بائیں طرف درخت تھے اور ایک ڈھلان تھی جس کے اوپر نیچے گھر بنے تھے، جس کے مکین اس نظارے کو اتنی مرتبہ دیکھ چکے تھے کہ آج اس کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ منظر ہر دم بدلتا تھا اور میں اس کے سحر میں گُم تھی۔ میں کہ سروں کی رسیا ہوں، اس جھیل اور پہاڑوں میں بھی سروں کو سن سکتی تھی۔ منظر بدلتے تھے مگر جھیل اور پہاڑ اپنی جگہ پر قائم تھے۔ ان کی جگہ تبدیل نہیں کی جاسکتی تھی۔ بارہ نوٹس میں جھیل اور پہاڑ سا اور پا کی طرح تھے۔ رے گاما دھانی۔ تیور سر ہیں۔ وہی سر ''ر۔ گ۔ م۔ دھ۔ ن'' یعنی کومل سر ہیں۔ ان دس سروں کو کبھی آپ کومل بجاتے ہیں کبھی تیور۔ کبھی دو کومل اور دو تیور سر بجاتے ہیں کبھی چار تیور اور دو تین کومل بجاتے ہیں۔ ہر مرتبہ ایک نیا راگ اور نئی کیفیت جنم لیتی ہے۔ انھیں کومل اور تیور نوٹس کے امتزاج سے آپ مختلف راگ بناتے ہیں گویا تیور اور کومل کی جگہ بدلتی رہتی ہے مگر سا اور پا وہ نوٹس ہیں

کہ ان کی جگہ قائم ہے۔ سا اور پا مرکزی کردار ہیں جن کے گرد بقیہ کردار گھومتے ہیں۔ جھیل اور پہاڑ اپنی جگہ قائم ہیں، کائنات کی بقیہ تمام چیزیں ان کے گرد گھومتی ہیں کومل اور تیور نوٹس جو اس قائم سا اور پا کی کیفیت بدل دیتے ہیں۔ ایک ڈرامے کے کردار کی طرح جو اسی اسٹیج کو کبھی غم میں تبدیل کردیتے ہیں اور کبھی خوشی میں۔ اسٹیج بذاتِ خود کسی کیفیت کا حامل نہیں یہ تو کردار ہیں جو منظر میں تبدیلی لاتے ہیں۔ سا اور پا جو بذاتِ خود نہ خوشی ہیں نہ غم وہ تو ساکت ہیں کومل اور تیور اسی پا اور سا کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ بقیہ دس نوٹس دن، رات، بادل، بارش، سورج، چاند، برف، طوفان اور پرندے اس کی شکل بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی بادل اور بارش ساون کے راگوں کو چھیڑتے ہیں، کبھی چاند کی چاندنی جذبات کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے، کبھی اُبھرتا سورج صبح کا راگ بھیروں بجاتا ہے اور کبھی ڈوبتا سورج ماحول کو اداس کرکے بھیم پلاسی اور ملتانی کی سی کیفیت میں مبتلا کردیتا ہے۔ مگر پا اور سا، جھیل اور پہاڑ اسی جگہ قائم رہتے ہیں۔ کومل اور تیور سر اس نظارے کی کیفیت کو بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی آپ صرف سا کی آواز سنتے ہیں اور کبھی پا کی۔ بادل سا اور پا (جھیل اور پہاڑ) سے اٹکھیلیاں کرتے ہیں۔ کبھی چاندنی ان سے کھیلتی ہے، کبھی بارش کی کومل بوندیں اسی منظر کو میاں کی ملھار میں بدل دیتی ہیں۔ کبھی اندھیری رات میں آپ راگ ایمن اور درباری سن سکتے ہیں اور کبھی کیدار راگ جھیل پر اڑتے ہوئے پرندوں کو پنچھی باورا میں تبدیل کردیتا ہے۔ رات میں راگ ایمن کا وادی سر؛ گندھار؛ چاند کی جگہ لے لیتا ہے اور سم وادی؛ نکھاد؛ چاندنی کا کام کرتا ہے۔ پہاڑ پنچم بن جاتا ہے اور نکھاد whirling derwaish کی طرح پنچم کے گرد گھومتا ہے اور درخت اور جھیل تین تال پر ان کے ساتھ محوِ رقص ہوجاتے ہیں۔ جوں جوں رات بڑھتی ہے راگ ایمن آروہی کی طرف جاتا ہے۔ اور پھر ایک خوابِ آلود حسینہ کی طرح صبح بیدار ہوتی ہے، ستاروں کا سیمابی کارواں ڈوب جاتا ہے، سر اوروہی کا سفر اختیار کرتے ہیں اور وہی سا اور پا ماحول کو بھیروں میں تبدیل کردیتے ہیں۔ کائنات کسی استاد سے نئے راگ کو بجانے کی اجازت نہیں مانگتی کیوں کہ کائنات تو خود ایک بہت بڑی استاد ہے۔ کسی سے اجازت لیے بغیر طوفان سا اور

پا کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔ اور گرجتے بادل اور گرجتی برستی آندھی میں آپ مالکونس کی آواز سنتے ہیں۔ مالکونس جو ایک ایسا راگ ہے کہ پتھروں کے دلوں کو پگھلا دیتا ہے۔ دیوہیکل پہاڑوں کے درمیان جھیل پر چنگھاڑتی ہوائیں مالکونس بن کر جھیل میں شگاف ڈال دیتی ہیں۔ کبھی صرف جھیل نظر آتی ہے اور کبھی آپ صرف پہاڑ دیکھ سکتے ہیں، پا اور سا آپ کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتے ہیں پوری کائنات پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور آپ کہہ اٹھتے ہیں کہ:

نہیں ہے کوئی اس کے سوا

لوگ آتے ہیں، اپنے اپنے موڈز کے لحاظ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مختلف رُتیں آنے والوں کو نئی نئی کیفیات سے دوچار کرتی ہے۔ آپ سفر کرتے رہتے ہیں اور سا اور پا آپ کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ یہ سر آپ کو اُداس بھی کرتے ہیں اور خوش بھی۔ راستے میں آپ چارلی چیپلن کا شہر ویوا بھی دیکھتے ہیں، وہ چارلی چیپلن جس نے پوری دنیا کو ہنسایا بلکہ آج تک ہنساتا ہے اس نے امریکا کو چھوڑ کر اپنے رہنے کے لیے اس جگہ کو منتخب کیا۔ یہ شہر امیروں کا شہر ہے جہاں بڑے بڑے محلات ہیں، قلعے ہیں، ریسٹورنٹ ہیں اور coffee ہے... کافی — کافی — کافی، جس کی خوش بو ہر وقت فضا میں بکھری رہتی ہے۔ یہاں کا کلچر نامکمل رہے گا اگر اس میں کافی کی مہک شامل نہ ہو۔

گاڑی ایک جگہ رکتی ہے اور ہم اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جو ہماری آج کی منزل ہے۔ Chateau de chillon ایک خوب صورت قلعہ، آرکیٹیکٹ کا ایک بہترین نمونہ جو بارھویں صدی میں بنایا گیا۔ یہ جگہ ایک پہاڑی جزیرہ ہے جس کو قلعہ بنانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ آج ہم اس کی جو شکل دیکھتے ہیں اس کا سہرا ان تین ادوار کو جاتا ہے جب مختلف لوگوں نے اس پر حکومت کی۔ اس قلعے کا محلِ وقوع ایسا ہے کہ صدیوں تک اس جگہ سے پورے یورپ کی شمالی اور جنوبی نقل و حرکت پر نظر رکھی جاتی تھی۔

ساووئے — دور بارھویں صدی سے پندرہ سو چھتیس تک۔

برنیز — دور پندرہ سو چھتیس سے سترہ سو اٹھانوے تک۔

ویڈوس — سترہ سو اٹھانوے سے آج تک۔

دو سو ساٹھ سال تک اس قلعے کو arsenal اور قید خانے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس میں پانچ کورٹ یارڈ ہیں۔ بیالیس کمرے ہیں، اور اَن گنت راہ داریاں ہیں۔ وہ حصّہ جو زمین کی طرف ہے دفاع کے طور پر استعمال ہوتا تھا جب کہ جھیل کی طرف رہائشی علاقہ تھا۔

قلعے میں داخلے کا راستہ ایک اٹھارویں صدی کا پل ہے، جو ایک ٹاور کو جاتا ہے۔ اس میں آپ کو ہر طرف بنی ہوئی مختلف اشکال نظر آتی ہیں۔ جو مڈل ایجیز میں (Tempra technique) گوند، پانی اور رنگین پگمینٹیشن کو ملا کر بنائی جاتی تھیں۔ اسی کورٹ یارڈ میں دونوں طرف اصطبل تھے۔ آج کل یہ جگہ ریسپشن کے طور پر استعمال ہوتی ہے جہاں سے آپ آڈیو گائڈ کرائے پر حاصل کر سکتے ہیں۔ بائیں ہاتھ پر چند سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی ہیں۔ یہ جگہ چھوٹے چھوٹے گوداموں اور جیل کے کمروں پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے آپ کو شراب کے بیرلز نظر آتے ہیں، اگلے کمرے میں کھانے پینے کی چیزیں ہیں جس میں اناج، سبزیاں، پھل اور گوشت وغیرہ شامل تھا۔ اس کے علاوہ دیوار پر دھوئیں کی کالک اس بات کا پتا دیتی تھی کہ یہ جگہ کھانے پکانے کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ یہاں پر اس زمانے کے پہرے داروں کی موجودگی کو آپ محسوس کر سکتے تھے۔ ان دو کمروں کے فوراً بعد وہ کمرہ تھا جہاں لوگوں کو پھانسی دی جاتی تھی۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ آج یہاں ایک ہلکا بجلی کا بلب جلتا تھا، یقیناً کسی زمانے میں یہاں پر مشعلوں سے روشنی کی جاتی ہوگی۔ ایک طرف ایک پتھر کی سلائڈ سی تھی اور اس کے ساتھ پھانسی کے لیے ایک موٹی سی رسّی تھی، جو پھندے کی صورت میں ایک سلاخ سے ٹنگی تھی۔ میں وہاں سے واپس مڑنا چاہتی تھی مگر اندر ایک اور محراب تھی جہاں قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ یہ بھی ایک اندھیرا کمرہ تھا مگر اس میں بہت ہی پتلی پتلی لمبی کھڑکیاں تھیں، کھڑکیاں کیا تھیں درزیں تھیں جن سے معمولی روشنی کمرے میں آتی تھی۔ کمرے میں چند ستون تھے۔ یہ کمرہ اس قلعے کا سب سے اہم کمرہ اس لیے ہے کہ یہاں ایک قیدی کو چھ سال تک ایک ستون سے باندھ کر رکھا

گیا تھا۔ اور اسی لیے یہ کمرہ بونیوارد کے قید خانے کے نام سے مشہور ہے۔ (Bonivard's Prison)۔ اس کی ایک اور وجہِ شہرت مشہور شاعر لارڈ بائرن کی وجہ سے ہے۔ اٹھارہ سو سولہ میں بونیوارڈ کی قید کو بائرن نے اپنی ایک نظم میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بونیوارڈ کی اس چھ سالہ کیفیت کو محسوس کرنے کے لیے خود بائرن نے کافی دن اس قید خانے میں گزارے۔ اس نظم کا نام "Prisoner of Chillon" ہے۔ یہ کردار تاریخ میں ایک آزادی کے سمبل کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اسی کمرے کے ایک ستون پر بائرن کے دستخط بھی ہیں۔ نظم کے پہلے حصّے میں اس نے آزادی کے بارے میں لکھا ہے کہ آزادی کو چاہے کسی گہرے تہ خانے میں بھی رکھ دیا جائے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو کتنا بھی دبایا جائے وہ کہیں نہ کہیں اپنا راستہ بنالیتی ہے اور بونیوارڈ کی صورت میں ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید ہوجاتی ہے۔ دوسرے میں وہ بونیوارڈ کی اپنی آواز میں اس کی کہانی سناتا ہے، ''میرے بالوں کی چاندی میری کہانی کہتی ہے، میرے بالوں کی یہ چاندی نہ گزرتے ہوئے وقت کے باعث ہے اور نہ ہی یہ چاندی ایک رات میں میری ساتھی بنی ہے۔ ہم کہ کبھی سات تھے مگر آج میں اکیلا ہوں۔'' اگلے حصّے میں وہ شیلون کے اس کمرے کو بیان کرتا ہے جس میں بونیوارڈ قید تھا۔

شیلون کے پُرانے قلعے میں سات ستون ہیں۔ یہ ستون جو روشنی کو ترستے ہیں۔ سِلے ہوئے کالے بے رنگ ستون۔ ہر کالے ستون میں ایک لوہے کا کڑا ہے اور ہر کڑے میں ایک زنجیر ہے۔ لوہے کی یہ زنجیر جو خطرناک دانتوں کی طرح ہے۔ میں دن رات اس خوف ناک زنجیر کو دیکھتا ہوں۔ ان آنکھوں سے جنھوں نے سالوں سے سورج کو ابھرتے نہیں دیکھا۔ اتنے سالوں سے کہ میں ان کی گنتی بھول چکا ہوں۔ میں نے اس دن سے گننا بند کردیا۔ جس دن میرا آخری بھائی گر کر مرگیا اور میں بے بسی سے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

انھوں نے ہم سب کو الگ الگ ستونوں سے باندھ دیا۔ ہم تین تھے مگر تینوں اپنی اپنی جگہ اکیلے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم جو ہل بھی نہیں سکتے تھے۔ ہم کہ ایک جگہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو گئے تھے۔ پھر بھی

ہم اکٹھے تھے کہ ہمارے خواب ایک تھے۔ ہم آزادی کے ترانے گاتے تھے۔ مگر ایک دن وہ بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ ہماری آوازیں پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر خود پتھر ہوگئیں۔ اگرچہ ان آوازوں میں زیادہ درد تھا۔ مگر وہ ہماری آوازیں نہ لگتی تھیں۔

میں کہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اپنے بھائیوں کی ہمت بڑھاتا تھا۔ اور وہ دونوں میرا حوصلہ تھے۔ سب سے چھوٹا جو میرے والد کا پیارا تھا۔ میری ماں کی نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر شیشے کی طرح چمکتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک خوب صورت پرندے کو ایک پنجرے میں بند کردیا گیا تھا۔

میرا دوسرا بھائی ایک طرف مہربان تھا تو دوسری طرف اپنی جنگ مضبوطی سے لڑتا تھا۔ مگر پھر میری آنکھوں کے سامنے وہ مرجھانے لگا۔ زنجیروں کی آواز موت کی طرح اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگی۔ وہ جو ایک آزاد شکاری تھا۔ وہ جو جنگلوں میں بھیڑیوں کا شکار کرتا تھا۔

آج میں شیلون کی دیواروں کے بیچ تھا۔ ہزاروں فٹ نیچے۔ جہاں کیچڑ ہی کیچڑ تھا۔ ہر طرف لہریں تھیں۔ یہ ایک قبر تھی جس میں ہم دفن تھے۔ دن اور رات ہم خوف ناک آوازیں سنتے تھے۔ کتنی سردیاں اور کتنی گرمیاں گزر گئیں۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے موت بہت نزدیک ہے۔ اور وہ ہمیں اس قید سے نجات دلا دے گی۔

اور پھر میرا بھائی زندگی سے دور ہوگیا۔ اس نے کھانا بند کردیا۔ یہ نہیں کہ وہ بزدل تھا۔ مگر ہم آزاد رہنے والے لوگ تھے۔ آزاد رہنے والے میرے بھائی کا دم اس سرد محل میں گھٹتا تھا۔ میں صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ وہ مرگیا وہ جو مجھے بہت پیارا تھا اس کی زنجیریں کھول دی گئیں ایک گڑھا کھودا گیا اور اسے دفن کردیا گیا۔ میری کتنی بے کار خواہش تھی کہ اسے ایسی جگہ دفنایا جائے جہاں وہ سورج کی کرنوں کو محسوس کرسکے، اس اندھیری غار میں اسے سکون نہیں مل سکتا تھا۔ وہ ظالم اس بات پر ہنسے اور اسے اس گڑھے میں پھینک دیا۔ اس کی خالی زنجیریں ہوا میں ہلتی رہیں اور مجھے اس کی یاد دلاتی رہیں۔

اس قیدِ تنہائی کے کمرے پر نظر ڈالیں تو اس کے ہر حصّے میں آپ کو اپنا دم گھٹتا ہوا

محسوس ہوتا ہے جانے کیوں بنانے والے نے اسے اس طور بنایا ہے کہ جب ایک محراب دوسری محراب کو ملاتی ہے تو اس پر ایک Rib cage کا گمان ہوتا ہے یا پھر ایک آہنی پنجہ ہے جو آپ کو اپنی گرفت میں لیتا محسوس ہوتا ہے۔ جانے بونیوارڈ نے چھ سال اس قید میں کیا محسوس کیا ہوگا۔ اور پھر ایسے چھ سال جب وہ مستقل ایک ستون سے بندھا رہا۔ وہ ایک سیاسی قیدی تھا اور یقیناً یہ زمین کی محبت ہوگی جس کے جرم میں اس نے ایسی سزا کاٹی۔

میرے لیے اس لمحے ہر کونے میں بونیوارڈ کی خوش بو تھی۔ جانے کیسے مجھے ایسا لگا جیسے میں بونیوارڈ کی موجودگی کو وہاں محسوس کر سکتی تھی۔

میں کہ ان پسلیوں میں ایک دھڑکتے دل کی طرح ہوں۔ میں جو کبھی بے خوف تھا۔
میں جو وطن کی محبت میں گرفتار تھا۔ میری اس محبت اور بے خوفی نے رنگ دکھایا۔
اور مجھے یہاں اس جھیل کی سطح سے بہت نیچے۔ ایک ایسے پنجرے میں بند کر دیا
جس کی سلاخیں مجھے ایک آہنی پنجے کی طرح اپنے اندر مسلتی ہیں۔
کیا میں اپنے کیے پر پچھتاتا ہوں؟
نہیں میں خوش ہوں کہ ہو سکتا ہے۔ چند اور دل میری طرح
وطن کی محبت میں گرفتار ہونے کی تمنا کریں
میں کہ اس زہر کو دھیرے دھیرے اپنے اندر اتارتا ہوں
جب اس نیلی جھیل کا کوئی نم جھونکا مجھے چھوتا ہے،
تو وہ میرے لیے خوش بوئے زلفِ بہار ہے
مجھے نہیں معلوم کہ تاریخ میرے بارے میں کیا لکھے گی
میں کہ میں نے اس جھیل کو ہر رنگ میں دیکھا ہے
کبھی ہواؤں کی آواز میں کبھی دھوپ کی کرنوں میں۔
میرا تصور اس جھیل پر رنگ بکھیر دیتا ہے
میں دھڑکتا ہوں رگِ جاں میں کسی دل کی طرح
مجھ کو شیلون نے صدیوں کی رفاقت دی ہے

قید رکھا ہے مجھے وقت کی فصیلوں میں
میں چمکتا ہوں ابھی تک کسی موتی کی طرح ۔

ہم اس کمرے سے باہر آئے تو ہر طرف دھوپ تھی اور اتنی دیر اندر گزارنے کے بعد آنکھیں اس دھوپ میں بند ہوئی جاتی تھیں۔ مگر ابھی تو قلعے کا بہت سا حصّہ باقی تھا۔ جانے کیوں اس حصّے کو سب سے پہلے دکھایا گیا۔ دل میں ایک خاموشی تھی جو بونیوارڈ کو خراجِ عقیدت پیش کرتی تھی۔ پہرے داروں کے قہقہے تھے جو دل میں چبھتے تھے۔ اور تاریخ تھی جو شاید صرف ظلم کرنا جانتی ہے۔

◇

کہنے کو کسی دو شرابوں کے ملنے سے نشہ دو آتشہ ہو جاتا ہے لیکن اگر میں انسانی حسوں کی بارے میں لکھوں تو بہترین لذت وہ ہے جو ایک وقت میں آپ کسی ایک حس کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک بار پھر جنیوا کے نظارے تھے، ہر طرف خوب صورت پہاڑ تھے، ہلکے بادل تھے، آتی خزاں تھی جس نے خوب صورتی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ بعض پتے ابھی تک درختوں پر موجود تھے اور زمیں بوس ہونے کے لیے اپنے رنگ بدلتے تھے۔ زمین ان کی منتظر تھی، وصال کے اس لمحے کے لیے جب وہ ان رنگ بدلتے پتوں کو اپنے اندر جذب کر لے گی۔ درخت ہر رنگ میں موجود تھے نارنجی، آتشی، لال اور پھر مانجھے کے رنگ کی طرح زرد۔ گاڑی میں زیب اور ہنیا کا ایک فارسی گانا بج رہا تھا۔ ویرا کا اصرار تھا کہ میں اپنے چاروں طرف کے خوب صورت ماحول کو دیکھوں مگر میری حسِ سماعت کہتی تھی کہ صرف سُن، سُن، سُن — کہ کیا آواز ہے کیا الفاظ ہیں۔ میں اپنی سماعت کو قطعاً دو آتشہ کرنے کو تیار نہیں تھی۔ جو لذت وحدت میں ہے وہ دوئی میں کہاں۔ میں اس وقت صرف حسِ سماعت سے محظوظ ہونا چاہتی تھی، میں کسی اور چیز کی ملاوٹ سے اسے آلودہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کیا موسیقی تھی! کیا تال تھی! اور پھر...

میرے محبوب کی آنکھیں شراب کے پیمانے کی طرح ہیں
ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا نشہ اور بڑھ جاتا ہے،
آؤ ——
مجھے ایک اور پیمانہ دو
کہ میں جی بھر کر زندگی کا لطف اٹھا سکوں۔

میں بار بار اس گانے کو سننا چاہتی تھی۔ لگتا تھا کہ شاید یہ تمام عمر بھی بجتا رہے تو... اس کے الفاظ اور ادائیگی میں ایک کلچر کی خوش بو تھی۔

گاڑی ایک دروازے پر رُک گئی۔ یہاں رویام اور پیریہان کی دوست کیتھلین رہتی ہے۔ آٹھ سالہ کیتھلین جس کی ماں فلپائن کی ہے اور باپ ڈچ ہے گویا دو آتشہ شراب سے ایک اور شراب بنی ہے۔ اس پر سونے پر سہاگا یہ کہ یہ سب فرانس میں رہتے ہیں اور پھر ایک دوسرے سے انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ شاید ایسے لوگ زیادہ مضبوط ہوتے ہوں، اپنے اندر زیادہ تنوع رکھتے ہوں، کسی بھی ایک تہذیب کے غلام نہ ہوتے ہوں شاید یہ سب کوہِ طور کو برداشت کرنے کی قوت رکھتے ہوں جب کہ مجھ جیسے لوگ کہ پوری دنیا گھومنے کے باوجود اپنی جڑوں کو اتنی مضبوطی سے پکڑے ہیں کہ کسی طرح اپنی زمین سے جدا ہی نہیں ہونا چاہتے۔ ہوسکتا ہے ایسے لوگوں کی نظر میں، میں یکسانیت کا شکار ہوں، پسند اپنی اپنی۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ:

مجھے ایک پیمانہ اور دو
کہ میرے محبوب سے زیادہ کوئی اور خوب صورت نہیں!

جدائی

وہی Dunhill, channel اور کاسمیٹکس کے اشتہار، کافی شاپ کی خاموش دکانیں، شوکیس میں لگے سووینئرز، مسافروں کے بھاری قدم، ایئرپورٹ کی بہت روشن مگر اداس روشنیاں، سرگوشیوں میں بات کرتے ہوئے چہرے، پینٹ شرٹ، قمیص شلوار، اسکرٹ اور ساری میں ملبوس ہر رنگ و نسل کے لوگ ڈیپارچر گیٹس کی طرف رواں۔ میرا دل اداس اور بھاری ہے تو میں سمجھتی ہوں سب ہی اداس ہیں۔

دل تو میرا اداس ہے ناصؔر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

اس اداسی کا باعث محض وہ نظر، وہ کیفیت، اور وہ لمحہ ہوتا ہے جس سے آپ گزر رہے ہوتے ہیں، یہ کیفیت کسی بھی نظارے کی شکل بدل دیتی ہے۔ میری نظر میں اس وقت جدائی کے علاوہ کوئی جذبہ نہیں تھا۔ جدائی چاہے عارضی ہو یا دائمی دل میں ایک ہیجان بپا کر دیتی ہے۔ آنکھیں جو آئینہ ہیں آپ کی ہر کیفیت کا، وہ جدائی کے وقت اس چہرے کو بھی دھندلا دیتی ہیں جسے آپ ہر دم دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیسی بے وفا ہیں یہ آنکھیں کہ اس وقت آپ کا ساتھ نہیں دیتیں جب آپ کو ان کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ جدائی جو غم کو جنم دیتی ہے، غم جو خود ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ جدائی نہ ہوتی تو غم نہ ہوتا اور غم نہ ہوتا تو

کاغذ پر نہ کوئی تصویر ابھرتی اور نہ کوئی کہانی جنم لیتی۔ یہ غم ہی ہے جو سرچشمہ ہے بہت سے شہ پاروں کا۔ کیا جو لوگ لکھ نہیں سکتے کیا وہ غمگین نہیں ہوتے؟ یقیناً ہوتے ہیں۔ مگر وہ غم کو لکھ کر نہیں بلکہ اپنے غم کو کسی ساتھی سے بانٹتے ہیں ورنہ تو دل اتنا بھاری ہوجائے کہ شاید غم سے پھٹ جائے۔ اور وہ لوگ جن کے دوست نہیں ہوتے وہ اللہ سے لَو لگاتے ہیں۔

شاعر، مصوّر، اور لکھنے والے بڑے پرائیویٹ لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اپنا غم اپنے کسی دوست سے نہیں بانٹ سکتے مگر دیکھا جائے تو جب وہ بانٹتے ہیں تو ان کا غم ساری دنیا پر آشکار ہوجاتا ہے۔ انجانے میں وہ اپنے غم اور جدائی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

میں جنیوا کے ٹرانزٹ لاؤنج میں یہ چند سطور لکھتی ہوں۔ یہ الفاظ لکھنے کے بعد لگتا ہے دل کچھ ہلکا ہوگیا، لاؤنج کی کھڑکی سے باہر پہاڑوں کی آؤٹ لائن نظر آرہی ہے۔ کتنا فخر ہے جنیوا والوں کو اپنے موبلاں پر۔ باہر بادل ہیں اور ایک دھند ہے۔ میں آج سے اکتالیس سال پہلے کی دُھند سے پرے دیکھتی ہوں جب آج کے دن میری ان لوگوں سے جدائی ہوئی تھی جن کے ساتھ میں نے اکیس سال گزارے تھے اور آج میں اس شخص کے ساتھ تھی جس کے ساتھ پچھلے اکتالیس سال گزارے ہیں۔ اگر میں پچھلی زندگی پر نظر ڈالوں تو ایسا لگتا ہے جب بھی کسی سے جدائی کا وقت آیا تو ایسا لگا جیسے اس سے پیارا کوئی نہیں۔ ہر ایک کی رفاقت میں اچھے دن بھی گزرتے ہیں اور برے بھی، دھوپ بھی اور چھاؤں بھی۔ جب آپ کسی سے جدا ہونے لگتے ہیں تو صرف چھاؤں یاد رہ جاتی ہے۔ دھوپ کی شدت کہیں دور ویرانے میں دم توڑ دیتی ہے۔

اس لاؤنج میں کم ازکم سو لوگ بیٹھے ہیں مگر کسی کی آنکھیں بھیگی ہوئی نہیں ہیں۔ صرف میں ہی ہوں جس نے جدا ہونے کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مگر اس نہ دیکھنے کے باوجود میں ہی ہوں جو اپنے غم کو سب پر آشکار کررہی ہوں۔ یہاں تک کہ پاسپورٹ چیک کرنے والے شخص نے پاسپورٹ سے زیادہ میرے چہرے کو دیکھا اور مسکرا کر پاسپورٹ مجھے واپس کردیا۔ کہنے کو دنیا اتنی گلوبل ہوچکی ہے، فاصلے کم ہوچکے ہیں مگر میری نظر میں فاصلے بڑھ چکے ہیں اور لوگ ایک دوسرے سے دور ہوچکے ہیں۔ آج کی نانی

دادی اپنے بچوں کو بڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں۔ چند سالوں بعد جب یہ لوگ اپنے بچوں سے ملتے ہیں تو اس وقت تک اجنبیت کی ایک دیوار درمیان میں کھنچ چکی ہوتی ہے۔ وہ باتیں وہ ہنسی مذاق جنھیں آپ ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے اب ایک دوسرے کے لیے اجنبی لگتے ہیں۔ کبھی کبھی، کہیں کہیں آپ کو اپنی شباہتیں نظر ضرور آتی ہیں مگر بعض مرتبہ اجنبیت کی دیوار اسے الگ کردیتی ہے۔ ہاں وہ خاندان جو ایک مکمل شکل میں ہجرت کرتے ہیں ان کے درمیان یہ دوریاں نظر نہیں آتیں۔ دیکھا جائے تو سال میں دو مہینے ملنے سے بھی کبھی محبتیں پنپتی ہیں۔ ابھی محبت جڑ پکڑتی نہیں کہ جدائی اس پودے کو خزاں کی طرح جلا کر رکھ دیتی ہے۔ نسیم سیّد نے کیا خوب کہا ہے:

محبت کا کوئی پودا لگاؤ
دل کی مٹی میں
تو یہ سمجھو
کہ اس کے جڑ پکڑنے
پھلنے، شاداب ہونے تک
ذرا سا وقت لگتا ہے
یقیں کی کھاد
اس ننھے سے پودے کو
مسلسل سینچتی ہے
تب گھنی چھاؤں میں اس کی
راحتوں کے پھول کھلتے ہیں
بدن میں بور آتا ہے
بدن اقرار کرتا ہے
نہیں تو
لاکھ ایجاب وقبول

اس کو پڑھاؤ
پر بدن تو بس
تقیّے کا سا کاروبار کرتا ہے

جہاز میں ایک بہت خوب صورت اسٹیورٹ ہے۔ خوب صورت اور ہینڈسم، اتنا ہینڈسم اور پُرکشش جتنے میرے بیٹے۔ اس کا رنگ جو عامر کی طرح صاف ہے اور اس کی مسکراہٹ جس میں ناصر کی طرح ایک شرارت اور آشنائی ہے۔ عمارتیں اور شہر بھی انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ کچھ عمارتیں ایک اپنائیت کا احساس لیے ہوتی ہیں اور کچھ لاتعلقی کا۔ شیلون جہاں کہیں پھانسی کے پھندے ہیں اور کہیں قید خانے ہیں، کہیں خواب گاہیں ہیں، کہیں صدیوں سے ٹھنڈے آتش دان آج بھی ایک گرمی کا احساس لیے ہوئے ہیں۔ جہاں اب بھی آپ سانسوں کی آواز سن سکتے ہیں۔ کھڑکیوں سے باہر جھیل کو آپ یہاں پر رہنے والوں کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ جی چاہتا ہے آپ ان بڑے بڑے صندوقوں کو کھول کر دیکھیں جن کے ڈھکنے بھاری ہیں اور مقفل ہیں نہ جانے ان کے اندر کتنی 'یادوں کی برات' ہو یہ سب لوگ جو اس زمانے کے نہیں ہیں جب دنیا اتنی گلوبل تھی۔ مجھے ایسا لگتا ہے میں بھی کسی ایسے ہی زمانے کی پیداوار ہوں۔ یا پھر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب تبدیلیاں پچھلی چند دہائیوں میں ہوئی ہیں جب ہر شخص کی شناخت ختم ہو چکی ہے۔ سب آدم کی اولاد ہیں جو ایک ہجوم کی شکل میں وقت کی بھیڑ میں ہم سفر ہیں، وہ لوگ جن کی کوئی شکل نہیں، چہرے پر کوئی ناک نقش نہیں۔ سب کے چہرے سپاٹ ہیں، ایک ہی طرح ہنستے ہیں، ایک ہی طرح بولتے ہیں اور ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ کتنے غیر دلچسپ ہیں یہ لوگ۔ روبوٹس کی طرح predectible۔

اسٹیورٹ سب کو گرم تولیے بانٹتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو زمین کی تمام آلائشوں سے پاک کرلیں۔ میں اپنے ہاتھ پونچھتی ہوں۔ مجھے ایک ایسا تولیہ چاہیے جو مجھے میری پرانی یادوں سے پاک کردے۔ مگر یادیں ہیں کہ دُھندلاتی ہی نہیں ہیں اور اگر کبھی دُھندلانے بھی لگیں تو میں انھیں دُھندلانے نہیں دیتی۔ میں آلائشوں سے پاک ایک تولیہ

لیتی ہوں اور پھر اس آئینے کو چمکا لیتی ہوں۔ جیسے شیلون کے قلعے نے تمام یادوں کو سنبھال کر رکھا ہے خود اپنی شناخت اور ماضی میں اپنے نزدیک سے گزرنے والوں کی پہچان کو سنبھال کر رکھا ہے۔ پچھلی صدیوں کے تمام صحیفے، فن کاروں کی بنائی ہوئی تمام شبیہیں جو چھت کے ساتھ ساتھ ایک یادوں کے سلسلے کی طرح گڑی ہیں۔ وہ راہ داری جو اتنی تنگ ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک شخص اس سے گزر سکتا ہے۔ اور اگر اس کے دہانے پر ایک سل نصب کردی جائے تو آپ جیتے جاگتے انارکلی کی طرح اس میں دفن ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسی راہ داری ہے جہاں سے آپ واپس نہیں مڑ سکتے۔ جگہ اتنی تنگ ہے کہ آپ صرف سامنے کی طرف جا سکتے ہیں بالکل وقت کی طرح جس میں واپس جانا مشکل ہے۔ اس کے داخلی دہانے پر ایک سل نصب کردی گئی ہے اور آپ بے بسی کی حالت میں صرف آگے کی طرف رواں ہیں۔ آپ کو کچھ پتا نہیں کہ یہ راہ داری کہاں کھلے گی۔ کیا واقعی موت آپ کے لیے ایک تیز روشنی کی صورت میں ہوگی یا پھر آپ اندھیرے میں گم ہوتے چلے جائیں گے؟

پھر کینیڈا

باہر سخت بارش تھی گھر کے دروازے تک پہنچنے میں میں بھیگ چکی تھی۔ ٹورونٹو کے موسم کا کچھ بھروسا نہیں، ابھی تیز دھوپ تھی اور دس منٹ بعد پانی آسمان سے ایسے گرنے لگا جیسے نہ جانے کب سے برسنے کو تیار تھا۔ کمرے میں دو خواتین تھیں، دونوں میرے لیے اجنبی تھیں، دونوں پاکستانی تھیں، مگر اب تو پچھلے پینتیس چالیس سال سے دونوں ٹورونٹو میں تھیں۔ اردو بول سکتی تھیں، مگر انگریزی میں زیادہ آسانی سے اپنے خیالات کا اظہار کرسکتی تھیں۔ مسز اسحاق جو مشہور ادیب اشفاق احمد کی بھابی تھیں، گلابی لباس میں وہ اتنی تروتازہ تھیں کہ ان کی عمر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گلابی شفاف رنگت، چھوٹے کٹے ہوئے کالے بال، یہاں تک کہ وقت بھی ان پر اتنا مہربان رہا تھا کہ اس نے اپنی کوئی لکیر ان کے چہرے پر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر کہیں اس پر آواز بھی نازک ہوتی تو کوئی بھی نوجوان آج بھی ان پر اپنی جان نچھاور کرنے پر تیار ہوجاتا۔ دوسری خاتون سفید لباس میں ملبوس تھیں، دیکھتے ہی ان کی پُراعتماد شخصیت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ سفید بالوں کو کھینچ کر ایک کلپ میں قید کرلیا تھا۔ جسم ذرا بھاری تھا مگر بہت چست تھیں۔ ان کی شخصیت میں انیتا غلام علی کا پرتو تھا۔ ایک ایسی شخصیت کہ عورت ہونے کے باوجود وہ ان احساسات سے آرا ہوتی ہے کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔

یہ ایک لیڈیز پارٹی تھی۔ شعیب مجھے چھوڑنے آئے تھے مگر میزبان کے اصرار پر وہ بھی ہماری پارٹی میں شریک ہوگئے۔ شعیب نے جوجو سے کہا کہ ”کچھ عرصے بعد ایسی میڈیسنز تیار ہونے والی ہیں کہ آپ دوسو سال تک جی سکتے ہیں۔“

”کبھی نہیں۔ میرا خیال ہے اتنا جینا ہی کافی ہے۔ ایسا نہیں کہ مجھے زندگی سے کچھ شکایت ہے مگر میں ہر قدرتی چیز پر یقین رکھتی ہوں۔ یہ تمام وہ خواتین تھیں اورگینک چیزوں پر یقین رکھتی ہیں چاہے وہ کھانا پینا ہو، دوائیاں ہوں یا روزمرہ کی زندگی ہو۔ صاحبِ خانہ ثریا تھیں جو ایک ایسی خاتون ہیں کہ ان کے گھر میں رکھی ہوئی ہر چیز ان کے آرٹسٹک ہونے کا پتا دیتی ہے۔ دیوار پر لگی ایک رنگین تصویر جو ان کے کالج کے زمانے کی یادگار ہے۔ سامنے شیلف پر سلیقے سے لگی کتابیں، صوفے پر ترتیب سے رکھے کشنز، میز پر گل دان میں لگے پھول، کھانے کی میز پر رکھی پلیٹس، کٹلری غرض ہر چیز پکار پکار کر کہتی تھی کہ مجھے کسی فن کار نے سجایا ہے۔ سانولی سلونی، سفید بالوں اور دھیمی طبیعت والی ثریا کمرے میں مسکراتی ہوئی داخل ہوئیں۔ میں کام نپٹا کر شاور لینے چلی گئی تھی کہیں آپ کو زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔ آج کل ثریا کی بہن عذرا بھی لندن سے آئی ہوئی ہیں۔ تمام بہنیں اپنی اپنی جگہ بہت ہنرمند ہیں۔ مجھے ان کی بہن صفیہ سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن یقیناً ملنے کا اشتیاق بہت تھا۔ صفیہ ان کی وہ بہن ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی پڑھائی میں صرف کی۔ پی ایچ ڈی کیا اور پھر خود کو ریسرچ کے لیے وقف کردیا۔ یہ وہ عورت ہے جس نے کبھی کسی مرد کا سہارا نہیں لیا۔ سنا ہے کبھی کسی سے منگنی ہوئی تھی۔ پڑھائی کے لیے لندن گئیں اس عرصے میں اس شخص نے کسی اور سے شادی کرلی۔ سوچتی ہوں صفیہ نے دوبارہ شادی کرنے کا کیوں نہیں سوچا؟ شاید وہ دوبارہ دھوکا نہیں کھانا چاہتی تھیں یا پھر وہ ایک پریکٹیکل انسان تھیں۔

بارش مزید تیز ہوگئی۔ ایک خاتون ایک ہاتھ میں ایک چھتری لیے اور دوسرے ہاتھ میں ایک ڈش سنبھالے گھر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ معمولی شکل، کچھ بھاری جسم، سبز رنگ کی پینٹ اور شرٹ میں ملبوس دروازے تک پہنچیں۔ عذرا نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔

''صفیہ باجی ڈش مجھے دیجیے۔'' صفیہ ڈش دے کر دوبارہ گاڑی کی طرف لوٹ گئیں۔ انھوں نے گاڑی سے ایک اور ڈش نکالی اور اور اندر داخل ہوئیں۔ اس عرصے میں عذرا ان کی پہلی ڈش میز پر رکھ چکی تھیں۔ ڈش کیا تھی آرٹ کا ایک نمونہ تھی، اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ میں نے اس سے پہلے کبھی پھلوں کو کسی ڈش میں اتنی خوب صورتی سے سجا نہ دیکھا تھا۔ میں نے سوچا کیا صفیہ ثریا سے بھی زیادہ ٹیلنٹیڈ ہیں۔ انھوں نے لیچی، انگور، راسپ بیری اور بلیو بیری کو اپنے باغ کے پھولوں کے ساتھ ایسا سجایا تھا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ پھول ان پھلوں کی آرائش کا سبب تھے یا وہ پھل پھولوں کو زیادہ اجاگر کرتے تھے۔

موضوعِ زیرِ بحث امریکا تھا۔ کسی سوال کے جواب میں صفیہ نے کہا، ''میں کوئی ماہرِ معاشیات نہیں کہ اس بات کا جواب دے سکوں کہ اس سال امریکن ڈالر کینیڈین کی نسبت گرے گا تو اگلے سال کیا ہوگا؟ مگر مجھے اتنا معلوم ہے کہ امریکا شور مچانے کا کوئی نہ کوئی اور جواز ڈھونڈ لے گا۔ امیریکا از اے بلی۔ امریکا ایک غنڈے کی طرح ہے، وہ چاہتا ہے کہ تمام دنیا اس کے حکم کی غلام ہو۔ امریکا کبھی بھی عراق اور افغانستان سے نہیں نکلے گا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ریپبلیکنز آئیں یا ڈیموکریٹس، پالیسی ایک ہی رہے گی۔''

مذہب کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ عجیب بات ہے کہ مذاہب دنیا کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے اور دنیا کی تمام بڑی جنگیں مذہب کے نام پر لڑی گئیں، شاید سیاست دانوں نے مذہب کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ صفیہ کا گھر بھی ایک ایسا گھر ہے جو عام گھروں سے بالکل مختلف ہے۔ ایک ایسا گھر جس میں سکون ہے، ایسا لگتا ہے جیسے زندگی یہاں آکر ٹھہر گئی ہو۔ جیسے آپ خود کسی کہانی کے کردار بن گئے ہوں۔ ہر طرف پودے ہیں، دیواریں مختلف قسم کے آرٹ کے نمونوں سے اس طرح سجی ہیں کہ کسی آرٹ گیلری میں ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس گھر کا ایک اپنا کیریکٹر ہے جو اندر داخل ہوتے ہی آپ سے مخاطب ہوجاتا ہے۔ ایک دیوار پر صرف انسانی ماسک ہیں اور ہر ماسک کے ساتھ اس کی ایک کہانی ہے۔ کھڑکی کے سامنے ایک پرندوں کا پنجرہ ہے مگر اس میں کوئی پرندہ نہیں ہے۔ شاید یہ پنجرہ بھی کوئی سمبل ہے۔ صفیہ کی اپنی کہانی کی طرح۔ اگرچہ صفیہ

نے ایک کامیاب زندگی گزاری ہے مگر اس کے باوجود زندگی سے شکایت ان کی گفتگو سے بار بار عیاں ہوتی ہے۔ صفیہ نے اپنی زندگی کے پہلے گیارہ سال انڈیا میں گزارے اور ان کا کہنا ہے کہ ان کی روٹس انڈیا میں ہیں۔ اگرچہ وہ انیس سو سینتالیس میں پاکستان آگئیں، مگر وہ انڈیا سے زیادہ لگاؤ محسوس کرتی ہیں کہ ان کے بزرگوں کا تعلق انڈیا سے ہے اور ان کی کہانیاں وہاں بکھری پڑی ہیں۔ زمانے سے خفا ہیں خاص طور پر اپنے زمانے کے ان لوگوں سے جو سمجھتے تھے کہ لڑکی کا خوب صورت ہونا ضروری ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر لڑکی ملکہ وکٹوریہ تو نہیں ہوسکتی۔ ''میں کہ میرا رنگ دبتا ہوا تھا ہمیشہ تنقید کا شکار رہی۔ ہر ایک کا کہنا تھا کہ اس سے کون شادی کرے گا! میں نے اس وقت ہی سوچ لیا تھا کہ میں دنیا پر ثابت کروں گی کہ صرف شادی کرنا ہی زندگی کی کامیابی نہیں۔'' صفیہ اس وقت ریسرچ کا کام کرتی ہیں اور ملکوں ملکوں بلائی جاتی ہیں۔ صفیہ گیارہ سال پاکستان میں رہیں اور پھر بقیہ باون سال امریکا اور کینیڈا میں گزارے۔ میرا صفیہ سے سوال تھا، ''کیا امریکا اور کینیڈا ایک جیسے ہیں؟''

''قطعاً نہیں— امریکا وہ جگہ ہے جہاں لوگ چاہتے ہیں آپ اپنی identity کھو کر ان میں ضم ہوجائیں۔ ورنہ آپ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور اس پر ستم یہ بھی ہے کہ آپ کتنا بھی ان میں ضم ہونے کی کوشش کریں آپ ہر حال میں خود کو ان سے کم تر محسوس کرتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ آپ جیسے ہیں اس لحاظ سے آپ کی شناخت ہو تو یہ بھی ممکن نہیں۔ وہاں پر اپنی پہچان قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ جب کہ کینیڈا ایک موزیک کی طرح ہے کہ آپ کینیڈین ہونے کے باوجود اس موزیک میں اس طرح اپنی جگہ بناتے ہیں کہ آپ اپنے تمام رنگوں کے ساتھ آب و تاب سے چمکتے ہیں۔ آپ کو حق ہے کہ آپ اپنے طریقے سے زندگی گزاریں۔ سب آپ کی پہچان کا احترام کرتے ہیں۔

کیا آپ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ اپنی پہچان قائم رہنی چاہیے؟ کیا آپ چاہتی ہیں کہ لوگ آپ کو پاکستانی یا ہندوستانی سمجھیں؟ قطعاً نہیں، میں چاہتی ہوں کہ مجھے صرف ایک انسان سمجھا جائے۔ مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ یہ تو ایک آئیڈیل سچویشن ہے جو

صرف سوچی جا سکتی ہے۔ مگر ہونا ایسا ہی چاہیے۔

◇

ٹورونٹو کی ایک خوش گوار صبح تھی۔ ہلکی دھوپ اور ہوا کے سرد جھونکے، اتنے مناسب سرد کے اگلے جھونکے کا انتظار رہے۔ سڑک کے دونوں طرف صاف ستھرے گھر، رنگ برنگے پھول، ایک گھر کے لان میں پیار سے کیاریوں کو سنوارتے بوڑھے ہاتھ۔ ان ہاتھوں نے ہمیں ہاتھ ہلا کر ہیلو کیا۔ صبح کے نو بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے، میں لائبریری کی طرف جا رہی تھی۔ جانے یہ ملک کب اور کیسے اتنا منظم ہوگیا، کون تھا جو اتنا sincere تھا کہ اس نے یہاں کی بہتری کے لیے کام کیا۔ شاید کبھی ہمارے یہاں بھی کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے۔

وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ اس نے ہلکے زرد رنگ کی پینٹ پہنی تھی، سفید ٹی شرٹ پر سلور اور زرد رنگ سے کچھ لکھا تھا، پاؤں میں جوگرز تھے، اس کے بال جو اس کے شانوں تک آتے تھے دھوپ میں اس طرح چمکتے تھے کہ ان کی سیاہی اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی۔ جانے کیوں وہ مجھے پسند آ گئی تھی اور لگتا تھا کہ میں بھی اس کو پسند ہوں۔ اس کی شفاف رنگت میں ملی ہلکی سی زردی اس کی جلد کو سنہرا کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی محبت چھلکی جاتی تھی۔ اس نے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھوں کی گرمی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ ایک محبت کرنے والی انسان ہے۔ اس کی آواز میں ایک نرمی تھی جو دل کو بھاتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں بائیں طرف کی گلی میں رہتی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا، تم کہاں رہتی ہو؟ اس کی انگریزی بہت صاف تھی۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ چائینیز ہے۔ تمھیں پتا ہے کہ چائنا کہاں ہے؟ میں نے کہا، ''ہاں— کیوں کہ میرا ملک بھی تمھارے نزدیک ہے۔''

اسے اس بات پر فخر تھا کہ وہ چائینیز تھی۔ وہ اس قوم سے تھی جس قوم کے ہاتھوں میں ستارے ہیں، جس قوم کی ایک نسل نے اپنے آپ کو اپنے ملک پر نثار کر دیا تب کہیں جا کر وہ ملک آج دنیا کے نقشے پر چمکتا ہے بلکہ مغرب کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ اس کے

ساتھ سٹیلا تھی جس کا تعلق کولمبیا سے تھا۔ ناک نقشے کے اعتبار سے وہ ہیلن سے کہیں بہتر تھی مگر ہیلن کی ہر حرکت ہر جنبش میں جو بجلی سی چمکتی تھی وہ چیز سٹیلا میں نہیں تھی۔ ہیلن نے ایک بار پھر میرے ہاتھ کو کھینچتے ہوئے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''کیا تمھیں چائینیز آتی ہے؟ تمھیں پتا ہے .I love china'' میں نے جھک کر اس کو پیار کیا۔ کیا پانچ سال کی بچی اپنے ملک سے اتنی محبت کر سکتی ہے؟ اور وہ بھی اس ملک سے جہاں سے اس کا بس اتنا تعلق ہے کہ اس کے آباو اجداد کا تعلق وہاں سے تھا۔ اس نے مجھ سے کہا، ''تمھیں پتا ہے چائینیز میں ہیلو کیسے کہتے ہیں؟ نی ہاؤ— اب تم کہو نی ہاؤ ہیلن۔'' میں نے اس کے الفاظ کو دُہرایا ''نی ہاؤ ہیلن۔'' وہ خوب ہنسی۔ ہیلن صرف پانچ سال کی ہے۔ وہ میری زارا کی کلاس فیلو ہے۔ آج زارا کی کلاس لائبریری جا رہی ہے جو ان کے پائن وے اسکول سے آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ان کی کلاس ٹیچر کو کسی وولینٹری مدد کی ضرورت تھی۔ چودہ بچے تھے ایک ٹیچر اور اس کی ایک ہیلپر تھی اور باہر سے میں ان کی مدد کے لیے تھی۔ میرے پہنچنے پر مس لو نے میرا تعارف کرایا۔ اس نے مجھ سے پوچھا ''تمھیں زارا کیا کہتی ہے؟'' پھر بچوں سے کہا، ''یہ زارا کی دادی ہیں۔'' سب بچوں نے باآواز بلند کہا، ''ہیلو دادی— گڈ مارننگ دادی۔ ویلکم دادی۔'' ہم اسکول سے نکلے تو ہر دو بچوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سب سے آگے مس لو تھیں، ان کے بعد کچھ بچوں کے بعد میں تھی پھر چند اور بچے تھے اور پھر دوسری ٹیچر تھی۔ ہر جگہ سڑک کراس کرنے سے پہلے سب بچے ٹھہر جاتے۔ مس لو کہتیں، دائیں طرف دیکھو پھر بائیں طرف دیکھو اور اب سڑک کراس کرو۔ بڑی سڑک پر سب نے اس سفید لائٹ کا انتظار کیا جس پر آپ سڑک کراس کرتے ہیں اگرچہ تمام گاڑیاں بچوں کو دیکھ کر خود ہی رک جاتی تھیں۔ اگرچہ ان کے یہاں جہاں بھی بچوں کا ذکر آتا ہے وہاں نمایاں الفاظ میں لکھا ہوتا ہے The most important people۔ مجھے واقعی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بہت اہم لوگوں کے ساتھ آج سڑک پر ہوں۔ لیکن ساتھ ہی مجھے اس بچے کا بار بار خیال آتا تھا جو سب میرین چوک پر چلچلاتی دھوپ میں میری گاڑی کے شیشے سے اپنا چہرہ لگائے میری مہربانی کا منتظر

تھا اور میں ٹریفک لائٹ کے گرین ہونے پر اس کو نظرانداز کر کے گاڑی آگے بڑھا لے جاتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں نہ کوئی غبارہ تھا، نہ کوئی آئس لولی۔ وہ تو اس زمین پر بوجھ تھا جہاں مجھ جیسے بے حس لوگ بستے تھے۔ وہ اسی سڑک پر کچھ عرصے بعد کسی مجھ جیسے کا سیل فون چھین رہا ہوگا اور میں اخبار میں اس واقعے کے بارے میں اس طرح ذکر کر رہی ہوں گی جیسے اس کو مجرم بنانے میں میرا کوئی حصہ نہیں۔

میں جب اپنے سیلون سے سن سیٹ بلیوارڈ پر باہر دیکھتی ہوں تو ہر طرح کے نظارے میرے سامنے ہوتے ہیں۔ وی آئی پیز کی جھنڈا لگی کالے شیشوں والی گاڑیاں بھی، تیزی سے نکلتی ہوئی بسیں بھی اور وہ کانپتے بوڑھے ہاتھ بھی جو چلتی بس میں تیزی سے سوار ہونے کی قوت نہیں رکھتے۔ وہ غریب پولیس والا بھی جو تپتی دھوپ میں گھنٹوں سڑک پر کھڑا رہتا ہے اور وہ رئیس بچہ بھی جو آدھا کھایا ہوا میکڈونلڈ سڑک پر پھینک دیتا ہے اور اسی وقت سڑک کے کنارے کھڑا بچہ اس بن کباب پر سے مٹی جھاڑ کر کھانے لگتا ہے۔

ہم لائبریری پہنچ چکے تھے۔ وہاں پر اسٹوری ٹیلر نے ہمارا استقبال کیا، ہم سب کو ایک ہال میں لے گئی۔ تمام بچے ایک دری پر بیٹھ گئے۔ ''ہم آپ کو آج بتائیں گے کہ لائبریری کیا ہوتی ہے بلکہ آپ بتائیے کہ لائبریری کیا جگہ ہے؟'' اینڈریو نے کہا، ''لائبریری میں کتابیں ہوتی ہیں۔'' ژیاہو نے کہا، ''لائبریری میں کمپیوٹر ہوتے ہیں۔'' زارا بولیں، ''لائبریری سے کتابیں لے کر گھر جا کر پڑھ سکتے ہیں۔'' اسٹوری ٹیلر نے کہا، ''اور سب سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ آپ اس لائبریری کے ممبر بنیں — اور — اور لائبریری میں آپ بات نہیں کرتے اور اگر کریں بھی تو سرگوشی میں کرتے ہیں۔ اگر آپ شیلف سے کوئی کتاب اٹھائیں تو اسے واپس شیلف میں نہیں بلکہ میز پر رکھتے ہیں کیوں کہ شیلف پر کتابیں ایک خاص آرڈر میں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اسٹوری ٹیلر نے بچوں کو تین کہانیاں سنائیں اور پھر بچوں کو لائبریری میں لے گئی۔ لائبریری کے دروازے میں جب بچے داخل ہوئے تو سب نے قطار بنائی اور باری باری اندر داخل ہوئے۔ اور آدھ گھنٹے بعد ہم سب پھر سڑک پر تھے۔ کہیں رک کر بچیاں گھاس سے پھول توڑنے لگتیں۔ کہیں پر بعض لڑکے

کسی درخت پر لٹکنے کی کوشش کرتے۔ مگر کارواں اسکول کی طرف بڑھتا گیا۔ ایک بار پھر بڑی سڑک کراس کی گئی، ایک بار پھر مجھے ہیلن نے بتایا کہ اس کی ایک بڑی بہن ہے اور یہ کہ وہ مجھے اپنی امی سے ملانا چاہتی ہے۔ مس لو نے بتایا کہ ابھی آٹھ مہینے پہلے جب یہ بچی آئی تو بالکل انگریزی نہیں بول سکتی تھی مگر اب بالکل آرام سے بولتی ہے۔ کلاس روم میں پہنچ کر سب نے ہاتھ دھوئے اور پھر سب کو کوکیز اور چوکلیٹ ملک دیا گیا۔ سب بچوں نے مل کر میرا شکریہ کیا اور مجھے پھر آنے کی دعوت دی۔

◇

ٹورونٹو کی زمین ہم آج چھوڑنے والے ہیں۔ ڈھائی مہینے کے بعد اپنے ملک جانا کتنا خوشی کا باعث ہوسکتا ہے اس کا اندازہ مجھے تھا مگر پھر بھی اپنوں سے جدائی بھی ایک ایسا مرحلہ تھا جس سے میں جلدی فارغ ہو جانا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں کی نمی میرے اپنوں تک پہنچے۔ علی کی آنکھیں مجھے کبھی کبھی بھیگتی نظر آرہی تھیں اسی لیے میں نے اس کا دھیان اس بات میں لگا لیا کہ جب میں واپس آؤں گی تو اس کے لیے کون کون سے کھلونے لاؤں گی۔ اسی لیے میں نے آخری بار زارا اور علی سے ملنے کے بعد پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پتھر کی ہو جاؤں اور میرے قدم آگے نہ بڑھ سکیں۔

جب آپ پی آئی اے کے کاؤنٹر پر پہنچتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ آدھے پاکستان تو پہنچ چکے ہیں۔ ڈیپارچر لاؤنج میں ہم جہاز میں بیٹھنے کے منتظر تھے۔ شعیب کے دائیں طرف شعیب ہی کی عمر کے ایک صاحب بیٹھے تھے۔ یہ صاحب عارفین کمپنی میں ڈائریکٹر تھے۔ ان کی بیگم کے پاس کینیڈا کی قومیت تھی اور یہ ابھی اپنی قومیت کے منتظر تھے۔ سب سے مشکل بات یہ تھی کہ قومیت کے لیے کینیڈا میں تین سال رہنا ضروری تھا اور یہ اپنی نوکری کی وجہ سے رہ نہیں سکتے تھے۔ انیس سو باسٹھ میں یہ پاکستان آئے تھے۔ پانچ سال انھوں نے مشرقی پاکستان میں گزارے اور اس کے بعد وہاں کے حالات دیکھتے

ہوئے مغربی پاکستان آگئے اور اپنے تمام رشتے داروں کو بھی مشورہ دیا کہ اسی طرف آجائیں۔ ان کا تعلق بہار سے تھا۔ اگر ان میں اتنی دور تک دیکھنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو شاید ان کا شمار بھی آج ان بہاریوں میں ہوتا جو کیمپس میں پڑے ہیں اور ان کو کوئی اپنانے کو تیار نہیں۔

میرے بائیں طرف ایک بہت ہی خوش پوشاک اور اسمارٹ خاتون بیٹھی تھیں۔ کالے رنگ کا پرنٹڈ قمیص شلوار پہنے تھیں۔ بہت کھڑے نقش اور صاف رنگت والی۔ اب بھی بہت خوب صورت تھیں۔ ہاتھ میں ہرے پاسپورٹ کے ساتھ ساتھ لال پاسپورٹ بھی تھا۔ کہنے لگیں یہ پاسپورٹ تو صرف شو پیس ہے۔ اپنے ہرے پاسپورٹ سے اچھا کچھ نہیں۔ میری تین بیٹیاں یہاں ہیں اس لیے ہر سال یہاں آتی ہوں مگر یہاں کی زندگی بہت مصروف ہے، کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ اگرچہ میری بیٹیاں مجھے کافی وقت دینے کی کوشش کرتی ہیں مگر—— کچھ دنوں انھیں اتنا مصروف دیکھ کر یہ احساس بھی ہونے لگتا ہے کہ ہم ان مصروف لوگوں پر کیوں اپنا بوجھ ڈال رہے ہیں۔ ان کا کام مزید کیوں بڑھا رہے ہیں۔ میں بہت جوش و خروش سے آتی ہوں مگر پندرہ دن بعد ہی واپس جانے کا سوچتی ہوں۔ ہمارے بچے وہ ہیں جو پاکستان میں ہیں۔ میری بیٹیاں تیس سال سے یہاں رہ رہی ہیں، ان کے تو سوچنے کا انداز بھی بدل چکا ہے۔ مگر خیر ازکم وہ خوش ہیں اور اسی لیے ہم نے انھیں یہاں بھیجا بھی تھا۔ میرے تین بچے پاکستان میں بھی ہیں۔ وہ لوگ ایک مشینی زندگی نہیں گزارتے۔ وہ ابھی بھی لوگوں کے لیے وقت نکالتے ہیں ریلیکس کرنا جانتے ہیں۔ یہ وہ خاتون تھیں جو صرف انگریزی میں بات کرتی تھیں۔ ان کے مہارت سے ترشے ہوئے بال، ان کا بیٹھنے کا انداز انھیں عام مسافروں سے منفرد کرتا تھا۔ انھوں نے اپنی زیادہ زندگی رفاہی کاموں میں صرف کی ہے اور غریب بچوں کے اسکولوں میں پڑھایا ہے۔ وہ کلفٹن میں رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کبھی پی آئی اے میں کیپٹن تھے۔ ان کا دل پاکستان میں لگتا ہے۔ وہ اپنی ہی زمین پر اپنا زیادہ وقت گزارنا چاہتی ہیں۔ اگر میں غور کرتی ہوں تو ان کا تعلق پاکستان کی اس کلاس سے ہے جن کے گھر میں رہنے کا انداز

اور کلچر یقیناً پاکستانی نہیں ہوگا مگر پھر بھی زمیں ان کو اپنی ہی پیاری تھی۔

جہاز اب فضاؤں میں پرواز کر چکا تھا۔ ایئر ہوسٹیس میزبانی میں مصروف تھیں۔ مسافروں میں ایک جانا پہچانا چہرہ ابھرا۔ یہ بیکن ہاؤس کی پرنسپل تھیں۔ وہ بڑی محبت سے میرے پاس آئیں، ساتھ ہی ایک سیٹ خالی تھی، وہ اس بیٹھ گئیں۔ مجھ سے پوچھا، ''کوئی نئی چیز لکھ رہی ہیں؟ آپ نے اطاق کی محفل میں جو اپنی نظم پڑھی تھی وہ ہم سب کو بہت پسند آئی تھی۔ کیا پتا تھا آپ سے جہاز میں ملاقات ہو جائے گی۔ یہ بتایئے کہ بچوں میں اپنے ملک سے محبت کا جذبہ کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟ میں سوچتی ہوں آپ ایک مرتبہ ہمارے پاس آئیں میں اور میرا اسٹاف آپ کے ساتھ بیٹھے گا اور ہم کوئی ایسا پروگرام تشکیل دیں گے جس پر کام کر کے ہم بچوں میں پاکستان کی، اپنی زمین کی محبت پیدا کر سکیں۔'' میں نے کہا، اپنا ملک آپ کے خیال میں ہے کیا؟ اپنی زبان، اپنے رہنے سہنے کا طریقہ، اپنے وہ لوگ جو ہمارے لیے فخر کا باعث ہیں۔ اگر آپ نے اپنے اسکول کے بچوں سے یہ کہا کہ اردو ایک اچھی زبان ہے اور آپ کو اردو بولنی چاہیے تو ہوسکتا ہے ان بچوں کے ماں باپ اپنے بچوں کو اسکول سے ہی اٹھا لیں۔ اگر ہم قومی ترانہ ہی اپنی زبان میں گا لیں تو یہ ہی کافی ہے۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ کس طرح ایک دن ایک بچی کے والد ان کے پاس آئے اور غصّے سے پوچھا کہ آپ میری بچی کو اسکول میں اردو پڑھا رہی ہیں؟ انھوں نے کہا یہ تو کافی عرصے سے نصاب کا حصّہ ہے۔ اس بات پر انھوں نے اپنی ناپسندیدگی کا مزید اظہار کیا۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ کینیڈا میں کسی پاکستان میں رہنے والی آٹھ دس سال کی بچی سے بات کر رہی تھیں۔ وہ بچی کہنے لگی کہ دیکھیے کینیڈا کا قومی ترانہ کتنا اچھا ہے اور یہ کہہ کر اس نے او کینیڈا... پورا سنایا۔ مگر جب پاکستانی ترانہ سنانے کے لیے کہا تو وہ بولی .It is too difficult۔

غرض سخت مشکل میں ہیں طلبہ اور اساتذہ۔ پیٹ پالنے کی سب سے بڑی ضرورت ہے نوکری اور نوکری کے لیے ضروری ہے کہ آپ انگریزی بولیں مگر پھر بھی ضروری نہیں

ہے کہ آپ اپنی زبان کو اپنے کلچر کو قطعی طور پر رد کردیں۔ مگر شاید میں جس طبقے سے بات کررہی تھی وہ اونچا طبقہ ہے۔ ان کے لیے باعثِ فخر بات یہی ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے کلچر سے دوری کا اظہار کریں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو اپنا تمام اثاثہ بیچ کر جیسے ہی موقع ملتا ہے دوسرے ملک کی راہ لیتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جب کوئی تالاب سوکھ جاتا ہے تو پرندے کسی دوسری جگہ کا رخ کرلیتے ہیں مگر بے چاری وہ مچھلیاں کیا کریں جن کے پر نہیں ہیں۔ اور ہمارے ملک کی اکثریت وہی ہے جن کے پر نہیں ہیں۔ یہ ہیں پیلے اسکولوں میں پڑھنے والے وہ بچے اور وہ لوگ جو بے چارے شاد باد کرتے رہ جاتے ہیں۔ یہی حال افغانستان اور اس جیسے دوسرے ممالک کا ہے جہاں کے امیر طبقے نے وقت کے دھارے کو دیکھ کر امریکا اور کینیڈا کا رخ کیا اور بے چارے غریب تالاب کے سوکھنے تک وہیں رہے۔ اور جب تالاب بالکل سوکھ گیا تو وہ صرف یہ کرسکے کہ انھوں نے نزدیک ترین سرحد کو عبور کرلیا اور مہاجرین کیمپس آباد کیے۔

کچھ ایسی ہی صورتِ حال پچھلی چند دہائیوں سے ہمارے ملک میں بھی ہے۔ بے پر کی ہزاروں مچھلیاں اپنے اثاثے بیچ کر پردیس کا رخ کرتی ہیں۔ اپنی پوری زندگی اپنے پیاروں سے دور بسر کرتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جو مڈل ایسٹ کا رخ کرتے ہیں، ان کا حال اور بھی برا ہے۔ ان کی جو شناخت عرب ممالک میں ہے یہ ہم بھی جانتے ہیں اور آپ بھی۔ ان ممالک میں تو پوری زندگی بسر کرنے کے بعد بھی انھیں ان جگہوں کی قومیت نہیں ملتی۔ جس تنہائی میں وہ زندگی گزارتے ہیں، اپنی ایک ہی زندگی کو جس طرح اپنے ملک سے دور بسر کرتے ہیں، جب بوڑھے ہوکر واپس پلٹتے ہیں تو ان کے اپنے ان کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو پردیسی جیلوں میں سڑتے ہیں اور اگر زندہ بچ جائیں تو یہاں کے زنداں کے ایندھن بنتے ہیں۔ ایسی لوگوں کی اس کے سوا کوئی شناخت یا پہچان نہیں کہ وہ ایک غریب قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ کشور ناہید اپنی ایک نظم میں کہتی ہیں:

مرغیوں کے چوزے
جس طرح غلاظت کے ڈھیر پر چونچیں مارتے ہیں
بالکل اسی طرح ہمیں، ہماری غربت کے ڈھیر پر
لڑنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے
زمین پر چلتے کیڑوں کی طرح
ہمیں بنا پوچھے مار دیا جاتا ہے
پکڑ لیا جاتا ہے
احتجاج کرو تو جیل خانوں میں
بند کردیا جاتا ہے—
وہ یہ کیوں نہیں کرتے کہ
ہمیں ایک ہی دفعہ غلام بنالیں
اس کی قیمت کے عوض
ہمارے دیہاتوں سے غربت ختم کردیں

◇

دو سال پہلے مجھے امریکا کے بارڈر پر ایک تلخ تجربہ ہوا، جس کا ذکر شاید اس موضوع کے تحت ضروری ہے۔ میرے بیٹے نے میرے اس مضمون کو بوسٹن میں اپنے یہاں کے سینیٹر کو بھی بھیجا تھا۔ میں اس کو بالکل اسی طرح درج کررہی ہوں جس موڈ میں میں نے اسے لکھا تھا۔

یہ ستائیس اپریل دو ہزار پانچ کی ایک خوب صورت صبح تھی۔ بہار کو آپ نہ صرف دیکھ سکتے تھے بلکہ محسوس بھی کرسکتے تھے۔ صبح صبح ہوا کچھ سرد تھی۔ فضا میں بہار کی خوش بو تھی جو پور پور میں اترتی جاتی تھی۔ مجھ پر بہار کا نشہ کچھ ایسا چھایا کہ میں سوچنے لگی کہ جانے میں مستقل یہاں کیوں نہیں رہتی، زندگی یہاں کتنی پُرسکون اور آرام دہ ہے۔ نہ بجلی کا مسئلہ

نہ پانی کی فکر۔ یہ تو زمین پر جنت ہے۔ صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ ناصر اپنے کام پر جاتے ہوئے راستے میں ہمیں بس اسٹیشن تک چھوڑنے آیا تھا۔ ہم (میں اور شعیب) ڈیٹرائٹ جانے کے لیے ٹورونٹو سے بس میں بیٹھنے والے تھے۔ یہ بس ہمیں کینیڈا اور امریکا کے بارڈر پر چھوڑنے والی تھی۔ ہم ونڈسر پر کئی مرتبہ بارڈر کراس کر چکے تھے۔ شعیب کے اور میرے پاس کینیڈین پاسپورٹ ہے اس لیے ہمیں امریکا کے ویزے کی ضرورت نہیں۔ سڑک پر درخت ایک قطار میں لگے ہیں اور نئے پتے باہر نکلنے کے منتظر ہیں، باہر نکلی ہوئی چھوٹی چھوٹی کونپلیں نئی دنیا میں قدم رکھنے کو بے چین ہیں۔ بس اسٹیشن اور اس کے اردگرد ہر چیز بہت صاف ستھری ہے۔ اس وقت بہت خاموشی ہے اس لیے میں ٹورونٹو کا پورا مزہ لے سکتی ہوں۔ ہم دو ٹکٹ خریدتے ہیں اور ٹریک نمبر سات کی طرف چلتے ہیں کہ بس ہمارا انتظار کررہی ہے۔ ابھی بورڈنگ شروع نہیں ہوئی ہے اور لوگ قطار بنائے کھڑے ہیں۔ ہمارے لیے سردی ہے مگر یہاں کے رہنے والوں کے لیے موسمِ سرما کا آغاز ہے۔ آخرکار بس کا دروازہ کھلتا ہے مگر کوئی مسافر اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ سب ڈرائیور کے اشارے کے منتظر ہیں۔ میں ان لوگوں کے صبر کی داد دیتی ہوں۔ کینیڈا میں ہر شخص کی ایک اتھارٹی ہے اور لوگ اس کی حیثیت کا احترام کرتے ہیں۔ ایک عورت شکایت کررہی ہے کہ بس میں اور بس اسٹیشن کے اندر بھی سگریٹ پینا منع ہے۔ لگتا ہے اب تھوڑے دنوں بعد گھر میں بھی سگریٹ پینے پر پابندی لگ جائے گی۔ میں تو اتنے قوانین اور پابندیوں سے تنگ آچکی ہوں۔ اگر اتنی بندشیں لگانی ہیں تو حکومت کو چاہیے کہ میرا کرایہ اور ٹیکس بھی دیا کرے۔

ڈرائیور ہمارا سامان رکھتا ہے اور ہمیں بس میں بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ میں یہاں کی سب چیزوں سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوں۔ میں کہتی ہوں، ان کی بس کتنی آرام دہ ہے اور اس بس میں کوئی آواز بھی نہیں ہے۔ بس آہستہ آہستہ صبح کے ٹریفک سے گزرتے ہوئے ہائی وے پر نکل جاتی ہے۔ راستے میں یہ کئی جگہ پر رُکتی ہیں مگر صرف چند منٹ کے لیے۔ مسافروں کو اتارنے کے لیے یا چند اور مسافروں کو ساتھ لینے کے لیے۔ ڈرائیور بہت ہی بے تکلفی سے اعلانات کرتا جاتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اگلا اسٹاپ لندن ہے، یہاں پر بس

صرف پانچ منٹ کے لیے رکے گی۔ اگر آپ پانچ منٹ میں واپس بس میں نہیں بیٹھے تو یہ بس آپ کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اگلی بس آپ کو تین بج کر دس منٹ پر ملے گی۔ اگرچہ اناؤنسمنٹ میں ایک دھمکی تھی، اس کے باوجود اس میں ایک مزاح کا عنصر تھا اس لیے سب کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے یہاں کے لوگوں پر رشک آتا ہے کہ وہ یہاں اتنے بے فکر انداز میں زندگی گزارتے ہیں اور ساتھ ہی زندگی کی ہر آسائش بھی انھیں میسر ہے۔ بس ایک بج کر تیس منٹ پر ونڈسر پر رکتی ہے۔ ہم عذرا کو فون کرتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ اس وقت وہ کلینک میں ہے اور پانچ بجے تک فارغ ہوگی۔ شعیب کا مشورہ ہے کہ سامان کو اسٹیشن پر چھوڑا جائے اور کھانا کھایا جائے اور پھر ونڈسر کی سیر کی جائے۔ باہر گھومنے کے لیے کافی سردی اور ہوا ہے، میں کہتی ہوں کہ کیوں نہ ہم ایک ٹیکسی لے کر چلے جائیں، آدھے گھنٹے کا راستہ ہے اور مجھے معلوم ہے کہ عذرا اپنے گھر کی چابیاں کہاں رکھتی ہے۔ ہم گھر جا کر کھانا کھائیں گے اور پھر گرما گرم چائے پییں گے۔ باہر دو ٹیکسیاں کھڑی ہیں۔ پہلا ڈرائیور کہتا ہے کہ اس کے لیے راستہ ڈھونڈنا مشکل ہے۔ دوسرا ڈرائیور لبنانی ہے، وہ ہمیں گاڑی میں بٹھا لیتا ہے۔ ہم اپنا سامان ٹیکسی میں رکھتے ہیں اور برج ٹو یو ایس اے کا رُخ کرتے ہیں۔ ہم امیگریشن کے چیک پوائنٹ پر رکتے ہیں۔ میں اپنے پاسپورٹ افسر کو دیتی ہوں۔ وہ ڈرائیور سے کچھ سوالات کرتا ہے، ونڈ اسکرین پر ایک اورنج اسٹیکر لگاتا ہے، ہمارے پاسپورٹس ڈرائیور کو دیتا ہے اور ڈیوٹی افسر کے پاس جانے کو کہتا ہے۔ گاڑی پارک کر کے ہم اندر جاتے ہیں۔ اندر چار پاکستانی اور دو عرب اور ان کے بیوی بچے ہیں۔ ایک لمبی چوڑی کالی امریکن ہمارے ڈرائیور سے کچھ پوچھ گچھ کرتی ہے۔ میں شعیب سے کہتی ہوں، مجھے کچھ ڈر لگ رہا ہے۔

امیگریشن انسپکٹر کی کرخت آواز اچانک کمرے کی خاموشی میں گونج اٹھتی ہے۔

''مسٹر اینڈ مسز خان ادھر آئیے — تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

''ڈیربورن۔''

''کیا تمھارے پاس ریٹرن ٹکٹ ہے؟''

"نہیں۔" میں اس کو اپنا ٹکٹ دکھاتی ہوں اور کہتی ہوں کہ ریٹرن ٹکٹ نہیں ہے مگر ظاہر ہے واپسی میں خرید لیں گے۔ وہ چند لمحے مجھے غور سے دیکھتی ہے اور پھر کہتی ہے، "میرا خیال ہے تم واپس نہیں جارہیں۔" میں اسے حیرانی سے دیکھتی ہیں۔ بغیر کچھ کہے میری نظروں میں سوال ہے، کیوں؟

"کیوں کہ یہ تمھارا پیشہ ہے!" میں اس کی طرف دیکھتی ہوں اور اپنی بے عزتی پر میرا چہرہ لال ہوجاتا ہے، پورے جسم میں گرمی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ اس کا اگلا سوال ہے، "تم کس کے پاس جارہی ہو؟"

"میری بھانجی ہے۔"

"تمھاری بھانجی تمھیں لینے کیوں نہیں آئی؟"

"میری بھانجی ڈاکٹر ہے اور اس وقت اس کی کلینک ہے۔ وہ مجھے غصے سے دیکھتی ہے اور جھڑک کر کہتی ہے، "کیا میں نے تم سے پوچھا ہے کہ وہ کیا کرتی ہے یا یہ کہ وہ ڈاکٹر ہے؟ تم نے مجھے کیوں بتایا کہ وہ ڈاکٹر ہے؟ جواب دو تم نے کیوں کہا؟ تم صرف اس بات کا جواب دو جو تم سے پوچھی جائے۔ زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں خاموش رہتی ہوں۔ وہ ایک اور سوال کرتی ہے۔

"تمھارے پاس کتنی رقم ہے؟" میں اسے بتاتی ہوں، "میرے پاس نو سو یو ایس ڈالرز، ایک ویزا کارڈ، ایک ڈیبٹ کارڈ، اور نو سو یوروز کے ٹریولرز چیکس ہیں۔"

وہ غصّے میں چلاتی ہے، "یہ یورو کیا بلا ہے۔" میں اور زیادہ گھبراجاتی ہوں۔ مگر جواب دیتی ہوں کہ یہ یوروپین کرنسی ہے۔ وہ مڑتی ہے مسٹر خان تم یہیں ٹھہرو۔ پھر مجھے اشارہ کرتی ہے تم میرے ساتھ آؤ۔ میں اس کے پیچھے جاتی ہوں۔

ایک بے حد سرد کمرہ، جس میں ایک طرف ایک اور افسر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی ہے۔ کمرے میں چند لکڑی کی بے رنگ کرسیاں، کھڑکیاں کسی قسم کی بلائنڈز یا پردوں سے مبرّا۔ ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے مجھے بیٹھنے کو کہا گیا۔ میں کرسی پر بیٹھتی ہوں اور عادتاً اپنے بیگ کو اپنے نزدیک کرنا چاہتی ہوں۔ وہ میرا ہاتھ روک لیتی ہے۔ "مسز خان، اب تم

اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔ تم اب ہماری کسٹڈی میں ہو۔"

مجھے لگا جیسے میں کسی بہت بڑے جرم کی مرتکب ہوچکی ہوں اور پولیس کی حراست میں ہوں۔ جرم ثابت ہوچکا ہے اور سزا سنائی جانے والی ہے۔ وہ میرا بیگ خالی کرتی ہے۔ ویڈیو کیمرہ ایک طرف رکھتی ہے اور دوسری چیزیں میز پر پھیلا دیتی ہے۔ میرا والٹ کھولتی ہے، اس میں سے میرے شوہر اور بیٹوں کی تصاویر نکالتی ہے۔ زپ کھولتی ہے اور تمام چیزیں میز پر بکھر جاتی ہیں۔ مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ اگر انجانے لوگ آپ کا بیگ کھولیں تو آپ کو کتنی بے عزتی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ میرے تمام کارڈز ایک لائن میں میز پر لگادیتی ہے۔ ویزا اسکوشیا بینک، ڈیبٹ کارڈ، کینیڈین ڈرائیونگ لائسنس، کینیڈین سوشل انشورنس کارڈ، سنی بینک ہاسپٹل کا کارڈ، شناختی کارڈ وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی آج مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ میرے بیگ میں کتنی غیرضروری اور فضول چیزیں بھی ہوتی ہیں، مثلاً پرانی کینڈیز، شاہی سپاری کا خالی پیکٹ، چند چھالیا کے دانے، کینیڈین اور امریکن ریزگاری، پانچ بال پینز جو تلاش پر کبھی نہیں ملتے، ایک دیاسلائی کی تیلی، وی سی پی کی مرمت کی رسید، خشک اور گیلے ٹیشو پیپرز، ایک اودے پلاسٹک بیگ میں ایک چپسٹک، موئسچرائزر، دو دوا کی ٹیوبز، ٹائگر بام کی بوتل، بالوں کے کلپس، نیل پالش ریموور اور ایک دواؤں کا ڈبا۔ اس کے ہاتھ میں ہم دونوں کے پاکستانی اور کینیڈین پاسپورٹس تھے، وہ میرے پاسپورٹ کو بغور دیکھتی ہے۔

"تم کہاں پیدا ہوئی تھیں؟"

"انڈیا میں۔"

"تمھارے شوہر کہاں پیدا ہوئے؟"

"انڈیا۔" اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر دوسری بیٹھی ہوئی افسر سے کہا، "سن رہی ہو اس عورت کی باتیں؟ دیکھنے میں عرب لگتی ہے، انڈیا میں پیدا ہوئی، ہاتھ میں پاکستانی پاسپورٹ ہے؟" میں نے کہا، "کیوں کہ میں پاکستانی ہوں۔ اب اس نے ایک سخت ٹیچر کی طرح مجھ سے پھر سوال کیا، "تم کہاں پیدا ہوئی تھیں؟"

"انڈیا۔"

"تم جس جگہ پیدا ہوئی تھیں وہ اب کہاں ہے؟"

"انڈیا۔"

"اور تم پاکستانی ہو؟— تم کس کو دھوکا دے رہی ہو؟"

اب اگر میں اس کو پورا قصہ سمجھانے لگتی تو اس کے لیے ہسٹری کے کئی لیکچرز کی ضرورت تھی مگر مجھے وضاحت کی اجازت نہیں تھی اس لیے میں خاموش رہی۔

اس نے پھر کہا، "تو قصہ یہ ہے کہ تم انڈین تھیں پھر پاکستانی بنیں، اب کینیڈین ہو! کیا تم کینیڈا میں رہتی ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تم نے پھر غلط کہا۔ تم کینیڈا میں رہتیں نہیں، تم کینیڈا وزٹ کرتی ہو— کہاں رہتی ہو کینیڈا میں؟"

"پکرنگ اونٹیریو۔"

"کس کے ساتھ؟"

"اپنے بیٹے کے ساتھ۔"

"وہ تمھارا گھر نہیں، تمھارے بیٹے کا گھر ہے۔"

"گھر ہے یا اپارٹمنٹ؟ کرائے کا ہے یا اپنا؟ کبھی تم کینیڈا میں رہی ہو؟ کہاں؟"

"کیلگری میں۔"

"کتنے سال؟"

"چار سال۔"

"کس سال؟"

"انیس سو اٹھانوے اور دو ہزار دو کے درمیان۔"

میرا دماغ سن ہو رہا تھا، ایسا لگتا تھا اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہے۔

"کیلگری میں تم کیا کر رہی تھیں؟"

"میرا بزنس تھا۔"

"کہاں پر؟"

مجھے جگہ کا نام بڑی مشکل سے یاد آیا۔ "فنیر ماؤنٹ ڈرائیو۔"

"تم نے بزنس کیوں بند کیا؟"

"میرا بزنس کچھ اچھا نہیں چل رہا تھا اور میری صحت بھی خراب ہو رہی تھی۔"

"کیا تمھارے پاس پاکستان میں کوئی گھر ہے؟"

"ہاں۔"

"گھر یا اپارٹمنٹ؟"

"گھر۔"

"کہاں؟"

"کراچی میں۔"

"وہاں تمھارا کوئی بزنس ہے؟ اگر ہے تو تمھارے بزنس کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے؟"

"میری منیجر۔"

"تمھارے گھر کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟"

"میرے ملازم۔"

"ہوں— اور تم یہاں ہو! تمھارے ارادے کیا ہیں؟"

"میں سمجھی نہیں؟"

"تم کب واپس جاؤ گی؟"

"چار پانچ دن میں۔"

"تم اس سے پہلے امریکا کب گئی تھیں؟"

مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا۔ شاید پچھلے سال۔ میں نے دوسری افسر کی طرف دیکھا، وہ بالکل لاتعلقی سے اپنے کام میں مصروف تھی۔

"کیا تم نے کبھی امریکا میں کام کے لیے درخواست دی ہے؟"

''کبھی نہیں۔''

''کیا تم کبھی امریکا میں رہی ہو؟''

''ہاں دو یا تین مہینے۔''

''میں نے تمھیں پہلے بھی کہا ہے کہ دو تین مہینے رہنے کو رہنا نہیں وزٹ کہتے ہیں۔ امریکا کیوں جاتی ہو؟''

''وہاں میرا بیٹا رہتا ہے۔''

''عجیب بات ہے کہ تم بجائے اپنے بیٹے کے پاس جانے کے اپنی بھانجی کے پاس جارہی ہو!''

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''اگر تمھیں امریکا آنا ہی ہوتا ہے تو تم پہلے ٹورونٹو کیوں آتی ہو؟''

(میرے شوہر نے پی آئی اے میں کام کیا ہے اس لیے ہمیں فری ٹکٹس ملتے ہیں جس دن ہم آنا چاہتے تھے اس دن شکاگو کی سیٹیں نہیں تھیں اور ویسے بھی ٹورونٹو آنا زیادہ آسان تھا مگر میں اس کو یہ سب نہیں سمجھا سکتی تھی۔)

اس نے ایک بار پھر میرے بیگ سے نکلے ہوئے سامان پر نظر ڈالی اور اس میں سے ماچس کی تیلی اٹھائی اس کا غور سے معائنہ کیا۔

''یہ تمھارے بیگ میں کیوں ہے؟''

اس بات کا جواب تو واقعی میرے پاس نہیں تھا۔ میں تو خود اس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ میں نے کہا، ''معلوم نہیں۔''

''تو تمھیں معلوم نہیں؟ ـــــ ایک چیز تمھارے پاس ہے اور تمھیں اس کے بارے میں معلوم نہیں۔ ٹھیک ہے، اچھا یہ بتاؤ یہ کیا ہے؟'' اس کے ہاتھ میں ہماری دواؤں کا بکس تھا۔

میں نے اپنے سامنے لگے ہوئے بورڈ کو دیکھا جس پر بڑے بڑے جرائم کی فہرست تھی۔ دہشت گردی، منشیات، ہتھیار، اغوا۔ میں نے سوچا نہ جانے مجھے کس جرم کے تحت گرفتار کیا جائے گا۔ میں حیران بھی تھی اور اپنے وجود سے شرمندہ بھی تھی۔ میں اپنا

رنگ، اپنی نسل یا اپنی پہچان کیسے بدل سکتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں پر امیگریشن افسر کتنے مضبوط ہیں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ امریکا نہ صرف یہاں بلکہ پوری زمین کا خدا ہے۔ اگر یہ عورت مجھے جیل بھیج دیتی ہے تو مجھے کوئی نہیں بچاسکتا۔ اگر وہ میرے کسی جواب سے ناراض ہوجاتی ہے تو وہ کوئی بھی ایکشن لے سکتی ہے۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے امریکا جانے کا کوئی شوق نہیں بلکہ اگر وہ کہے تو میں لکھ کر دے دوں کہ میں کبھی امریکا نہیں جاؤں گی۔ اچانک اس کی آواز پھر مجھے چونکا دیتی ہے، ''کیا تم انڈیا گئی تھیں؟''

''کیوں؟''

''میں ایک امن کمیٹی کی ممبر ہوں۔''

''واٹ کمیٹی؟''

''ایک ایسی کمیٹی جس کے ممبرز شاعر، فن کار اور رائٹرز ہیں۔''

''تم کیا ہو؟''

میں نے سوچا:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

مگر میں صرف پہلا مصرع پڑھ سکتی تھی، اگر کہیں اگلا مصرع پڑھ دیتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ مجھ بے چاری کی کیا اوقات۔ بہرحال میں نے کہا، ''میں ایک رائٹر ہوں۔'' مجھے شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔

''کب سے؟''

وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہمارے پاسپورٹس ہیں۔ وہ کمپیوٹر میں کچھ لکھتی ہے پھر سوالیہ نظروں سے دوسری افسر کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ نفی میں سر ہلاتی ہے۔

میز پر میری چیزیں سجی رکھی ہیں، شاہی سپاری کا خالی پیکٹ میرا منہ چڑا رہا ہے، میرا والٹ کافی پُرانا ہوچکا ہے، کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ اس کو بدل دوں۔ میز پر چند تصویرِ بتاں ہیں۔ میرے امریکن بیٹے اور میرے کینیڈین بیٹے کی تصویر اور میرے ستارۂ جرأت

شوہر کی تصویر جو اس وقت خاموشی سے باہر بیٹھا میرے باہر آنے کا انتظار کررہا تھا۔ وہ شخص جو اپنے ملک میں کسی حیثیت اور پہچان کا حامل ہے اس وقت وہ محض تیسری دنیا کا ایک باشندہ ہے اور ہوسکتا ہے کچھ دیر بعد اسے ایک دہشت گرد ثابت کردیا جائے۔ کوئی نہیں تھا جو ہماری سفارش کرتا۔ میں نے اپنے سانولے ہاتھوں کو دیکھا، اگرچہ یہ ہاتھ اتنے کالے نہیں تھے جتنے کہ سوال کرنے والے کے تھے مگر یقیناً اتنے سفید بھی نہیں تھے جتنے حاکمِ وقت کے تھے۔ اس سفید نسل کے ہاتھ جو اس وقت پوری دنیا کو چٹکیوں میں مسلنے کی قوت رکھتی تھی۔ ہم کبھی اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ بعض حقیقتیں کبھی بدلی نہیں جاسکتیں۔ میں دنیا کے کسی بھی ملک کی قومیت حاصل کرلوں، میں ہمیشہ اپنے رنگ سے پہچانی جاؤں گی۔ اس وقت تو شاید میرا کینیڈین پاسپورٹ بھی اس بات پر شرمندہ تھا کہ وہ مجھ جیسے نچلے درجے کے فرد کی نمائندگی کررہا تھا۔ مگر وہ اس بات پر خوش تھا کہ اس پاسپورٹ کی تصویر والا فرد اصل میں اس کی زمین سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ میں اس وقت محض ایک پاکستانی تھی۔ وہ پاکستان جہاں کے نوّے فی صد لوگ امریکا آجانا چاہتے ہیں۔ امریکا جو ان کے لیے زمین پر ایک جنت ہے۔

زمین پر اگر کوئی جنت ہے تو یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے!

کھڑکی سے باہر موسم اب بھی اتنا ہی دلکش تھا لیکن کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ خوب صورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ وہی موسم اب میرے لیے بہت خوف ناک تھا۔ میرے سامنے تو اس وقت صرف میری زندگی کا فیصلہ کرنے والا کھڑا تھا۔ میں اس کے فیصلے کی منتظر تھی۔ لگتا تھا باہر اندھیرا زیادہ ہوگیا تھا، ہوا سے کھڑکی کا شیشہ کانپ رہا تھا، کھڑکی سے باہر کوئی پھول پتا نہیں تھا، صرف خالی آسمان تھا اور اس پر اڈتے ہوئے کالے بادل تھے۔ آخرکار اس نے شعیب کا پاسپورٹ بند کیا، مجھے حکم دیا کہ میں اپنی چیزیں اکٹھی کروں اور مجھے للکار کر کہا، ''ہے مسز خان، تمھیں پیر کو ہمارا ملک چھوڑ دینا ہے۔''

مسز خان نے ایک مظلوم مگر مؤدّب طالبِ علم کی طرح اپنا سر ہلایا۔ ہم لابی میں واپس آگئے۔ اس کی کرخت آواز ایک بار پھر کانوں سے ٹکرائی۔ ''مسٹر خان تم سن رہے

ہو؟ تمھیں پیر کو واپس چلے جانا ہے۔'' مسٹر خان نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور ہم بھاری دل لیے اپنی ٹیکسی کی طرف بڑھے۔

شاید یہ چالیس منٹ میری زندگی کے سب سے لمبے چالیس منٹ تھے۔ یہ کہانی اس قوم کی ہے جہاں کے لوگ اپنے ملک، اپنی پہچان اور اپنی آزادی کی قدر نہیں کرتے۔ وہ قوم جو اپنے بچے مغرب کو سستے مول بیچ چکی ہے۔ ہم وہ بدقسمت لوگ ہیں جو خود اپنے رنگ ونسل، اپنی زبان اور اپنے کلچر پر شرمندہ ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید دوسری قومیں ہمیں اپنالیں گی اور اپنی زمین پر خوش آمدید کہیں گی۔

کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

ہم اٹھائیس اگست کو کینیڈا سے کراچی پہنچے۔ پُرانی عمارتیں، ٹوٹی سڑکیں، سخت گرمی۔ مگر اپنا ملک اپنا ملک ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوں۔ اگرچہ گھر میں تنہائی تھی۔ بچوں کے ساتھ اتنا عرصہ گزارنے کے بعد اب گھر میں کچھ زیادہ ہی تنہائی محسوس ہو رہی تھی مگر— ایک دن میں ہی گھر کی مصروفیت میں ہم سب کچھ بھول گئے۔ الیکشن کی وجہ سے ہر طرف ایک بے چینی سی ہے لیکن مجھ جیسے معمولی فرد کو کیا فرق پڑتا ہے کہ کون آئے اور کون نہ آئے۔ میرا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی ہے۔ میں اپنی اس کتاب کے مکمل کرنے میں مصروف ہوں جو بنیادی طور پر زمین سے محبت پر مبنی ہے۔ اس محبت کا نتیجہ مجھے پاکستان پہنچتے ہی مل جاتا ہے۔ مجھے اس کولمبین عورت لورا کی باتیں اب سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ وہ جو اپنے ملک کے ذکر پر کبھی ہنستی تھی اور کبھی روتی تھی۔ وہ جو کہتی تھی، میں اس ملک سے کیوں محبت کروں، اس زمین کو کیوں چاہوں جہاں کے لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں جو مجھے اور میرے شوہر کو اٹھا لے جانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ جو میری محبت کی قدر نہیں کرتے۔ بچپن میں اماں ایک کہانی سناتی تھیں کہ شہزادی پہلے اسے دیکھ کر ہنسی اور پھر روئی۔ میری کیفیت آج کچھ ایسی ہی ہے۔ میں پہلے اپنی اس زمین کو دیکھ کر ہنستی ہوں اور پھر اس محبت نامے کو دیکھ کر روتی

ہوں جو میرے نام آیا ہے۔ کیا اس زمین سے میری محبت کا یہی صلہ ہے۔ کیوں اور کیسے؟ یہ کون ہے جس سے میں نے کوئی زیادتی کی ہے کہ وہ مجھے موت کی دھمکی دیتا ہے۔ میں کوئی اہم شخصیت بھی نہیں ہوں کہ میرے قتل سے کسی کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ کبھی یہ نہیں پتا چل سکے گا کہ مجھے یہ خط کس نے لکھا ہے؟ لیکن کاش صرف یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کیا خطا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر یہ مہربانی کی گئی۔ اس ایک خط نے میرے تمام خیالات کو منتشر کر دیا۔ اس کالی امریکن عورت سے بھی مجھے کوئی نہیں بچا سکتا تھا اور یہاں بھی کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہاں بھی میں کسی کے پاس فریاد لے کر نہیں جا سکتی تھی اور یہاں بھی کسی کے پاس فریاد لے کر جانا ناممکن ہے۔ میں کس ملک سے تعلق رکھتی ہوں؟ کیا اپنا دیس اس جگہ کا نام نہیں جہاں کے لوگ آپ سے پیار کرتے ہوں۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں، یار ایک ہی زندگی ملی اور وہ بھی پاکستان میں۔ شاید سچ ہی کہتے ہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ چند دنوں کی بات ہے۔ اسی ملک میں ایسے پیار کرنے والے لوگ بھی بستے ہیں جو میرے لیے پریشان ہیں۔ پھر بھی میں سوچتی ہوں میں ہی کیوں؟ میرے اس جملے پر شعیب ہنستے ہیں اور مجھے ٹینس پلیئر آرتھر ایش کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ ایک کالا تھا جسے ٹینس کھیلنے کا شوق تھا مگر کالا ہونے کی وجہ سے اسے ٹیم میں نہیں لیا گیا اس نے اس تعصّب کے خلاف ایک مہم چلائی اور ایک دن وہ ورلڈ چیمپیئن بنا۔ ایک بلڈ ٹرانسفیوژن کی وجہ سے اسے آخری عمر میں ایڈز ہو گیا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ کیا کبھی تم سوچتے ہو کہ کیوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھیں ہی یہ بیماری ملی۔ اس نے کہا کہ لاکھوں لوگ ٹینس کھیلتے ہیں، ان میں سے چند کو موقع ملتا ہے کہ وہ ملک کی ٹیم میں کھیلیں۔ پھر سیکڑوں لوگ ٹیم میں کھیلتے ہیں مگر چند کو ورلڈ ٹیم میں کھیلنے کا موقع ملتا ہے اور پھر ان بے شمار میں سے کوئی ایک کامیابی کی منزل کو چھوتا ہے اور ورلڈ چیمپیئن مانا جاتا ہے۔ میں نے ان تمام کامیابیوں پر یہ نہیں کہا کہ میں ہی کیوں؟— تو اب میں کیوں یہ کہوں کہ میں ہی کیوں؟ شعیب کا کہنا ہے کہ تم نے کتابیں لکھیں، بزنس چلایا، ٹیلی وژن پر نام کمایا، اس وقت تم نے کہا کہ یہ سب تمھارے ٹیلنٹ کی وجہ سے ہے۔ اس وقت تم نے یہ نہیں کہا کہ

میں ہی کیوں؟ تو اب بھی تمھیں شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے بھی سوچا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ زندگی تو ایک پیکیج ہے۔ اس میں آپ طرح طرح کے رنگ دیکھتے ہیں۔ میں کیوں یہ نہیں کہتی۔ برے یا بھلے سب زمانے تیرے۔ ایک خط آئے جب چند دن گزر جاتے ہیں تو میرا موڈ بہتر ہوجاتا ہے مگر جیسے ہی نیا محبت نامہ آتا ہے میں چند دن کے لیے پھر پریشان ہوجاتی ہوں۔ ہر مرتبہ اس خط میں نئی دھمکی ہوتی ہے اور نئی نئی فرمائشیں ہوتی ہیں۔ جیسے لکھنا چھوڑ دو، گانا گانا چھوڑ دو، تمھارے شوہر کو اٹھا لے جائیں گے، تمھاری دُکان کو بم سے اڑا دیں گے۔ سوچتی ہوں کینیڈا چلی جاؤں مگر پھر اس شخص کا خیال آتا ہے جس کا کہنا ہے کہ جس ملک کے بننے میں میرے آباو اجداد کا خون ہے، میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔ اسی زمین نے مجھے اس قابل بنایا ہے کہ میں آج اس مقام پر ہوں۔ کئی مرتبہ یہ سوچا ہے کہ ان خطوط میں سے کچھ کو اس کتاب کی زینت بناؤں مگر پھر یہ سوچ کر رک جاتی ہوں کہ یہ نہ ہو کہ یہ دشمنی کا سلسلہ پھر شروع ہوجائے۔

◇

ہم حسن پرویز کے گھر میں تھے۔ جتنے لوگ وہاں جمع تھے وہ سب اگرچہ دوست تھے مگر اس کے باوجود اپنی الگ الگ سوچ رکھتے تھے۔ ریٹائرڈ فوجی تھے جن کی نظر میں سویلین کسی قابل نہ تھے۔ کٹر سویلین تھے جو فوجیوں کے خلاف تھے۔ سرخ سویرے کے خواب دیکھنے والے سرخے تھے اور مجھ جیسے لوگ تھے جو نہ اِدھر کے تھے نہ اُدھر کے۔ ہر طرف قہقہے تھے۔ ایک چائے کا اشتہار ہے کہ یہی تو ہے اپنا پن۔ تو بس وہی اپنا پن یہاں تھا۔ مختلف سوچیں رکھنے کے باوجود ہم سب ایک تھے۔ ایسی ساعتیں زندگی میں کم کم نصیب ہوتی ہیں۔ جب آپ بات بے بات ہر بات پر ہنس سکیں۔ آپ اتنا خوش ہوں کہ ایسا لگے جیسے زندگی میں کوئی غم ہی نہیں۔ گرمی تھی، بجلی بار بار جاتی تھی، یو پی ایس میں کچھ خرابی تھی۔ صاحبِ خانہ پریشان تھے مگر ہم سب کو بجلی کے جانے کا کوئی غم نہیں تھا۔ ہم بالکل بے آرام نہیں ہوئے، تو کیا خوشیوں کا تعلق بجلی کے آنے جانے پر منحصر نہیں۔ کے

ای ایس سی تجھے غم تو ہوگا کہ اس لمحے ہماری خوشیاں تجھ پر منحصر نہ تھیں۔

پندرہ منٹ بعد ایک اور خاتون ہماری محفل کی زینت بن گئیں۔ زینت میں نے خاص طور پر اس لیے کہا کہ وہ گوری تھیں صرف رنگ کی گوری نہیں بلکہ اصلی اور نسلی گوری، گوری، گوری۔ سوئٹزرلینڈ کی رہنے والی خاتون۔ ہم کہ گوروں کو دیکھ کر خاص مؤدب ہوجاتے ہیں۔ اس لیے ہم سب عادتاً ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم اپنے بیسٹ بی ہیویر پر ہوگئے۔ گفتگو نے انگریزیت کا رُخ لیا، مگر تھوڑی دیر میں اندازہ ہوا کہ وہ تو بہت اچھی اردو بولتی ہیں تو ہم کیوں انگریزی کے کرب میں مبتلا ہوں۔ اگرچہ ان کی موجودگی سے ماحول میں ایک تبدیلی آگئی تھی، ہم سب نے کوشش کی کہ ذاتی ہو ہو سے ہٹ کر ان کی طرف توجہ دی جائے۔ احترام کے طور پر ہم نے اپنے کان ان کی تحویل میں دے دیے تاکہ ان کو ایسا نہ لگے کہ وہ ہماری محفل میں اجنبی ہیں۔

معلوم ہوا کہ وہ پچھلے پچاس سال سے پاکستان میں ہیں۔ پچھلی صدی کی پانچ ویں دہائی میں وہ سوئٹزرلینڈ سے لندن پڑھنے کے لیے گئی تھیں، عمر اٹھارہ سال تھی۔ وہ عمر جب انسان کو اپنے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ جی چاہتا ہے کہ بس آئینہ ہو اور اپنا عکس ہو اور پھر اگر کوئی اس عکس کی تائید کردے بس پھر تو بات ہی کیا ہے۔ تو کچھ ایسا ہی ہوا کہ کسی پاکستانی وڈیرے نے ان سے کہہ دیا کہ نہیں ہے کوئی تیرے سوا اس پورے جہان میں۔ ایسی بات تو خدا بھی سننا چاہتا ہے تو پھر وہ تو بے چاری انسان تھیں اور وہ بھی صرف اٹھارہ سال کی۔ بس اس پاکستانی کی باتوں میں آگئیں۔ بغیر یہ غور کیے کہ ان سے مخاطب کون ہے۔ ان کی ماں نے انھیں بہت سمجھایا کہ میں ان کو جانتی ہوں۔ وہ تو پاکستان کا ایک وڈیرہ ہے اور خود ہم گوروں نے ان کو زمینیں دے دے کر وڈیرہ بنایا ہے۔ وہ تو اپنے ہاریوں سے پیر دبواتے ہیں، تم تو اس کی بیوی بنوگی وہ جانے تم سے کیا کیا کروائے گا۔ خود ہی کہنے لگیں، ”مگر جب عشق ہو جائے تو انسان اندھا اور بہرا ہوجاتا ہے۔ معشوق اتنا قدآور ہوجاتا ہے کہ آپ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ ہر چیز اس کے کے پیچھے دُھندلی ہو جاتی ہے، نہ کوئی اس سے خوب صورت لگتا ہے اور نہ ہی اتنا دلچسپ۔ جدھر دیکھتی تھی اُدھر وہ

ہی وہ تھا۔ ایک نشہ تھا کہ جی نہیں چاہتا تھا کہ اس سے باہر آؤں۔ ویسے عشق بھی کیا چیز ہے جس نے کیا وہی جانتا ہے۔ ہر شخص کو زندگی میں ایک مرتبہ عشق کرنا ضرور چاہیے۔ میں اپنے اس دور پر بالکل نہیں پچھتاتی۔"

قصہ مختصر کہ میں سائیں کے عشق میں ایسی گرفتار ہوئی کہ بقول سحر امداد:

عکس بنا جوں آئینہ کچھ بھی نہیں ہے سائیں
نام بنا انسان جوں کچھ بھی نہیں ہے سائیں
سندھو ساگر کے بنا کچھ بھی نہیں ہے سائیں
میں بھی تم بن سانورے کچھ بھی نہیں ہوں سائیں

میں نے شادی کی اور اس کے ساتھ پاکستان آگئی۔ پاکستان— واہ کیا جگہ تھی۔ میرے لیے تو وہ جنت تھی۔ میں کہ کبھی کسی نوکر کی شکل نہیں دیکھی تھی یہاں تو میں ملکۂ عالیہ تھی۔ نوکر چاکر، اتنی بڑی حویلی، بڑی بڑی گاڑیاں، سوئٹزرلینڈ تو اس کے مقابلے میں بے کار جگہ تھی۔ خود کام کرو، بس کا انتظار کرو اور پھر برف اور سردی۔ کوئی نہیں تھا جو ایک گلاس پانی ہی پلادے۔ میں تو آج بھی جب سوئٹزرلینڈ جاتی ہوں تو لوگ کہتے ہیں واپس آجاؤ۔ میں تو کبھی واپس نہ جاؤں، اتنے بے کار لوگ ہیں وہاں بالکل پرائیویٹ اور ریزرو۔ یہاں کے لوگ کتنے خوش اخلاق، کتنے فرینڈلی اور محبت کرنے والے، ایک دوسرے کی مدد کرنے والے۔

ان خاتون کی اردو بہت اچھی تھی مگر اس طرح رگوں میں رچی بسی نہ تھی کہ اردو سے ان کی اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ جب وہ کافی دیر پاکستانیوں کی تعریف کرچکیں تو میں نے کہا، "آپ کی کہانی تو ادھوری رہ گئی۔" کہنے لگیں، "کیا ادھوری رہ گئی ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے۔ ابھی تو بہت طرح کے پاکستانیوں کا ذکر باقی ہے۔ میں سائیں کے عشق کے ساتھ ساتھ اس حویلی اور اس کے ماحول کے سحر میں بھی گرفتار ہوگئی۔ نشہ تھا کے بڑھتا ہی جاتا تھا، عیش و آرام کسے پسند نہیں۔"

مجھے اپنے آج کے وہ پاکستانی یاد آگئے جو آج پاکستان چھوڑ کر مغرب میں جا بسے

ہیں۔ وہ وہاں کی ہر چیز کی تعریف کرتے ہیں صفائی کی، ستھرائی کی، سڑکوں پر ڈسپلن کی، بجلی اور پانی کی فراوانی کی، وہاں کی تعلیم کی، وہاں کی سیکیورٹی کی، اور پھر ہم جیسے ہیں کہ رہنے والوں کی زندگی پر رشک کرتے ہیں کہ آپ کے کیا عیش ہیں کہ آپ کے پاس ملازم ہیں اور آپ کو کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ گویا انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ ہمیشہ اپنا کام اور دوسرے کا عیش زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ Best of both worlds ملنا ہر ایک کی قسمت نہیں ہوتا۔

"اس ماحول اور حویلی کا نشہ بڑھتا جاتا تھا کہ اچانک ایک دن مجھے ایک شدید دھچکا لگا۔ مجھے معلوم ہوا کہ جس زمانے میں لندن میں، میں سائیں سے عشق کی پینگیں بڑھا رہی تھی اس زمانے میں سائیں کی ایک اسپینش بیوی بھی تھی۔ اسی شہر لندن میں وہ کسی اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اسپینش بیوی نے پاکستان آنے سے انکار کردیا، اس لیے اسے طلاق دے دی۔ میں بہت روئی دھوئی مگر میرے شوہر نے کہا کہ وہ تو قصۂ پارینہ تھا۔ اب تو صرف تم میرے خوابوں کی ملکہ ہو اور تم ہی میری ہر چیز کی مالک ہو۔ بات پھر اِدھر اُدھر ہوگئی۔ یہ سوچ کر کہ مرد بے چارے تو صدا کے معصوم ہیں اور روزِ اوّل سے حوّا نے اسے بے وقوف بنا کر رکھا ہے۔ کچھ کیا ہوگا جادو وادو اس چڑیل نے کہ میرا سائیں اس کے دھوکے میں آگیا۔ آپ کے اسلام میں تو ویسے بھی جادو برحق ہے اور آپ اس پر یقین رکھتے ہیں۔ چناں چہ میں نے بھی اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ مگر اس واقعے کے چند مہینے بعد ایک بات ہوئی جو اس سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ سائیں کی ایک اور بیوی بھی تھی جو اس کے چچا کی بیٹی تھی۔ یہ نکاح بچپن کا تھا، مجھے جب یہ معلوم ہوا تو میں تو آگ بگولا ہوگئی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"لو— میں کیا کرتی؟ کیا کرسکتی تھی؟ میرے پیٹ میں نو مہینے کا بچہ تھا، میرے ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں تھا، کوئی تعلیم نہیں تھی، میرا کوئی شخص یہاں نہیں تھا جو مجھے سہارا دیتا۔ میں ایک اجنبی ملک میں تھی، مگر میں ہی جانتی ہوں کہ مجھ پر کیا گزری۔ اپنے شوہر کو کسی

کے ساتھ شیئر کرنا کتنا مشکل ہے۔"

میں نے کہا، "آپ تو اس ماحول میں دو سال سے رہ رہی تھیں اسی خاندان میں آپ نے اپنے اردگرد بہت سی ایسی عورتیں دیکھی ہوں گی جو اس دکھ کو جھیل رہی ہیں اور اس کی عادی ہو چکی ہیں۔"

"Not me مجھے تو ایسا لگا جیسے اس سے بڑا کوئی دھوکا نہیں۔ میں بہت چیخی چلائی مگر کیا کہوں کہ مجھے وہ سب بھی برداشت کرنا پڑا۔ سچ کہوں۔ میں اس حویلی کے عیش و آرام کی عادی ہو چکی تھی۔ سائیں کے ساتھ رہنے میں میرا فائدہ بھی تھا۔ مگر اس کے بعد سائیں کے ساتھ رہنا ایک نوکری کی طرح تھا۔ اس تمام کہانی میں اگر کوئی میرا ہم درد تھا تو وہ میری ساس تھی۔ وہ میرے درد کو سمجھتی تھی۔ اس نے ہر زچگی میں، ہر تکلیف میں میرا ساتھ دیا۔ سائیں، اس کا ایک ہی بیٹا تھا ایک بگڑا ہوا وڈیرہ۔ اور پھر اس کے بعد میں نے اس کے لیے پانچ اولادیں پیدا کیں۔ اچھا تھا کہانی یہیں ختم ہو جاتی مگر ابھی تو مجھے بہت اذیتیں اٹھانی تھیں، سائیں کو ستر سال کی عمر میں ایک اور عشق ہو گیا۔ وہ لڑکی جو اس سے پینتالیس سال چھوٹی تھی، پہلے اس کی داشتہ بنی اور پھر اس کی بیوی بن بیٹھی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، میں نے اس کو بھی accept کرلیا کہ میرا فائدہ اسی میں تھا۔ مگر ایک بات بہت اچھی ہوئی کہ اس کے ایک سال بعد سائیں کا انتقال ہو گیا۔ اب میں آزاد ہوں، میرے بچے کچھ یہاں ہیں کچھ باہر اور میں اب چھہتر سال کی ہو کر بہت آرام کی زندگی گزار رہی ہوں۔ میں اپنے آپ کو پاکستانی سمجھتی ہوں، اگرچہ پاکستانی اب بھی مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔ سائیں کا خاندان اب بھی مجھے میم کہتا ہے۔"

◇

بے ونڈوز تھیں، ہریری پردے تھے، چھت پر چمکتا ہوا جھل مل کرتا شینڈ لیر تھا۔ اس کے ساتھ ہر میز پر قیمتی ٹیبل لیمپس تھے، چمکتے فرش پر بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے

قالین۔ ہم جس ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اس کا ہر حصہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ لے سانس بھی آہستہ... ایک سے ایک نوادرات تھے جو قدم قدم پر سجے تھے۔ فرش اتنا جھم جھم تھا کہ پاؤں رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کھڑکیوں پر راسلک اور ٹشو کے پُروقار پردے تھے۔ لگتا تھا کسی فرنیچر کے شوروم میں بیٹھے ہیں۔ میں جس کرسی پر بیٹھی تھی اس کے ہتھے پر بازو رکھتے ڈر لگتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا چمکتا سونا میرے بازو سے خراب ہو جائے۔ غرض ایک الف لیلوی ماحول تھا، میں ڈرتی تھی کہ میری آنکھ نہ کھل جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر جاگ بھی گئی تو ہنوز خواب میں ہی رہوں گی۔ مگر حیرت تھی تو صرف اس بات پر کہ میں یہاں کیوں ہوں؟ یقیناً اس جگہ کے رہنے والے لوگ بھی اتنے ہی پُرکشش ہوں گے جس طرح وہ پھول اور پودے تھے جو قیمتی گل دانوں میں وقار سے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ آج کی دعوت کے لیے باہر لان بھی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ لان میں پہنچ کر سب کی پُرتحسین آوازوں نے واؤ کا نعرہ لگایا۔

اس محفل میں زیادہ تر خواتین کسی نہ کسی حیثیت کی حامل تھیں۔ یہاں یہ سب خواتین غریبوں اور خواتین کے مسائل کے سلسلے میں جمع ہوئی تھیں کم از کم ارادے تو نیک تھے۔ مگر یقین نہیں آتا تھا کہ جو لوگ اس ماحول میں اپنے دن رات بسر کرتے ہوں وہ یہ تصور بھی کیسے کر سکتے ہیں کہ غربت بھی اسی ملک کا حصہ ہے اور اگر ہم اتنے ہی حساس ہیں تو اپنے مخملیں بستر پر راتوں کو چین کیسے ملتا ہے۔ میرا اس تمام ماحول سے صرف اتنا تعلق تھا کہ میں وہاں محض ایک ناظر یا راوی کی حیثیت سے حاضری دیتی تھی۔ وہاں پر ایک دو خواتین اور بھی تھیں جو شاید میری ہی طرح تھیں کہ وہاں ہوتے ہوئے بھی اس جگہ کی نہ لگتی تھیں۔ ایک سادی سی ساری میں ایک صاحبہ لپٹی بیٹھی تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی گورنمنٹ کے محکموں میں گزاری تھی اور اسی سلسلے میں ملک کے اندرونی علاقوں میں بھی رہی تھیں۔ ان کو دیکھ کر لگتا تھا کہ انھوں نے زندگی کی حقیقتوں کو اور زندگی کے کرب کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور ان کی گفتگو کے دوران اس بات کا احساس ہوا کہ انھیں اندازہ ہے کہ ہمارے ملک کی اکثریت کا اس بے بسی سے نکلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے اپنی مختصر

گفتگو میں ان بچیوں کے مسائل بتائے جو گھروں سے کام کے لیے نکلتی ہیں تو انھیں کن کر مشکلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ خواتین گھروں میں، بسوں میں اور پھر دفتروں میں کن کن مسائل کا سامنا کرتی ہیں۔ ان کی بہت سی کہانیوں میں سب سے خوف ناک کہانی اس عورت کی تھی جس کا تعلق خضدار سے تھا۔ اس کے شوہر کے ہل چلانے والے دو بیلوں میں سے ایک بیل مر گیا تھا اور وہ اس بیل کی جگہ ہر صبح اپنی بیوی کو جوتتا تھا اور بیل کے ساتھ ساتھ وہ عورت بھی ہر صبح ہل کھینچتی تھی۔

ہم سب ملکٹانی سوپ پیتے تھے اور اس عورت کی زندگی پر افسوس کرتے تھے۔ ہم سب کو اپنی نئے ماڈل کی شوفر ڈریون گاڑیوں پر فخر تھا اور ہم ان بچیوں کے لیے پریشان تھے جو ہر صبح بسوں میں بیٹھتی ہیں تو ہر شخص ان کو ہاتھ لگا کر اپنی طبیعت کو سیر کرنا چاہتا ہے۔ ہم سب کے لیے باعثِ فخر یہ تھا ہم ہزار یا دو ہزار گز کے بنگلے میں رہتے ہیں۔ ہم اس قوم کے لوگ تھے جو نہیں جانتی کہ کون سی بات ان کے لیے باعثِ فخر ہے اور کون سی باعثِ شرم؟ کیا اس خوبی کو بھی ہم اپنی identity میں شامل کر سکتے ہیں۔ میں اپنے زخموں کو چاٹتی تھی، خود کو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچا کر مضبوط ہو جانا چاہتی تھی اور ڈرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کچھ کہہ بیٹھوں اور محفل سے بے آبرو ہو کر نکالی جاؤں۔ باربے کیو کا دھواں میری آنکھوں میں لگتا تھا اور میری آنکھیں شاید اس تلخی سے بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔

میرے سامنے بیٹھی مسز شیرازی اپنی ساری کے زرّیں پلو کو باربار سنوارتی تھیں، روشنی میں ان کے کانوں کے ٹاپس ہر طرف روشنی بکھیرتے تھے، ان کے بالوں میں جوڑے کی پنیں بڑی بے ترتیبی سے لگی تھیں۔ میں اگرچہ جسمانی طور پر وہیں تھی مگر باربار میرا ذہن خضدار پہنچ جاتا جہاں ایک عورت ہل کو کھینچتی تھی، اگرچہ ہل کا زیادہ بوجھ بیل سنبھالتا تھا مگر پھر بھی اس کے قدم باربار ڈگمگاتے تھے۔ کوئی نہیں تھا جس کے پاس وہ فریاد لے کر جاتی بلکہ شاید اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ کوئی شکایت کی بات ہے۔ اس کی پہچان یہی ہے کہ وہ تیسری دنیا کے ایک غریب ملک کی عورت ہے۔ اس کی ماں بھی اسی زمین میں دفن ہے، اسی سوندھی مٹی میں جس کو وہ اپنے کاندھے پر رکھے ہل سے کھودتی

ہے۔ اسی مٹی کی خوش بو اس کے جسم میں رچی بسی ہے اور یہی زمین اس کے راکھ راکھ چہرے کی ہر لکیر میں لہو بکھیرتی ہے۔ زمین جو ماں ہے، کیا اس عورت کے اس بیگار کا کوئی شاہد ہے؟ کیا اس بیگار کی کوئی قیمت ہے؟ سوائے ہر آنے والی رات کا کرب، چند گھونسے اور چند لاتیں اور پھر اگلی صبح— وہ زمین جو سب کو طاقت دیتی ہے وہی زمین اس عورت سے اس کی تمام طاقت چھین لیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے کلچر کا آئینہ ہوتا ہے، کیا ہم میں اتنی ہمت ہے کہ اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ سکیں؟

اور پھر میں سوچتی ہوں کہ کیا یہی میری پہچان ہے؟ نہیں نہیں! میں اس بات کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی، میں تو ملکوں ملکوں گھومنے والی ہوں، میں کسی خضدار کو نہیں جانتی۔ ہوگی کوئی عورت وہاں، ہوتا ہوگا اس پر ظلم، مگر کیا وہ بھی میری ہی سوہنی دھرتی کا حصّہ نہیں؟ کیا میں اس کے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟ دنیا جب اتنی ترقی کر چکی ہے، ہمارے بنیادی مسائل ہی حل نہیں ہوتے۔ مگر میں یہ کیوں بھول جاتی ہوں کہ میرا دُنیا کے جس حصّے سے تعلق ہے وہاں عورت محض ایک چیز ہے۔ اس کی زندگی کے فیصلے کرنے والے دوسرے ہوتے ہیں۔ اور وہ عورتیں جو اپنے فیصلے خود کرتی ہیں معاشرے میں عزت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتیں۔

اس عورت کی کہانی کے ساتھ مجھے بچپن کی پڑھی ہوئی پرل ایس بک کی لکھی ہوئی ''گڈ ارتھ'' یاد آ گئی۔ یہ کتاب اس نے سن انیس سو اکتیس میں لکھی اور اسے Pulitzer کا انعام ملا۔ اس کتاب میں اس نے چینی عورت کی زندگی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کس طرح بچہ پیدا کرنے کے کرب سے گزر کر چند منٹ بعد واپس کھیتوں میں کام کرتی ہے۔

جب تک ہم لوگوں پر ہونے والے مظالم کا برسرِ عام ذکر نہیں کریں گے اس وقت تک یہ مظالم بند نہیں ہو سکتے۔ ہمارے یہاں تو مرد اور عورت کی بھی تخصیص نہیں صرف کسی سے کم تر ہونا شرط ہے۔

◇

کراچی کے جگمگاتے شہر میں، جگمگاتا اس لیے کہ میں ایک شادی ہال میں تھی اور

کے ای ایس سی مہربان تھی ورنہ فیض کا روشنیوں کا شہر تو اب کافی حد تک اندھیرے میں گم ہوگیا ہے۔ اس غریب ملک کے غریب شہر میں شادی کی دعوتیں بہت عجیب لگتی ہیں کہ یہاں پر خواتین چالیس پچاس ہزار کے جوڑے پہنے ہوتی ہیں اور دُلھن کا جوڑا تو لاکھوں کا ہوتا ہے اور کہنے کو ملک غریب ہے۔

ایک ایسی ہی محفل میں میری ملاقات اقبال جعفر سے ہوئی جو ایک انگریزی اخبار کے کالم نگار بھی ہیں اور اس کے علاوہ میری ایک دوست کے بھائی ہیں۔ میری کتاب کا ذکر ہوا اور بات وہی شناخت اور پہچان تک پہنچی۔ انھوں نے کہا، ''آپ کی کتاب کا کینوس بہت وسیع ہے کہ آپ نے پوری دنیا کی بات کی ہے۔ اگر آپ کے اس موضوع کو محدود کرلیا جائے تو مجھے یہ بتائیے کہ پاکستان میں پاکستانیوں کی کیا شناخت ہے؟ آپ کے خیال میں پاکستانی کون ہیں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ کہنے لگے، ''ایک پاکستانی تو وہ ہے جو مدرسے سے نکلتا ہے اور وہ صرف جنت جانے کا خواہاں ہے۔ وہ جنت جانے کے لیے بھی کسی قطار میں کھڑا ہونا نہیں چاہتا بلکہ کسی طرح مار دھاڑ کر کے اپنے لیے جنت کا راستہ نکالتا ہے۔ وہ مذہب کے جنون میں مبتلا ہے اسے نہیں پتا کہ پاکستانی ہونا کیا ہوتا ہے؟ اور نہ اسے اس کی پروا ہے۔ پھر وہ پاکستانی ہے جو اردو میڈیم ہے ہم اسے پڑھے لکھے لوگوں میں شمار کرتے ہیں، کیوں کہ وہ باقاعدہ اسکول گیا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اسے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک ایسا سلیبس بنایا جاتا ہے تا کہ اس کا برین واش کیا جاسکے۔ اگر اسے اردو زبان پڑھائی جاتی ہے تو اس زبان کے ذریعے اس کے ذہن میں کچھ منفی باتیں بھی بھردی جاتی ہیں۔ کسی بھی اردو کی کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیجیے کتاب کا پہلا سبق حمد ہے، پھر نعت ہے، لیکن اس سے آگے سب میں اپنے اپنے مطلب کی وہ باتیں درج ہیں جو ذہنوں کو پراگندہ کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سب لوگ ایک ہی جیسے ذہن لے کر اسکول سے باہر نکلتے ہیں۔ کیا یہ لوگ ایک پاکستانی کی تصویر ہیں؟ ایک ایسے پاکستانی کی جو اپنے آزاد ذہن سے سوچتا ہے؟ یہ لوگ اپنی شناخت کے بارے میں کافی کنفیوزڈ ہیں۔ ان کی عمر یہ سوچتے ہی گزر جاتی ہے کہ وہ پہلے مسلمان

ہیں یا پہلے پاکستانی؟ پھر ہمارا انگلش میڈیم طبقہ— یہ ہماری امیر، فیشن ایبل اور بعض موقعوں پر snob کلاس ہے۔ جہاں تک اس جماعت کا تعلق ہے وہ خود کو اس ملک کا ایک فرد نہیں سمجھتی۔ ہاں اگر یہ ملک ویسا ہوتا جو ان کا آئیڈیل ہے تو پھر شاید وہ فخر سے خود کو پاکستانی سمجھتے۔ ان کو لگتا ہے کہ وہ کسی غلط جگہ اور غلط لوگوں میں پیدا ہوگئے ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ اچھے خاصے معقول لوگ ہیں، ان کو نہ جانے کیوں اس کوڑا کرکٹ میں پھینک دیا گیا ہے۔ ان کے لیے یہ ایک ایسا سچ ہے جو نہ نگلا جاتا ہے اور نہ اگلا جاتا ہے۔''

میں نے کہا، ''ابھی تو ملک کے بہت سے طبقے اور جماعتیں باقی ہیں۔ ذرا سب کا پوسٹ مارٹم کیجیے۔ اس وڈیرے کی بات کیجیے جو چاہے اوکسفورڈ سے پڑھ کر آئے یا ہاورڈ سے مگر پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ واپس وڈیرہ بن جاتا ہے۔'' کہنے لگے، ''آپ کو برا تو لگے گا مگر سچ یہ ہے کہ وہی پاکستانی اور پاکستان کی پہچان ہے اور وہ خود کو پاکستانی سمجھتا ہے۔'' میں جو ذرا یا کافی جذباتی واقع ہوئی ہوں اس بات سے چڑ گئی اور غصّے سے بولی، ''اور وہ کروڑوں ہاری، مزدور اور خدمت گار جو آپ کے، میرے اور اس وڈیرے کے پاؤں دباتے ہیں۔ وہ چھ سے بارہ سال کی بچیاں جو میرے سیلون میں بیگمات کے ساتھ آتی ہیں اور چھ سات گھنٹے تک ان بیگمات کے بچوں کو اٹھائے کھڑی رہتی ہیں، میرے کہنے کے باوجود وہ کسی اسٹول پر بھی نہیں بیٹھتیں اور ایک آواز پر سیڑھیوں سے اوپر اور نیچے جاتی ہیں، وہ ملازم کہ جب جی چاہے اس کی بے عزتی کردی جاتی ہے بلکہ مارا پیٹا بھی جاتا ہے اور پھر وہ پلٹ کر اسی مالک کے تلوے چاٹتا ہے۔'' اقبال جعفر کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے ایک کرب کی لہر آئی اور پھر اس کی جگہ اسی مانوس سی مسکراہٹ نے لے لی۔ اقبال جعفر کہ ایک بیوروکریٹ بھی رہے ہیں، وہ یہ تمام تماشا بہت نزدیک سے دیکھ چکے ہیں۔ کہنے لگے، ''پاکستان کی یہ دوسری جماعت ہے جو پاکستان کی شناخت ہے۔ اگرچہ یہ ظلم کا شکار ہیں مگر ان کی سوچ آزاد ہے کیوں کہ انھیں کسی پروگرام کے تحت روبوٹ میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ ان کی مجبوریاں ضرور ہیں جس کے تحت انھیں ووٹ بھی دینا پڑتا ہے اور غلامی بھی کرنی پڑتی ہے، مگر وہ اپنی اس شناخت کو مانتے ہیں۔ یہ وہ لوگ

ہیں جو اپنی شناخت کی نفی نہیں کرتے۔"

"کیا آپ کے خیال میں کبھی کوئی انقلاب آئے گا جو انھیں اس عذاب سے نجات دلائے گا؟" کہنے لگے، "نہیں شاید کبھی نہیں کم ازکم ہم اس انقلاب کو نہیں دیکھ پائیں گے، ویسے بھی اس زمین پر پچھلے پانچ ہزار سال سے کوئی انقلاب نہیں آیا۔"

ان کی اس بات پر مجھے اپنے سیلون کے باہر بیٹھا ہوا گارڈ یاد آجاتا ہے۔ چلچلاتی دوپہر میں وہ لاغر سا گارڈ نیلی یونی فارم میں میرے سیلون کا پہرا دیتا ہے۔ وہ لنچ کے لیے بھی کہیں نہیں جاتا۔ وہ نیلی وردی میں ملبوس محض ایک سمبل ہے۔ کیا وہ کسی بھی آفت کا مقابلہ کرنے کی قوت رکھتا ہے؟ وہ جو ہمارا شکر گزار ہے کہ ہم دن میں دو مرتبہ اس کو چائے دیتے ہیں۔ تین چار ہزار تنخواہ پانے والے ایسے گارڈ آپ کو کراچی میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ یہ لاغر، کم زور اور غریب گارڈ جو کروڑوں کی پراپرٹی کی حفاظت کے لیے بٹھائے گئے ہیں۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ میرے سیلون کے باہر بیٹھا گارڈ اس لیے کھانا کھانے نہیں جاتا کہ وہ کسی ڈائٹ کو فولو کر رہا ہے۔ نہ نہ، نہ۔ وہ تو ان دو کیلوں کو بھی شام کو گھر لے جانے کے لیے ایک جگہ ٹانگ دیتا ہے جو ہم ترس کھا کر خود کو اپنی نظروں میں اونچا دیکھنے کے لیے اس کو دیتے ہیں۔ وہ اس لمحے کا منتظر رہتا ہے کہ شام کو وہ ان دو کیلوں کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوگا تو اس کے بچے باپ سے زیادہ ان دو کیلوں کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور باپ کی وقعت ان کی نظروں میں بڑھ جائے گی۔ کیا یہ گارڈ میری زمین کی پہچان ہے؟

اور پھر جب میں اپنے سیلون کے اندر نظر ڈالتی ہوں تو وہاں ایک الگ طبقہ ہے لیکن بہرحال وہ بھی ایک حقیقت ہے اور وہ بھی اسی زمین سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک اسکول کی پرنسپل جن کا کہنا ہے کہ پہلے جو اسکول بہت اچھے تھے ان کا اسٹینڈرڈ اب گر چکا ہے کہ وہاں اب دودھ والوں اور دُکان داروں کے بچے پڑھنے لگے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ انھیں عام لوگوں کے پڑھنے پر اعتراض تھا یا اسکول کے اسٹینڈرڈ کے گرنے پر۔ میں نے ان سے پوچھا بھی "آپ کو کیا عام لوگوں کے پڑھنے پر اعتراض ہے؟ کیا ان کا حق نہیں کہ اگر

وہ اسکول کی فیس دے سکتے ہیں تو وہ بھی میرے اور آپ کے بچے کے ساتھ ان کی صف میں بیٹھیں؟" کہنے لگیں، "مگر یہ سب نو دولتیے ہیں۔ جب نئی نئی دولت آتی ہے تو اپنے ساتھ وہ قدریں نہیں لاتی جو آپ کی رگوں میں دوڑ رہی ہوتی ہیں۔ آج کل جو معاشرے کا حال ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسے ہی طبقے کے بچے سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہیں، شرابیں پینے لگتے ہیں اور پھر بندوق کا تو کہنا ہی کیا۔" گویا ان کے کہنے کے مطابق وہ بچے جو امریکن اسکول، گرامر اسکول، اور ایچی سن جیسے اسکولوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ شراب اور بندوق سے واقف نہیں۔ ڈیفنس کے وہ عالی شان گھر جہاں ایک سے ایک مہنگی شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے وہ سب کیا صرف ان نو دولتیوں کے گھر ہوتے ہیں؟

زندگی کی طرف ایک اور رویہ بھی ہے ان لوگوں کا جو ملک کی خدمت کے لیے، معاشرے کو سدھارنے کے لیے شہر کے غریب علاقوں میں اسکول کھولتے ہیں اور پھر حقارت سے کہتے ہیں Childern of this area are impossible۔ ان کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے بے چارے ایسے ایسے گھروں سے آتے ہیں، اب ہم ان سے کیا توقع کریں۔ یہ ایک ایسے اسکول کی بات ہے جہاں پر کو—ایجوکیشن ہے وہ اس علاقے کے لوگوں کی روشن دماغی کی داد نہیں دیتیں کہ وہ پُرانے خیالات کے باوجود اپنی بچیوں کو اس اسکول میں بھیجتے ہیں جب کہ ڈیفنس میں رہنے والے لوگوں کی ہپوکریسی کا یہ عالم ہے کہ وہ ڈیفنس کا اسکول جہاں اسّی کی دہائی میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے اب وہ محض ایک گرلز اسکول ہے۔ میں نے ان صاحبہ کے بارے میں سوچا کہ لوگ نیکی کرتے بھی ہیں اور اپنی رعونت سے اس نیکی کو خاک میں بھی ملاتے ہیں۔

◇

میری اس کتاب کا موضوع ایک ایسا موضوع ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس میں کوئی جدت نہیں۔ لوگ صدیوں سے ہجرت کرتے چلے آرہے ہیں۔ ضرورتیں اور دنیا پر قبضہ کرنے کی خواہش ہمیشہ سے قوموں میں رہی ہے۔ وقت کے ساتھ اس نے

مختلف صورتیں اور طریقے اختیار کیے اور مستقبل میں مزید شکلیں اختیار کرے گا۔ شاید میری یہ کتاب ایک ایسی کتاب ہے جس کا کوئی اختتام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو تاریخ ہے جو اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ دنیا قائم ہے۔ میری یہ کتاب ایک طرح کی ڈائری ہے، مختلف موڈز میں، میں نے مختلف کیفیات کو قلم بند کیا ہے۔ اس کے لکھنے کے دوران اداس بھی ہوئی اور خوش بھی، بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ جذبات میں موضوع سے نکل گئی۔ لیکن بہرحال ایک تجربہ ہے، ایک تحریر ہے جو آپ کو کچھ سوچنے پر مجبور ضرور کرے گی۔ کتاب کیا ہے ایک ڈائری ہے اور جن لوگوں نے میری بقیہ کتابیں پڑھی ہیں وہ اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے کہ بقیہ کتابوں کی طرح اس میں بھی ایک سفرنامے کی جھلک ہے۔

اس کتاب کا یہ حصّہ بھی ایک کیفیت ہے جو کراچی میں دسمبر کے مہینے میں ایک ہستی سے ملنے کے بعد طاری ہوئی۔ اور اس کیفیت کی وجہ ایئر کموڈور احمد کا ایک جملہ تھا کہ اتنا بہترین موسم، یہ دھوپ، یہ روشن صبح، یہ ہریالی، یہ سب کچھ کتنا پرفیکٹ ہے جو ہمیں ملا ہے، کیا ہم اس سب کے لائق ہیں۔ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ قدرت نے کیا کیا خوشیاں ہماری جھولی میں ڈال دیں؟ نہ ہم مڈل ایسٹ کی طرح ریگستان میں تپتے ہیں، نہ لندن، کینیڈا اور بیش تر جگہوں کی طرح سردیوں کے بے رنگ اندھیروں میں ڈوبتے ہیں، نہ برف میں مائنس فورٹی میں ٹھٹھرتے ہیں۔ کیا ہم نے کبھی اپنی اس زمین کی قدر کی ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بات کی ایک لسٹ بنائی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کن کن نعمتوں سے نوازا ہے! ہم اس کی قدر نہیں کرتے تو شکر کیا کریں گے؟ ہم کہ پوری دنیا میں ہماری وجۂ شہرت خودکش حملے ہیں۔ کیا اس خودکش حملہ کرنے والے کو کبھی یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سورۃ النساء میں کہا گیا ہے کہ اگر تمھارے ہاتھ سے انجانے میں ایک مسلمان مرا تو تم زندگی بھر دوزخ کی آگ میں جلو گے۔ قرآن کی تعلیمات وہ راستہ ہے کہ جس کے ذریعے ہم لوگوں کے دلوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہم ہر دروازے پر اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو لکھ کر لگا دیں۔

میں نے ایئر کموڈور احمد کا نام سنا تھا کہ وہ ہیں جنھوں نے ڈیفنس سوسائٹی کی بنیاد

رکھی تھی۔ ان کی عمر کا اندازہ میں اس طرح کر سکتی ہوں کہ وہ میرے شوہر کے استاد رہے ہیں۔ ان سے یہ پہلی ملاقات تھی جو ان سے ایک برنچ کے موقعے پر ہوئی۔ میں نے کہ اپنی کافی زندگی ایئرفورس کے ماحول میں گزاری ہے کہ بھائی اور شوہر دونوں کا تعلق ایئرفورس سے تھا اور پھر ایئرفورس والوں کی ایک خاص شکل جو مختلف ایئرفورس والوں سے ملنے کے بعد میرے ذہن میں ہے۔ تھوڑی سی مصنوعیت لیے، تھوڑا سا پلاسٹک ماحول۔ بے بات کا ہنسنا۔ ہر عورت بھابی اور ہر مرد بھائی۔ مگر ایئر کموڈور احمد اس تصویر سے کہیں مختلف تھے۔ اردو انگریزی کے علاوہ فارسی اور عربی پر بھی عبور ہے۔ اتنا مکمل عبور کہ بار بار قرآنی آیات کا استعمال اپنی گفتگو کے درمیان کرتے ہیں۔ فارسی کے اشعار پڑھتے ہیں اور مختلف فلاسفرز کے اقوال کا حوالہ دیتے ہیں۔ احمد جو اس وقت اسّی کی دہائی میں ہیں۔ ان کے ایک شعر نے مجھے ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ شعر جس سے مجھے ایسا لگا کہ میں کسی پرانے علی گڑھ کے پڑھے ہوئے شخص سے گفتگو کر رہی ہوں۔ انھوں نے اپنی گفتگو کا آغاز ذوقؔ کے ایک شعر سے کیا۔ میں جو ذوقؔ کے مداحوں میں سے نہیں ہوں۔ میں کہ میرا تعلق غالبؔ کی لابی سے ہے اور اس بارے میں کافی تعصّب بھی رکھتی ہوں، مگر کیا شعر تھا کہ زندگی کی ایک تصویر کھنچ گئی:

ذوقؔ اس بحرِ فنا میں کشتیِ عمرِ رواں
جس جگہ پہ جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

میں نے ان سے پوچھا، ''کیا وجہ ہے کہ آپ کی نسل کے بعد جو نسل پاکستان میں پیدا ہوئی ان میں لوگ انگریزی جانتے ہیں یا اردو؟ ایسا لگتا ہے پڑھا لکھا طبقہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔'' اس کا جواب پھر شعر میں ملا:

بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہار ہوئی

احمد صاحب ہر سال گرمی کے آٹھ مہینے لندن میں گزارتے ہیں اور تین چار مہینے کراچی میں۔ ان کے خیال میں پاکستان کی زمین سے خوب صورت کوئی زمین نہیں۔ کہنے

لگے، ''یہ جنت ہے، مگر ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم دربدر ہوگئے ہیں۔'' مجھے سوات کی وہ لڑکی یاد آگئی جو مجھے کینیڈا میں ملی۔ اس کے ہرطرف ویل مینیکیورڈ باغ تھے۔ سبز گھاس تھی اور وہ کہہ رہی تھی ''یہاں کی گھاس کا رنگ سوات کی گھاس کی طرح خوب صورت نہیں ہے۔''

مذہب میں ان کا جتنا یقین ہے میرے لیے وہ قابلِ قبول نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''سبوحہ خان بہت باغی خیالات کی مالک ہیں۔'' انھیں میری یہ بات قطعاً اچھی نہیں لگی جب میں نے کہا ''بے چارہ غریب یہاں بھی مشکل میں ہے اور وہاں کیا ہوگا کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ امیر آدمی ایک کے بعد ایک حج کرتا چلا جاتا ہے اس کا اعمال نامہ تو اتنا سنہری ہوگا کہ اس کے بہت سے گناہ دھونے پڑ جائیں گے۔ بے چارے غریب کو تو غمِ دوراں نے فرصت ہی نہیں دی ہوگی کہ وہ کچھ کرسکے۔'' غصّے سے بولے، ''تم غیب کا علم نہیں جانتیں اس لیے تم اس قسم کی بحث میں مت پڑو۔'' مگر اس بات پر ان کا بھی یقین ہے کہ کسی غریب سے برا سلوک کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ غربت تو خود ایک بہت بڑا عذاب ہے جو دو چیزوں کو جنم دیتا ہے ایک جہالت اور دوسرا بیماری۔ اور یہی شاخسانے ہیں کسی بھی شخص یا قوم کے زوال کے۔

میں نے ان کے اس تجزیے کا سوال پلٹ کر ان سے کیا، ''کیا آپ کے خیال سے اس جہالت اور زوال کی کچھ ذمّے داری آپ پر اور مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے؟''

''مجھ پر کیوں؟''

''کیوں کہ آپ نے اس ملک میں بہت ذمّے دار عہدوں پر اپنی زندگی گزاری ہے۔'' میں نے پوچھا، ''کیا آپ نے اس ملک کا قرضہ چکادیا؟— آج جب کہ ہم سب یہ بات کرتے ہیں کہ ملک کا سنورنا مشکل ہے تو ہمارے اور آپ کے بچے ملک سے باہر ہیں اور ہم خود بھی اس ڈوبتے ہوئے جہاز کو بچانے کے بجائے پوری تیاری رکھتے ہیں کہ عالمِ نزع میں اس ملک سے بھاگ لیں۔ کیا ہم ان سیاست دانوں سے کم ہیں جو اپنی حکومت ختم ہوتے ہی باہر کی راہ لیتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ کب دوبارہ اس وقت ملک میں آئیں جب وہ وی آئی پی کی طرح اس ملک میں زندگی گزار سکیں۔'' کہنے لگے،

''دیکھیے میں نے اپنے وقت میں وہ سب کچھ کیا جو میں کرسکتا تھا اور جہاں تک بچوں کا تعلق ہے، میرے ایک بیٹے نے پوری کوشش کی کہ یہاں آکر رہے مگر یہاں کی بے ایمانیاں اور سسٹم دیکھ کر اس سب میں ایڈجسٹ نہیں کرسکا۔''

''مگر آپ اس سسٹم کو الزام نہیں دے سکتے کیوں کہ اس سسٹم کو پروموٹ کرنے میں ہمارا بھی ہاتھ ہے کہ اس سسٹم سے زندگی ہماری بھی آسان ہوجاتی ہے۔'' نزدیک ہی ایئرمارشل داؤد پوتا بھی کھڑے تھے وہ بھی ہماری گفتگو میں شامل ہوگئے۔ کہنے لگے، ''آپ لوگ کیا بات کررہے ہیں؟'' میں نے کہا، ''ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ آج ہو رہا ہے کیا اس سب میں کچھ ہمارا بھی ہاتھ ہے؟'' کہنے لگے میرا اس پاکستان سے کچھ تعلق نہیں۔ میں نے اپنا کام کرلیا۔ میں اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں۔'' میں نے کہا، ''آپ تو پاکستان سے لاتعلق ہو ہی نہیں سکتے۔ کیوں کہ آپ تو اوپر سے نیچے تک پاکستان ہیں آپ کی پیشانی پر تو بڑا بڑا پی اے ایف اور پی آئی اے لکھا ہے۔ آپ ہزار کہیں کہ آپ کا آج کے پاکستان سے کوئی تعلق نہیں مگر ہم اس کو تسلیم نہیں کرسکتے اور آپ جیسے لوگوں کو تو اصولاً چین کی نیند آنی ہی نہیں چاہیے۔ اگر ہم نے اپنے زمانے میں کام کیا اور تنخواہ بھی لی تو کیا اس عمارت کی کھوکھلی جڑوں کے ہم ذمّے دار نہیں۔ یہ کہنا کہ آج سے بیس سال پہلے کا پاکستان بالکل صاف ستھرا تھا غلط ہے۔ اس لاقانونیت کی داغ بیل ڈالنے والے تو ہم بھی ہیں۔'' اس کے جواب میں وہ ناراض بھی ہوئے اور بہت سے بڑے بڑے لوگوں کے قصے بھی سنائے کہ کس طرح اس زمانے میں لوگ اپنی سفارشیں بھیجتے تھے، ان ناموں میں بڑی بڑی ہستیوں کے نام تھے۔ لیکن اگر ہم سب نے اپنی نوکریاں بچانے کے لیے ان تمام سفارشات پر عمل کیا تو کم ازکم اتنا تو مانیں کہ ہم بھی اس کرپشن کا ایک حصّہ ہیں۔ اگرچہ ماننے سے اب پاکستان کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر پھر بھی:

بہ فیضِ مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں
کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

کہتے ہیں کہ یہ قوموں کی بدقسمتی ہوتی ہے کہ ان کے سر پر وہ حکمران آجائیں جو

کبھی چور اور ڈاکو گردانے جاتے تھے۔ سورۃ العصر یاد آتی ہے کہ:

''قسم ہے زمانے کی کہ تم خسارے میں ہو۔''

ہم آج خسارے سے گزر رہے ہیں مگر آج بھی اگر اچھائی پر اپنا یقین رکھیں تو شاید ہم اس دَلدل سے نکل سکیں مگر... مگر... مگر!

اسی جگہ پر ارجمند بھی موجود تھیں وہ ارجمند جو پچھلے چالیس سال سے کینیڈا میں رہتی ہیں کہ وہ شادی ہو کر وہاں گئی تھیں۔ ہر سال پاکستان آتی ہیں اور اب بھی خود کو پاکستانی محسوس کرتی ہیں۔ ان کے خیال سے پاکستان میں ایک طرف غربت ہے تو دوسری طرف امارت کی بھی کمی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈیفنس کے اکثر گھروں میں سوئمنگ پول ہونا تو کوئی خاص بات نہیں ہے مگر اس بار وہ اس قدر حیران ہوئیں جب انھوں نے ایک گھر میں ایکویریم دیکھا۔ ایک ایسا ایکویریم جو انھوں نے سول میں دیکھا ہے۔ ایک بہت بڑا سا گزیبو جس کا فرش گلاس کا ہے اور اس کے نیچے پانی میں تیرتی ہوئی رنگین مچھلیاں، اور پوری ایک دیوار جس میں مختلف سائز کی مچھلیاں مقید ہیں۔ میں کہ ایک معمولی انسان ہوں اور ایسی جگہوں پر مجھ جیسے لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ میرے لیے یہ ایک خبر تھی اور مجھے اپنے کم حیثیت ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ اس کم حیثیت ہونے پر مجھے فخر ہے کہ مجھ پر بھی گو الزام تو ہے کہ میں نے اپنا قرض نہیں چکایا مگر اس جرم پر کم از کم مجھے سزائے موت کی سزا نہیں ملے گی اور میں نسبتاً بہتر نیند سوؤں گی۔ کہاں ایک کلو چینی میسّر نہ ہونا اور کہاں اس ایکویریم کی مینٹیننس پر ہر روز سینکڑوں کلو چینی کا نچھاور ہو جانا۔ اگر لوگ صرف اپنی زکوٰۃ ہی نکال دیا کریں یا تھوڑا بہت ٹیکس ہی دے دیا کریں تو پاکستان کے نہ جانے کتنے لوگوں کا بھلا ہو جائے۔

الحمرا کی ایک صبح

میں پچھلے چھ دن سے اسپین میں ہوں۔ اسپین مسلمانوں کا چمکتا دمکتا ماضی— جب مسلمانوں کی جھولی میں صرف کامیابیاں ہی کامیابیاں تھیں۔ چار دن ہم قرطبہ میں رہے بالکل مسجدِ قرطبہ کے پہلو میں۔ ہوٹل کے داخلی دروازے کے سامنے مسجد کا ایک دروازہ ہے۔ ہم جس حصّے میں ہیں وہ یہودیوں کے کوارٹرز کہلاتے ہیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولتی ہوں تو قرطبہ کی ایک دیوار ہے اور اس کی اَن گِنت چھوٹی بڑی محرابیں ہیں۔ یہاں ہم نے کیا کیا؟ کیا دیکھا؟ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ یہاں صرف اپنی اس کیفیت کا ذکر کروں گی جو ان چند دنوں میں مجھ پر طاری رہی۔ اس کے باوجود کہ نیند بہت اچھی آتی تھی مگر طبیعت میں کچھ بے چینی سی تھی۔ اچانک رات کو دو بجے آنکھ کُھل جاتی اور ہم رات کے دو بجے قرطبہ کی تنگ گلیوں میں گھومنے نکل جاتے۔ دن ہو یا رات، ہر وقت ان گلیوں میں لوگ گھومتے نظر آتے۔ لگتا تھا کہ ہر وقت اس مسجد کا طواف ہوتا رہتا ہے، اگرچہ طواف کرنے والے لوگ مسلمان نہیں تھے۔ رات کے گیارہ سے ایک بجے تک سب گلیاں بڑے بڑے پائپس سے دھوئی جاتی ہیں۔ کوئی کونہ ایسا نہیں جو اندھیرا ہو، نتیجہ یہ ہے کہ آپ بغیر کسی خوف کے گھوم سکتے ہیں، خاص طور پر پاکستان سے جانے والے کے لیے تو یہ سب بہت ہی اجنبی تھا۔ یقیناً مسجد کی عمارت کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ میں اس

کے بارے میں کیا کہوں گی کہ علامہ اقبال اس سے مرعوب ہوکر بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ مگر اس کی شان علامہ کی اس نظم سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔

کہتے ہیں عیسائی حکومت نے اس مسجد کو مٹانے کی بہت کوشش کی مگر بعض چیزیں مٹنے کے لیے نہیں بنتیں۔ میں جب پہلی مرتبہ اس مسجد میں داخل ہوئی تو اس طرح کہ ننگے پیر تھی اور یہ سب کچھ بالکل نادانستہ طور پر ہوا۔ ٹکٹ خریدنے کے بعد جیسے ہی ہم اندر ہال میں داخل ہوئے تو میں نے سوچا کیوں نہ جوتے اتار دیے جائیں کہ صبح سے پیدل چل چل کر میرے پاؤں سے خون نکل رہا تھا۔ چنانچہ میں نے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لیے۔ کیا خبر تھی کہ میں مسجدِ قرطبہ میں اس طرح داخل ہوں گی کہ میرے پیر ننگے ہوں گے۔ مسجدِ قرطبہ کے فرش پر پہلا قدم تھا کہ اس کی خنکی میرے تلووں سے ہوتی ہوئی دماغ تک پہنچی اور ایسا لگا جیسے میں ایک نشے سے سرشار ہوگئی۔ میں جو مذہبی یا متعصب ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ ہلکے اندھیرے میں ہر طرف ستون ہی ستون تھے اور محرابیں ہی محرابیں تھیں۔ ہر رنگ ہر مٹی، ہر کیفیت کے ستون کالے، براؤن، لال اور پیلی مٹی کے ستون۔ سرخ اور سفید محرابیں عبد الرحمٰن اوّل کی یاد دلاتی تھیں جس نے چوبیس سال کی عمر میں اسپین فتح کیا، قرطبہ کی اس زمین کو بہت مہنگے داموں خریدا اور پھر اس چرچ پر مسجد تعمیر کی۔ یہ کام دو صدیوں تک جاری رہا مگر اس پر سب سے زیادہ کام اس کے پوتے عبدالرحمٰن سوئم نے کروایا۔ آج میں جس جگہ کھڑی تھی وہاں فرش پر ہر طرف عیسائیت کے نقش و نگار تھے۔ ہر طرف مسلمانوں کے بنائے ہوئے ستون تھے جن پر آیات درج تھیں۔ ان ستونوں کے ساتھ ساتھ عیسیٰ علیہ السلام اور مریم کی کہانی بھی چل رہی ہے۔ جگہ جگہ صلیب ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اور مریم ہیں۔ ان ستونوں کے بغیر عیسیٰ علیہ السلام اور مریم کچھ نہیں۔ دونوں مذہب سر جوڑے کھڑے ہیں۔ کبھی یہ عیسیٰ علیہ السلام اور مریم کا گھر تھا، آج اسلامی ستونوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور مریم کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے اور میں نے سوچا میں کہاں جاؤں کہ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مسجد کو توڑا گیا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے آج بھی شوکیسوں میں سجے ہیں۔ اسی زمانے کے ایک کرسچین شاہِ وقت نے اس کے توڑنے پر

ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس نے کہا، ''تم اس کو توڑ تو سکتے ہو مگر ایسی چیز دوبارہ بنانا ناممکن ہے۔ یہ کسی ایسے عاشق کے نشان ہیں جنھیں مٹانا ایک ناقابلِ معافی گناہ ہوگا۔'' کیا ایسے روادار بادشاہ بھی گزرے ہیں جو توڑ پھوڑ میں یقین نہیں رکھتے اور اپنے نشان کے ساتھ دوسروں کے نقوش کا بھی احترام کرتے ہیں۔ پھر بھی میں نے سوچا، کیا پہچان ہے اس جگہ کی؟ کیا اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ ایک مسجد ہے؟ یا یہ کیتھڈرل ہے؟ یا... یا... یا مگر شاید اس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ یہ اسپین کی زمین پر ہے— زمین جو ماں ہے۔ کسی کے باپ ہونے پر تو آپ شک کر سکتے ہیں مگر کسی کا ماں ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس پر آپ شک نہیں کر سکتے۔ Paternity is an opinion ,maternity is a matter of fact. یہ قرطبہ ہے جہاں ہر سال لاکھوں لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ وہ سب اسپین آتے ہیں۔ مسلمان اسے مسجد کی نظر سے دیکھتے ہیں اور عیسائی اسے اپنی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک ورلڈ جیوگرافک گائیڈ کے مطابق کیتھڈرل موسک اسپین کی ایک اہم شناخت ہے۔ -Important symbol of spanish Identity.

یہ مسجد دنیا کی تیسری بڑی مسجد ہے۔ دسویں صدی میں قرطبہ دنیا کا سب سے بڑا روحانی اور سائنسی مرکز تھا۔ کسی زمانے میں یہاں تین سو مساجد تھیں مگر آج اس مسجد کے سوا کوئی مسجد نہیں ہے۔

چار دن قرطبہ میں رہ کر ہم الحمرا کی طرف رواں تھے۔ ایک اداسی، ایک تشنگی تھی۔ میں بس سے باہر دیکھ رہی تھی، جہاں بل کھاتی سڑک کے دونوں طرف زیتون اور مالٹوں کے پستہ قامت درخت تھے اور ساتھ ہی آسمان کو چھوتے کھجور کے درخت، اور پھر رنگارنگ بوگن ولا فضا میں آگ لگاتا تھا۔ نہ جانے ان درختوں میں سے کس کس کا تعلق مدینے کی زمین سے تھا۔ نہ جانے کون سا درخت وہ درخت تھا جسے عبدالرحمٰن اوّل نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ وہ کہ اس زمین کا فاتح تھا مگر پھر اپنی مٹی کو یاد کرتا تھا، اس زمین سے اپنا تعلق برقرار رکھنا چاہتا تھا، اپنے اس تعلق کو محسوس کرتا تھا اور کہتا تھا:

پردیس میں ناصبور ہوں میں
پردیس میں ناصبور ہے تو

الحمرا میں ہمارا ہوٹل کیا تھا یوں سمجھیے کہ آثارِ قدیمہ کی مثال تھا۔ یہ جگہ کسی زمانے میں مسلم کوارٹرز کہلاتی تھی۔ بیرونی دروازہ اتنا اونچا تھا کہ اس سے ہاتھی گزر سکتا تھا۔ صحن کا فرش کالا تھا جو ناہموار پتھروں سے بنا تھا۔ ایک کونے میں پانی کے گرنے کی آواز تھی، مسلسل پانی گرنے کی آواز جو کانوں کو بھلی لگتی تھی۔ اگر ذرا سا غور سے سنا جائے تو آپ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن سکتے تھے۔ یہ گھوڑے سے کون اُترا؟ شاید یہ اس گھر کا مالک ہے، نیلی آنکھیں ہیں، صاف رنگت ہے اور سر پر عربوں کا اسکارف بندھا ہے۔ صحن میں چار درخت ہیں، انگور کی بیلوں سے سب دیواریں ڈھکی ہیں۔ ہر چیز صاف شفاف اور صاف ستھری ہے صحن کی دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ صحن میں ہلکا سا اندھیرا ہے مگر نظر اٹھا کر اوپر دیکھیں تو دیواروں پر سورج کی روشنی ہے۔ چاروں طرف نیچی چھت کا برآمدہ ہے، تنگ سیڑھیاں ہیں جو آپ کو اوپر لے جاتی ہیں جہاں کالی نقشین چھتوں والے چھوٹے کمرے ہیں، کبھی ان کمروں میں شمعیں روشن ہوتی ہوں گی آج تو یہاں بجلی کے شینڈلیئر ہیں۔

یہ غرناطہ ہے ایک بہت پرانا شہر۔ غرناطہ جہاں کا شاعر کہتا ہے کہ It is sad if you are blind in Gharnata. جب میں نے الحمرا دیکھتے ہوئے کومنٹری کے دوران اس کا یہ جملہ سنا تو میں نے اس پر کوئی خاص غور نہیں کیا مگر نہ جانے کیوں میرے ذہن کے کسی حصے میں یہ جملہ چپک کر رہ گیا۔ پورا دن گزرا، رات آئی اور پھر پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ ایک بے چینی، ایک گھبراہٹ۔ میں نے کل پورا دن الحمرا کی سیر کی تھی مگر کیا میں نے اسے دیکھا تھا—— جسے دیکھنا کہا جاتا ہے؟ کیا میں پچھلے پانچ دن سے نابینا تھی؟ شاعر نے کہا تھا، غرناطہ میں اتنا کچھ دیکھنے کو ہے کہ وہ شخص بہت بدقسمت ہے جو غرناطہ میں پیدا ہو اور نابینا ہو۔ نابینا ہونے کی بھی قسمیں ہیں، بعض مرتبہ آپ بینا ہو کر بھی کچھ نہیں دیکھ پاتے۔ میں کہ پچھلے دو دن سے غرناطہ میں ہوں، اس شہر کو محسوس نہیں کر پائی تھی۔ یہ شہر جو آج ہزار سال بعد بھی زندہ ہے، اس کو میں آج محسوس کر سکتی ہوں۔ اس کے

در و دیوار کو، اس کے سجانے والے ہاتھوں کو یہاں کے جدید مالز، جدید نظارے سب پس منظر میں چلے گئے۔ اس جوان شہر میں، میں آج خود کو بوڑھا محسوس کر رہی تھی، میرے ہاتھوں کی رگیں کچھ اور ابھر آئی تھیں، میں دیکھ سکتی تھی کہ ان مسلم کوارٹرز کی محرابوں کی پیشانی سے کھرچ کھرچ کر اسلام کا ہر نشان مٹایا گیا اور وہاں اپنا نام سجایا گیا، مگر شاید اسی کا نام تاریخ ہے، اسی کا نام زمانہ ہے اور اسی کا نام ردّ و بدل ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ جو قومیں تاریخ کے جن ادوار میں جوش و جذبے سے کام کرتی ہیں وقت ان کو اس زمانے کا بادشاہ بنا دیتا ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات۔ لیکن اگر آپ میں کوئی نقش چھوڑنے کی قوت ہی نہیں ہے، کوئی جذبہ ہی نہیں ہے تو گزرتا ہوا وقت آپ کو بے نام و نشان چھوڑ جاتا ہے۔

جس طرح انسان کی شخصیت ہوتی ہے اسی طرح شہروں کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے۔ بعض شہر ایسے ہوتے ہیں کہ آپ انھیں دیکھتے ہی متاثر ہو جاتے ہیں اور واہ وا کہہ کر ان کی گہما گہمی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد آپ کو لگتا ہے کہ یہ تو بہت عام سا شہر ہے، کسی بھی دوسرے شہر کی طرح۔ جب کہ بعض شہر آپ سے بے اعتنائی برتتے ہیں، ان میں ایک اجنبیت ہوتی ہے، لیکن جب وہ آہستہ آہستہ آپ پر اپنی تہیں کھولتے ہیں تو آپ ان کے سحر میں گرفتار ہونے لگتے ہیں۔ آپ ان کے بارے میں مزید جاننا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی پراسراریت سے ڈرتے بھی ہیں اور ان کے نزدیک بھی ہونا چاہتے ہیں۔ قطرہ قطرہ وہ جگہ آپ میں سرایت کرنے لگتی ہے۔ آپ نابینا نہیں رہتے، آپ نابینا نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ اس قطرہ قطرہ گرتی شبنم کو اپنے اندر سمو نہیں سکتے تو آپ ایک پتھر کی مانند ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ قرطبہ کو دیکھ کر رو سکتے ہیں، نہ جانے کیوں میرے لیے الحمرا وہ جگہ تھی کہ میری آنکھ کے آنسو میرے دل کو چھو کر بہتے تھے۔ قرطبہ مکہ کی طرح تھا تو الحمرا مدینہ۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے شاید میں قرطبہ اور الحمرا کا اسی طرح موازنہ نہ کر سکتی ہوں۔

الحمرا کی صورت میں ہر وہ ہاتھ زندہ ہے جس نے ان محرابوں کی تخلیق کی جن کو دیکھ

کر لگتا ہے بھربھری برف کا نرم ٹکڑا آپ کے ہاتھوں پر گرا ہی چاہتا ہے مگر نہ جانے اس پر کیا گزری کہ تحیر کے عالم میں وہ صدیوں سے اسی جگہ ساکن ہے۔ جگہ جگہ نقش ہے کہ بس اللہ ہی ہر چیز پر غالب ہے۔ شاید یہی یقین ان مسلمانوں کے ایمان کو مضبوط کرتا تھا۔ میلوں تک پتھر میں نقش لا الہ الا اللہ — محمد ﷺ کے پیغام کو صدیوں تک پہنچائے جاتا ہے۔ فون گائیڈ سے بار بار آواز آتی ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کو سکھایا کہ صفائی کیا ہے، وہ مسلمانوں کی فراست، لیاقت، اور روحانیت کے گن گاتا ہے۔ ان کے واٹر وہیل کی بات کرتا ہے۔ کھانے پینے کے آداب، اور ریشم اور کاغذ سے روشناس کرنے کی بات کرتا ہے۔ ان کے عالی شان باغات کی بات کرتا ہے۔ اگرچہ کومینٹیٹر متعصّب ہے مگر جب وہ تاریخ کے اوراق الٹتا ہے تو مجبور ہے کہ اُسے حقیقت سے پردہ اٹھانا پڑتا ہے۔

غرناطہ وہ جگہ نہیں کہ ایک رات ٹھہر کر اس کو اپنے اندر جذب کر لیا جائے، اس کے ہر حصّے کو دیکھنے اور پھر بینا ہو کر دیکھنے کے لیے وقت چاہیے۔ نہ یہ جگہ لمحوں میں بنی تھی اور نہ لمحوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اگر آپ چند گھنٹے یہاں رہتے ہیں تو آپ نابینا آتے ہیں اور نابینا لوٹ جاتے ہیں۔ دنیا آپ کے لیے محض بازیچۂ اطفال رہ جاتی ہے۔ الحمرا کو دیکھ کر، اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا کو دیکھ کر، اس کو مٹانے کی کوششوں کے باوجود اس کا نہ مٹنا دیکھ کر آپ کے جسم کا ہر حصّہ آنکھ بن جاتا ہے۔ ایک ایسی آنکھ جو پُرآب ہے اور حیران ہے۔ صبح کی روشنی کھڑکی سے چھن چھن کر آتی ہے مگر اذان کی آواز نہیں آتی۔ پو پھٹتی ہے، آپ یادوں کی گلیوں سے گزرتے ہیں تو ہر طرف لباسوں کی سرسراہٹ ہے — مسلمان اگر فن کار ہو تو کیا اتنا پرکار ہو سکتا ہے کہ الحمرا بنا دے۔

الحمرا پر لگا گھنٹا جو شہر کے اکثر حصّوں سے نظر آتا ہے۔ میں نے آج دیکھا کہ وہ تو میرے کمرے سے بھی نظر آتا ہے۔ مگر پچھلے دو تین دن سے میں اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ الحمرا کا یہ گھنٹا گھر اس وقت گھنٹیوں کی آواز سے گونجتا تھا جب کوئی تہوار ہوتا تھا یا جب کسی خطرے کی اطلاع دینی ہوتی تھی۔ آج الحمرا کا گھنٹا گھر خاموش ہے مسلمان زوال کی طرف رواں ہیں مگر... شاید الحمرا کا گھنٹا خاموش نہیں ہے۔ بلکہ ہم بینائی کے ساتھ ساتھ سماعت

سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ ہم اس گھنٹا گھر کی طرف دیکھتے ہیں مگر اس کی آواز کو سن نہیں سکتے۔ It is sad to be blind and deaf in Gharnata or Alhamra. الحمرا کی گھنٹیاں ہمیں صدیوں سے خطرے کی اطلاع دے رہی ہیں نہ جانے کیوں ہم خوابِ غفلت سے نہیں جاگتے مگر جانے کیوں مجھے پھر بھی امید ہے کہ جیسے دنیا الحمرا پر لکھے لا الہ الا اللہ کو نہیں مٹا سکی اسی طرح وہ ایک بار پھر اقبال کے مردِ مومن کو پھر زندہ کرے گی اور ہم مسلمانوں کو دُنیا کے نقشے پر ابھرتے دیکھیں گے۔

عروج و زوال تو ہر قوم کا حصّہ ہے تو اس پر گھبرانا کیسا۔ مایوسی یوں بھی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔

◇

اپنی تہذیب کو بچانا ہر عہد اور ہر قوم کی خواہش رہی ہے مگر تہذیب کو بچانے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ارتقا کے عمل کو روک دیں یا آپ زمانے کے ساتھ نہ چلیں۔ ایسا نہ ہو کہ زمانہ تو قیامت کی چال چل جائے اور آپ ایک کوزے میں بند ہو کر بیٹھے رہیں۔ ہمارے مذہب تک میں اجتہاد کی اجازت ہے اور میں سمجھتی ہوں یہ اسی لیے ہے کہ زمانے کے ساتھ فکر، سوچ، ضرورتیں اور بقا کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ گزرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ آپ خود میں بھی تبدیلی لائیں۔ یقیناً یہ بدلنا شعوری نہیں لاشعوری ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک دن آپ نے سوچا کہ ہم ایک مہینے میں اپنے میں یہ تبدیلیاں لے آئیں گے۔ لیکن ہاں نہ بدلنے کی خواہش شعوری ہو سکتی ہے۔ اور اسے میں ضد یا rigidness کہوں گی۔ جو قومیں اس قسم کی بے جا ضد دکھاتی ہیں وہ ہمیشہ پیچھے رہ جاتی ہیں اور یہ پیچھے رہنا دو چار قدم نہیں بلکہ صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ آج بھی ہمارے سامنے ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں قومیں پتھر کے زمانے میں رہ رہی ہیں اور اسی میں رہنا چاہتی ہیں۔

بعض مرتبہ یہ سوچ مجھے پریشان کر دیتی ہے جب میں دیکھتی ہوں کہ ہم مغرب کے

influence سے گھبراتے ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ جدیدیت سے گھبراتے ہیں۔ جدیدیت سے گھبرانے کا نتیجہ کہیں یہ نہ ہو کہ سائنسی دور میں ہم اس طرح داخل ہوں کہ ہمیں اس میں اجنبیت کا احساس ہو۔ گلوبل ہونا کوئی بُری بات نہیں لیکن ہمارا عام شخص اس بات سے ڈرتا ہے۔ اس گلوبلائزیشن میں اسے اپنے کھو جانے کا خطرہ ہے۔ دیکھا جائے تو اس کا یہ خدشہ بے بنیاد نہیں کیوں کہ اس گلوبلائزیشن میں ہمیں انگریزی تہذیب dominate کرتی نظر آتی ہے۔ ہالی ووڈ کی فلموں کا اثر، مغربی موسیقی کا اثر۔ ایسا لگتا ہے کہ تمام انگریزی بولنے والے آگے نکل جائیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ مغرب کا اثر زیادہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک عام قہوہ خانے والا یا ایرانی چائے والا جب دیکھتا ہے کہ ہر طرف انگریزی سوچ ہے اور انگریزی گانے ہیں تو وہ اس ماحول میں خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ وہ اس تہذیب میں خود کو نہیں پاتا اور کیوں کہ وہ اس ماحول کو قبول نہیں کرتا تو وہ کہتا ہے کہ سیٹلائٹ ڈشز شیطانی عمل ہے اور یہ مغرب کی طرف سے ہمارے لیے خطرے کی آواز ہے۔

میڈیا کی طرف سے جو تشہیر ہوتی ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ لوگ ان خیالات کی طرف راغب ہوں، ان کی طرف مائل ہوں مگر ہوتا یہ ہے کہ لوگ اپنی روایات اور اقدار کو اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں، اس خیال سے کہ شاید مغرب ان کے کلچر کو، ان کی زبان کو، ان کی تہذیب کو، ان کے نشانات کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ گلوبلائزیشن کا یہ اشتہاری طریقہ دیر پا نہیں۔ یہ محض ایک عارضی پینٹ کی طرح ہے یا ایک وال پیپر کی طرح ہے جس کا رنگ کچا اور آب و تاب وقتی ہے۔ اس میں کوئی گہرائی نہیں۔ یہ مصنوعی رنگ ایک ایسے معاشرے کی افزائش کرے گا جس کی سوچیں سطحی ہوں گی۔ اِکا دُکا لوگ ہوں گے جن میں کچھ گہرائی ہوگی ورنہ ایسا معاشرہ اوچھے اور چھچھورے لوگوں کو جنم دے گا۔ ایسا معاشرہ جو محض فارمولا فلموں اور پوپ میوزک کا پرستار ہوگا۔ کلاسیکل موسیقی ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گی۔ اور یہ نسل صرف مشرق میں نہیں بلکہ مغرب میں بھی ہوگی۔ دوسری طرف نیوز میڈیا اس کی اچھی مثال ہے۔ اگرچہ آپ ریموٹ کو ہاتھ میں لیتے ہیں تو

ایک کے بعد ایک چینلز نکلتے چلے آتے ہیں مگر ہر جگہ آپ کو ایک ہی سوچ اور ایک ہی خیالات سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں اور ہوتا یہ ہے کہ میڈیا ان سوچوں کو حقیقت سے بڑا کر کے دکھاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مختلف سوچ رکھنے والے کی آواز اکثریت کی آواز میں گم ہو جاتی ہے۔ ایک عام شخص کے سوچنے کی قوت مفلوج ہو جاتی ہے اور عام شخص بھی ایک ہی سوچ کو صرف مختلف طریقوں سے پیش کرتا ہے۔ کیا اس گلوبلائزیشن کو انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو نکھارنے کا طریقہ کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم انسان کو روبوٹ میں تبدیل کر رہے ہیں؟ سچ اور جھوٹ کی تمیز کو مٹا رہے ہیں۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو لوگ اپنی انفرادیت کا زیادہ شعور پا چکے ہیں۔ لوگ اپنے حقوق پہچانتے ہیں، گو کہ اپنے فرائض نہیں پہچانتے۔ معاشرے میں اپنی جگہ چاہتے ہیں، اپنی صحت، اپنا مستقبل اپنی انفرادیت چاہتے ہیں مگر کسی قسم کی ذمّے داری نہیں لینا چاہتے۔ میڈیا، انٹرنیٹ، ٹی وی، ریڈیو، میگزینز، آج کی زندگی کی ایسی حقیقتیں ہیں جن سے ہمیں اپنا رشتہ استوار کرنا ہے۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ استعمال کرنے کی ہدایات نہیں آتیں۔ ہمیں آگے بڑھ کر ان سے کھیلنا ہے، زندگی کا سامنا کرنا ہے اور خود یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس میں سے کس پر عمل کریں، کس کو قبول کریں اور کس کو رد کر دیں۔ وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو حال سے بہترین موتی چنتی ہیں اور انھیں اپنی تہذیب کا حصّہ بناتی ہیں۔

مشرق کو اس بات کو بھی دیکھنا ہے کہ گلوبلائزیشن اور نیو ورلڈ آرڈر ہے کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا دوسرا نام امیریکا نائزیشن ہو جس کا مطلب ہے پوری دنیا کی ایک زبان، ایک اکانومی، ایک سیاسی اور سوشل سسٹم، زندگی گزارنے کا ایک ہی طریقہ، ایک ہی اقدار یعنی وہ سب کچھ جو امریکا پوری دنیا پر مسلط کر دینا چاہتا ہے اور شاید اس کے نتیجے میں ایک ایسی دنیا جنم لے گی جس میں تمام دنیا کی اقدار کلچر اور زبان کا خاتمہ ہو جائے گا اور صرف امریکا کی شناخت رہ جائے گی۔ آج ہر شخص کے ذہن میں اس چائے خانے والے کے سوالات اٹھتے ہے اور پھر ہم سوچتے ہیں کہ اس چائے خانے والے عام شخص کی سوچ غلط نہیں تھی۔

بار بار سوچتی ہوں کہ اس کتاب کو ختم کردوں کہ کسی طرح تو میری سوچ لوگوں تک پہنچ سکے مگر جیسا کے میں نے پہلے کہا کہ یہ ایسا موضوع ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ دنیا گلوبل ہوچکی ہے۔ اس موضوع پر طرح طرح کے سیمینار ہوچکے ہیں۔ ایک سوچ لمحوں میں دنیا کے ہر حصّے میں پہنچ جاتی ہے مگر سرحدیں بہرحال برقرار ہیں کہ یہ ہر قوم کے Survival کا مسئلہ ہے۔ ایک سلسلہ ہے کہ صدیوں سے چلا آرہا ہے اور وہ ہے جگہ پر قبضے کی خواہش جو فطری بلکہ جبلی ہے۔ یہ جبلت نہ صرف انسان میں ہے بلکہ جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔

آج پاکستانی شاید دنیا کے ہر حصّے میں پائے جاتے ہیں اور پاکستانی ہی کیوں؟ یہ بات کسی بھی غریب قوم کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ ضرورت آپ کو کہیں بھی لے جاسکتی ہے۔ لوگ ضرورت ہی کے تحت اپنا گاؤں چھوڑ کر شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔ کینوس کو بڑا کرلیں تو لوگ اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک کا رخ کرتے ہیں۔ یہ کہانی تو ان لوگوں کی ہے جنھیں زمین فتح کرتی ہے۔ مگر دوسری مثال ان لوگوں یا قوموں کی ہے جو زمین کو فتح کرتے ہیں۔ جیسا کہ مسلمانوں نے یا عربوں نے یورپ کو فتح کیا۔ باہر سے آنے والی قوم نے خود کو فاتح کہا جب کہ جس زمین پر آپ آئے وہاں کے لوگوں نے آپ کو قبضہ کرنے والوں کا نام دیا۔ گویا لفظوں کا الٹ پھیر ہے۔ ہم غریب قومیں تو آج صرف یہی کہہ سکتی ہیں کہ:

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم

سفرنامے عموماً پڑھنے والوں کو حیران کرتے ہیں اور بعض اوقات بیان کیے جانے والے واقعات پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر سبوحہ خان نے ''محور کی تلاش'' کے نام سے جو انوکھا سفرنامہ لکھا ہے وہ ذرا ٹھٹک کے رکنے اور کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس سفرنامے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اجنبی دیاروں میں بس جانے والے تارکینِ وطن نے بدلتی رُتوں اور نئے زمین و آسمان کے بدلتے رنگوں کا کیا اثر قبول کیا ہے۔

اپنی اس تلاش میں انھوں نے مختلف ملکوں اور قومیّتوں کے افراد کو شامل کیا ہے اور اپنے سفرنامے کے ذریعے ان سب کے ترکِ وطن کے جسمانی، ذہنی اور روحانی تجربے اور مکاشفے کا حصّہ بننے کی کوشش کی ہے، لہٰذا ان کا سفر روایتی نہیں ہے جس میں بس بدن سفر کرتا ہے۔ سبوحہ خان نے ایسا سفر کیا ہے جو خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر جاری رہتا ہے۔ یہ صرف جسم کا نہیں سوچ کا سفر بھی ہے۔

سبوحہ خان دنیا بھر کی باتیں کرتے ہوئے اس 'پری وش' کے ذکر کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ وطن پرستی ان کی تحریر کا نہایت دل نشیں وصف ہے۔ اس کے دن رات اور اس کی ہر خوب صورتی انھیں ہمیشہ یاد رہتی ہے۔

سبوحہ خان نے دلکش لہجے میں فکر انگیز باتیں کی ہیں اور ان کی تحریر میں جو تخلیقی شائستگی ہے وہ آج کل نایاب ہے۔

نجم الحسن رضوی

سفرنامے تو ہمارے ہاں اب بہت لکھے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان میں کچھ اچھے بھی ضرور ہوتے ہیں، لیکن ادب اور فیشن کی کچھ زیادہ آپس میں نبھتی نہیں ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ادب سنجیدگی، متانت اور ذمّے داری جیسی چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے اور فیشن میں انھی چیزوں کا فقدان ہوتا ہے، لیکن جب بھی ادب کی کوئی ذمّے دار کتاب طلوع ہوتی ہے تو وہ اپنی روشنی اپنے اصل اور سچے قارئین تک پہنچائے بغیر نہیں رہتی، جیسے سبوحہ خان کی اس کتاب (محور کی تلاش) کو دیکھ لیجیے جو مجھ جیسے دُور دراز گوشہ نشین آدمی تک بھی چھپنے سے پہلے پہنچ گئی۔

یوں تو یہ کتاب مصنفہ کے سفر کی داستان ہے لیکن یہ آئے دن چھپنے والے سفرناموں سے بالکل جدا ہے، اپنے مزاج اور مسئلے دونوں ہی لحاظ سے۔ سبوحہ خان نے ہجرت کے مسئلے اور اُس کے انسانوں پر اثرات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ بڑا گمبھیر موضوع ہے لیکن سبوحہ خان نے اسے بڑی کامیابی سے اور خوب سنبھال کر نبھایا ہے۔ اُن کی تحریر میں وہ سطح کہیں نظر نہیں آتی جس پر بعض مصنفین اپنی کتابوں کو مقبول بنانے کے لیے خواہ مخواہ اُتر آتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ سبوحہ خان کے اس سفرنامے کو عام قارئین کے ساتھ ساتھ سنجیدہ ادبی لوگ بھی پسند کریں گے اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

اسد محمد خاں

AB
ACADEMY BAZYAFT

محور کی تلاش

سبوحہ خان



ISBN 969540122-8
9789695401224